تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا

الفرقان

فی

معارف القرآن

اثر خامہ

خواجہ محمد عبدالحی فاروقی

پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

مطبوعہ فیض عام پریس علی گڑھ

حافظ عبداللطیف پرنٹر

وعد اللہ الذین اٰمنوا لیستخلفنھم فی الارض

الخلافۃ الکبریٰ

یعنی

تفسیر الفرقان فی معارف القرآن کا پہلا حصّہ جس میں سورہ بقرہ کی جامع تفسیر ہے

اثر خامہ

خواجہ محمد عبد الحی فاروقی

اور جس کو

محمد اشرف، ناظر دار الارشاد، جامعہ ملیہ اسلامیہ، علیگڑھ نے شائع کیا

فہرست مضامین

فصل ثانی

جہانداری

تفسیر ابن الجوزی، ۲۷ جلدوں میں ہے۔

تفسیر الاصبہانی، ۳۰ جلدوں میں ہے، اس کے مؤلف، ابو مسلم اصفہانی ہیں، جن کی تفسیر کے اقتباسات، جا بجا تفسیر کبیر میں درج ہیں، امام فخر الدین رازی اکثر مقامات پر ان کی ثنا خوانی کرتے ہیں۔

کتاب الجامع فی التفسیر، ۳۰ جلدوں میں ہے۔

تفسیر ابن النقیب، کچھ اوپر پچاس جلدوں میں ہے۔

کتاب التحریر والتحبیر، اس کی پچاس سے زائد جلدیں ہیں۔

تفسیر الادفوی، علامہ ادفوی، روم کے شہرۂ آفاق عالم تھے اس تفسیر کے وہی مؤلف ہیں، اس کی ۱۲۰ جلدیں ہیں۔

تفسیر القزوینی، تین سو جلدوں میں ہے۔

تفسیر حدائق ذات بہجۃ، پانسو جلدوں میں ہے۔

اس وسعت بیان کو دیکھیے، کیا کوئی شخص اس حقیقت سے انکار کریگا کہ یہ تفسیریں کسی زمانہ میں قرآن حکیم کی انسائیکلو پیڈیا (موسوعات) نہ رہی ہونگی، اقوام و امم عالم کی تاریخ ہمارے سامنے ہے، کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ دنیا کی کسی قوم نے اس کثرت کے ساتھ اپنی کسی کتاب کی خدمت کی ہو، یہ شرف و مزیت، اور خصوصیت کبریٰ صرف قرآن ہی کو حاصل ہے کہ اس کثرت سے اس کی شرح و تفسیر کی گئی، اس کے احکام و ضوابط کی تدوین و ترتیب میں عمریں صرف کی گئیں، کشف سرائر و محجوبات کے لیے تالیفات لکھی گئیں، لیکن پھر بھی ارباب فہم و بصیرۃ، اور حقیقت شناس حلقوں سے یہی صدائے عشق و وارفتگی بلند ہو رہی ہو کہ القرآن لا تفنی عجائبہ ولا تنقضی غرائبہ۔

اوائل عہد

عبدالملک بن مروان ۶۵ھ ہجری میں تخت خلافت پر متمکن ہوا، اس نے اوّلین کام

یہ کیا کہ اپنی تمام تر توجہ علوم و فنون کی تدوین کی جانب پھیر دی، اطراف و اکناف خلافت میں اعلان کر دیا کہ ہر ایک فن پر کتابیں تالیف ہوں، علمائے عظام کو دعوت دی، اور اُن کو تصنیف کی طرف متوجہ کیا، سعید بن جبیر سے درخواست کی کہ قرآن کی شرح و تفسیر میں کچھ تحریر کریں، وہ اپنے زمانہ کے امام، اور تفسیر میں یکتائے روزگار تھے، اُنھوں نے تفسیر لکھکر بھیجی، جس کو شاہی کتب خانہ میں جگہ دی گئی، حضرت عمر بن عبدالعزیز کا زمانہ آیا، تو انہوں نے اور زیادہ اس دائرہ کو وسعت دی، اور تمام بلاد و امصار اسلامی میں احکام نافذ کر دیئے کہ سنن و احادیث پر تالیفات تیار ہوں۔

دور اوّل میں تفسیر کا طریق نہایت ہی دلاویز اور معنی خیز تھا، ان لوگوں کو معلوم تھا کہ قرآن میں اخلاق بھی ہے، اور فلسفۂ اخلاق بھی، تمدن و حضارۃ کے احکام بھی ہیں، اور تہذیب و شائستگی کے اصول و ضوابط بھی، تدبیر منزل و سیاست مدن کے آئین و قوانین بھی ہیں، اور جہانگیری و جہانداری کے قواعد تنظیم و تشکیل بھی، لیکن انداز بیان، طریق تعبیر، اور اسلوب تحریر کچھ اس درجہ جاذب قلوب و انظار واقع ہوا ہے کہ ان علوم سے کوئی واقف ہو یا نہ ہو، جس وقت یہ اعجازی کلمات اس کے کانوں تک پہنچینگے، اس کی فطرت صالحہ اور قلب سلیم کا یہی اقتضا رہیگا کہ ہر وقت ان سے حلاوت اندوز رہے، اور اس کے دل و دماغ پر حاوی ہوں۔

ابتدائی زمانہ کی تفسیروں کے نمونے ہمارے سامنے ہیں، ان میں نہ منطقی دلائل ہیں، نہ فلسفیانہ موشگافیاں، نہ ان کو ریاضیات و طبعیات سے کوئی سروکار ہے، اور نہ ہیئت و نجوم کے زور سے استدلال و حجت کو قوی بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، صاف صاف اور کھلی کھلی باتیں ہیں، کسی قسم کا خفا اور حجاب نہیں، البتہ اگر ان میں کوئی حقیقت نمایاں اور ممتاز پہلو لئے ہوئے ہے تو وہ عمل کی دعوت ہے اور بس، شقیق بن سلمہ اور ابو وائل بیان کرتے ہیں کہ امیر المومنین علی بن ابی طالب نے اپنے عہد حکومت میں

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عباس کو امیر الحج مقرر کر کے بھیجا تھا، انہوں نے خطبۂ حج اس انداز سے بیان کیا، اور سورۂ نور کی تفسیر اس دل فریب طریق پر کی کہ کفار ترک و روم بھی اگر اسے سن لیتے تو یقیناً دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتے، اور ان کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار باقی نہ رہتا، ایسے ہی ایک مرتبہ سورۂ بقرہ کی ایسی معنی خیز، موثر اور دلآویز تفسیر بیان کی کہ ایک شخص تو بے اختیار پکار اٹھا، لو سمع هذا الترك والديلم لاسلمت اگر کفار دیلم اس کو سن پاتے تو ضرور حلقہ بگوش اسلام ہو جاتے۔

یہ جو کچھ اوپر لکھا گیا محض افسانہ ہی افسانہ نہیں، بلکہ ایک حقیقت ثابتہ ہے، اور تاریخ کے صفحات اس قسم کے بے شمار امثلہ و نظائر سے پر ہیں، غیر مسلم قوموں کو جب کبھی قرآن کی تعلیمات کے سننے اور ان میں درس و فکر کرنے کا موقع ملا تو پھر ان کے مسلمان ہو جانے میں کوئی تامل نہ رہا۔

عہد نبوت سے جب تک قرب و اتصال رہا، تفسیر کا یہی انداز تھا، خلفائے اربعہ، عبداللہ بن مسعود، ابن عباس، ابی بن کعب، زید بن ثابت، ابو موسیٰ اشعری، اور عبداللہ بن زبیر کے اسمائے گرامی دور اول میں نہایت ہی جلی قلم سے لکھے ہوئے نظر آتے ہیں، اور باوجود امتداد عہد اور استیلائے جہل، ان کی تابناکی اور درخشندگی میں کسی قسم کا فرق نہیں پیدا ہوا۔

مکہ مبارکہ میں ابن عباس کے شاگردوں کی فہرست تو بہت ہی طویل ہے، لیکن مجاہد، عطا بن ابی رباح، عکرمہ مولی بن عباس، سعید بن جبیر اور طاؤس، ان کے ارشد تلامذہ میں شامل، اور اس لئے خصوصیت سے مشہور ہیں، تفسیروں میں ابن عباس کے جس قدر اقوال ملتے ہیں، وہ سب انہی کی وساطت سے ہم تک پہنچتے ہیں، مجاہد کہتے ہیں کہ میں نے ن عباس کو تیس بار قرآن سنایا ہے، کوفہ کی سرزمین، عبداللہ بن مسعود کے شاگردوں وجہ سے علوم و معارف قرآن کا نشیمن بنی ہوئی تھی، اسی طبقہ میں حسن بصری، عطا بن

ابی سلمہ خراسانی، محمد بن کعب قرظی، ابو العالیہ، ضحاک بن مزاحم، عطیہ، قتادہ، زید بن اسلم، مرہ ہمدانی، ابو مالک، اور ربیع بن انس ہیں۔

تیسرے دور میں سفیان بن عیینہ، وکیع بن الجراح، شعبہ بن حجاج، یزید بن ہارون، عبدالرزاق، آدم بن ابی ایاس، اسحٰق بن راہویہ، روح بن عبادہ، عبد بن حمید، اور ابو بکر بن شیبہ ہیں۔

زاویۂ نگاہ

قرآن حکیم کے نزول کی غرض وغایت یہ تھی کہ جو لوگ اس کی تعلیم پر عمل کریں، ان میں اعلیٰ ترین اخلاق پیدا ہوں، انہیں تمکین فی الارض حاصل ہو، اور کوئی بڑی سے بڑی طاقت ان کا مقابلہ نہ کر سکے، اور یہ ایک ایسی حقیقت تھی کہ اپنے تو اپنے، بیگانے بھی اس سے ناآشنا نہ تھے، ۶ھ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہ ہرقل کو اسلام کی دعوت دی، ابو سفیان ان دنوں روم ہی میں تھے، اس نے ابو سفیان سے اسلامی تعلیمات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اور فرزندان اسلام کے متعلق مختلف سوال کئے اور آخر میں کہا۔

ان یك ما تقول حقا فانہ نبی	اگر یہ سچ ہے جو تم کہتے ہو، تو وہ نبی ہے، اور اس کی
ولیبلغن ملکہ ما تحت قدمی	سلطنت ضرور میرے قدموں کے نیچے کی سرزمین تک پہنچے گی۔

اسی تعلیم کا اثر تھا کہ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو حارث بن عامر بن نوفل کی اولاد شہید کرتی ہے، تو وہ حسب ذیل اشعار پڑھتے ہیں:-

لقد جمع الاحزاب حولی والبوا قبائلھم واستجمعوا کل مجمع

انبوہ در انبوہ لوگ میرے گرداگرد آکھڑے ہیں اور انہوں نے بڑی بڑی جماعتوں کو بلا لیا ہے۔

وکلھم مبدی العداوۃ جاھد علیّ لانی فی وثاق بمضیع

یہ سب کے سب میرے دشمن اور عداوت کا اظہار کرنے والے ہیں اور میں اس ہلاکت گاہ

میں بندھا ہوا ہوں۔

وقد جمعوا ابناءھم ونساءھم وقربت من جزع طویل ممنع

قبیلوں نے اپنی عورتوں اور بچّوں کو بھی بلا رکھا ہے، اور مجھے ایک مضبوط، بلند لکڑی کے پاس لے آئے ہیں۔

وقد خیرونی الکفر والموت دونہ وقد ھملت عینای من غیر مجزع

انہوں نے کہہ دیا ہے کہ کفر اختیار کرنے سے مجھے آزادی مل سکتی ہے، مگر اس سے تو موت میرے لئے بہت سہل ہے، میری آنکھوں سے آنسو لگاتار جاری ہیں، مگر مجھے کچھ ناشکیبائی نہیں۔

فلست بمبد للعدو تخشعاً ولا جزعاً انی الی اللہ مرجعی

میں دشمن کے سامنے نہ عاجزی کرونگا، اور نہ روؤں اور چلاؤں گا، میں جانتا ہوں کہ میں خدا کی طرف جا رہا ہوں۔

ومالی حذار الموت انی لمیت ولکن حذاری جحم نار ملفع

موت سے مجھے اس لئے ڈر نہیں کہ میں مرجاؤں گا، لیکن میں تو لپٹ جانے والی آگ کے خون چوسنے سے ڈرتا ہوں۔

فذا العرش صبرنی علی مایرادبی فقد بضعوا لحمی وقد یاس مطمعی

اس عرش عظیم کے مالک نے مجھ سے کوئی خدمت لینی چاہی، اور مجھے شکیبائی کے لئے فرمایا ہے، اب انہوں نے زدوکوب سے میرا تمام گوشت کوٹ دیا ہے، اور میری امید جاتی رہی ہے۔

فواللہ ماارجوا اذامت مسلماً علی ای جنب کان فی اللہ مصرعی

بخدا جب میں اسلام پر جان دے رہا ہوں، تو میں یہ پرواہ نہیں کرتا کہ راہ خدا میں کس پہلو پر گرتا، اور کیونکر جان دیتا ہوں۔

وذلک فی ذات الالٰہ وان یشاء یبارک علی اوصال شلو ممزع

خدا کی ذات سے اگر وہ چاہے تو پوری امید ہے کہ وہ پارہ ہائے گوشت کے ہر ایک ٹکڑے کو برکت عطا فرمائے۔

سب سے آخر میں انہوں نے فرمایا :۔

اللّٰھم بلغنا رسالتہ رسولک فبلغہ ما یصنع بنا	اے خدا! ہم نے تیرے رسول کے احکام ان لوگوں کو پہنچا دیے، اب تو اپنے رسول کو ہمارے حال، اور اُن کی کرتوتوں کی خبر دیدے۔

یہ نتائج و ثمرات تھے قرآن حکیم کی تعلیم و تربیت کے، صحابہ کرام کی مقدس جماعت خوب جانتی تھی کہ قرآن کا نزول صرف اس لئے ہوا ہے کہ :۔

(الف) اس کو نہایت ہی غور و خوض سے پڑھیں، اور اس کی آیات میں درس و فکر کریں۔

(ب) جس قدر پڑھیں اس پر عمل پیرا ہوں۔

(ج) قرآن حکیم پر عمل کرنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو پیش نظر رکھیں!

خود رسالت مآب کی یہ کیفیت تھی کہ :۔

وکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یرتل السورۃ حتی تکون اطول من اطول منھا وقام بایتہ یرددھا حتی الصباح۔	رسول علیہ السلام، سورۃ کو ٹھیر ٹھیر کر پڑھا کرتے تھے یہاں تک کہ ایک معمولی سورۃ، بڑی سے بڑی سورۃ ہو جاتی تھی اور بعض دفعہ ایک ہی آیت پر ٹھیر جاتے تھے اور اسی کو بار بار صبح تک پڑھتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس کی رائے ہے کہ :۔

ان الترتیل والتدبر مع قلۃ القراۃ، افضل من سرعۃ القراۃ مع کثرتھا، بان المقصود من القراۃ	آہستہ پڑھنا، اور غور کرنا، جس میں قرآن اگرچہ تھوڑا پڑھا جاوے یہ اس سے بہتر ہے کہ جلدی اور زیادہ پڑھا جائے، کیونکہ پڑھنے سے مقصود سمجھنا اور غور کرنا ہی تا کہ

فهمه وتدبره والفقه فيه والعمل
به وتلاوته وحفظه وسيلة
الى معانيه، كما قال بعض السلف
نزل القرآن ليعمل به فاتخذوا التلاوة
عملا ولهذا كان اهل القرآن هم
العالمون والعاملون بما فيه وان لم
يحفظوه عن ظهر قلب، واما من حفظه
ولم يفهمه ولم يعمل به فليس من
اهله، وان اقام حروفه اقامة
السهم واما مجردة التلاوة من
غير فهم ولا تدبر فيفعلها البر
والفاجر والمؤمن والمنافق كما
قال النبي صلى الله عليه وسلم
مثل المنافق الذي يقرأ القرآن كمثل
الريحانة، ريحها طيب وطعمها
مر، وقال شعبة حدثنا ابو حمزة
قال قلت لابن عباس، اني رجل
سريع القراءة، وربما قرأت القرآن
في ليلة مرة او مرتين فقال ابن
عباس لان اقرأ سورة واحدة
اعجب الي من ان افعل ذلك الذي

اس پر عمل ہو سکے، اس کا پڑھنا اور یاد رکھنا، معانی
تک پہنچنے کا وسیلہ ہے، چنانچہ بعض سلف نے کہا ہے
کہ قرآن اس لئے نازل ہوا ہے کہ اس پر عمل کیا جائے
مگر لوگوں نے اس کی تلاوۃ کو ایک مستقل عمل بنا لیا،
اسی لئے گزشتہ طبقات میں اہل قرآن وہی سمجھے جاتے
تھے جو قرآن کے عالم اور عامل تھے، اگرچہ ان کو زبانی
حفظ نہ بھی ہوتا تھا، لیکن جس شخص نے قرآن کو یاد کیا،
اور اس کے مطالب نہ سمجھے نہ ان پر عمل کیا، تو وہ اہل
قرآن سے نہیں ہے، اگرچہ اس کے حروف کو تیر کی
طرح اس نے درست کر لیا، اور وہ تلاوت، تو ہر نیک و
بد مومن اور منافق کر سکتا ہے جو فہم و تدبر سے خالی ہو،
رسول علیہ السلام نے فرمایا کہ قرآن پڑھنے والے منافق
کی مثال، ریحان کی ہے، جس کی بو عمدہ اور مزا کڑوا ہے،
شعبہ نے کہا، ابو حمزہ نے ابن عباس سے عرض کیا،
میں تیز پڑھنے والا ہوں، بعض اوقات ایک ہی شب میں
ایک دو مرتبہ قرآن ختم کر دیتا ہوں، ابن عباس نے
جواب دیا کہ مجھے ایسے قرآن پڑھنے سے ایک سورت
پڑھنا بہتر معلوم ہوتی ہے، بہر حال اگر تم تیزی ہی سے
پڑھنا چاہو تو بھی ایسا پڑھو کہ تمہارے کان سنیں اور
تمہارا دل اسے یاد کر لے، ابن مسعود نے فرمایا ہے کہ
قرآن کے عجائب پر ٹھیرو، اور ان سے دلوں کو حرکت دو،

تفعل فان کنت فاعلاً لابد فاقرأ قرأة تسمع اذنيك و يعيه قلبك قال ابن مسعود قفوا عند عجائبه حركوا به القلوب ولا يكن هم احدكم آخر السورة وقال عبدالرحمن بن ابی لیلی دخلت علی امرأة وانا اقرأ سورة هود فقالت یا عبدالرحمن ! هكذا تقرأ سورة هود والله انی فیها منذ ستة اشهر وما فرغت من قرأتها۔

اور تمہاری یہ کوشش نہ ہو کہ خواہ مخواہ آخر سورہ تک پہنچو، عبدالرحمن بن ابی لیلی فرماتے ہیں کہ میں ایک عورت کے پاس گیا، اور میں سورۂ ہود پڑھ رہا تھا، اس نے کہا، اے عبدالرحمن! تم اس طرح سورۂ ہود پڑھتے ہو! خدا کی قسم، میں چھ مہینے سے اس سورہ کو پڑھ رہی ہوں اور اب تک اس سے فارغ نہیں ہوئی۔

عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں:۔

کان الرجل منا اذا تعلم عشر آیات لم یجاوزهن حتی یعرف معانیهن والعمل بهن وقال ابو عبدالرحمن السلمی حدثنا الذین کانوا یقرؤننا انهم کانوا یستقرؤن من النبی صلی اللہ علیہ وسلم، وکانوا اذا تعلموا عشر آیات لم یخلفوها حتی یعلموا بمافیها من العمل فتعلمنا القرآن والعمل جمیعاً

جب کوئی شخص ہم میں سے دس آیتیں سیکھ لیتا تھا، تو اس سے آگے نہ بڑھتا، جب تک ان کے معانی، اور ان پر عمل کرنا نہ سیکھ لیتا، ابو عبدالرحمن سلمی نے فرمایا ہے کہ ہم سے ان لوگوں نے بیان کیا جو ہم کو پڑھاتے تھے، اور وہ رسول علیہ السلام سے پڑھا کرتے تھے، جس وقت دس آیتیں پڑھ لیتے تو ان سے تجاوز نہ کرتے، جب تک ان پر عمل نہ کر لیتے، لہٰذا ہم نے قرآن اور اس پر عمل دونوں اکٹھے سیکھے۔

اس پاک گروہ کی نظر صرف اسی پر نہ تھی بلکہ وہ اس امر پر بھی غور و فکر کرتے کہ تعلیم قرآن سے قبل ہماری کیا حالت تھی؟ اور اب اس سے کس قسم کے انقلابات و تغیرات رونما ہوئے ہیں؟ اس لئے ان لوگوں نے اس حقیقت کبریٰ پر مہر لگا دی کہ:۔

لا یصلح آخر هذه الامة الا بما اصلح اولها۔

اس امت کے آخری حصہ کی اصلاح فقط اسی چیز سے ہوگی، جس سے اس کے اول کی اصلاح ہوئی۔

جدید راہ

اب ایک نیا دور شروع ہوا، ایک ایک آیت کے لئے متعدد مطالب، اور مختلف روایات ذکر کی جانے لگیں، جن میں بعض تو یقیناً قابل قبول اور لائق استناد تھیں، مگر بیشتر غلط اور موضوع، رد و قبول کے محک پر ان کے پرکھنے کی ضرورت تھی، تاکہ کھوٹے اور کھرے میں، غث اور سمین میں فرق و امتیاز ہو جائے اور حق و باطل میں التباس و اشتباہ باقی نہ رہے، ان بزرگوں نے مختلف اقوال کو صرف اس لئے جمع کر دیا تھا کہ آیات کے مفہوم میں جس قدر ممکن سے ممکن اقوال منقول ہوں، یا ہو سکتے ہوں، اور جس قدر زیادہ سے زیادہ مواد فراہم ہو سکتا ہو ناظرین کے روبرو بغیر حک و اضافہ کے تمام و کمال پیش کر دیا جائے اور ہر ایک سخن شناس طبیعت کے لئے اس امر کا موقع حاصل رہے کہ وجدان سلیم، ذوق صحیح، اور اصول تفسیر کی اعانت سے ان اقوال کو جرح و تعدیل کے میزان میں تولے اور نقد و اختیار کے بعد جس کو چاہے ترجیح دے، اور جسے چاہے مرجوح قرار دے۔

چنانچہ تیسری صدی ہجری میں علامہ ابو جعفر بن جریر طبری نے اپنی مشہور تفسیر لکھی جس کی نسبت علامہ ابو حامد اسفرائنی کی رائے یہ ہے کہ لوسافر رجل الی الصین حتی یحصل لہ کتاب تفسیر محمد بن جریر لم یکن ذلک کثیراً (تفسیر ابن جریر کی تلاش میں اگر ایک شخص چین تک کا سفر کرے تو یہ کوئی بڑی بات نہ ہوگی) ابن جریر کی وفات کو ایک ہزار برس سے زیادہ زمانہ گزر چکا ہے، وہ ہر ایک بات میں روایت کے پابند ہیں، ان کا خاص مذاق یہی ہے کہ حدیث کے نام سے خواہ کیسی ہی لغو اور مہمل بات کہی جائے، سب پر ایمان لانے کو تیار ہو جاتے ہیں، اور نہیں دیکھتے کہ حقیقت اصلیہ کیا تھی، اور عقل سلیم کہاں تک اس کو قبول کرنے کو تیار ہوگی، ایک ایک آیت کے متعلق مختلف اقوال و روایات پیش کرتے ہیں، اور بعض اوقات ترجیح بھی دے جاتے ہیں۔

پانچویں صدی ہجری میں ابو عبد الرحمٰن محمد بن حسین نیشاپوری ہیں، ان کی وفات

۴۱۲ھ ہجری میں ہوئی، اُنہوں نے تفسیر حقائق لکھی، اور ربط دیا بس روایات و مطالب کا ایک انبار جمع کر دیا، یہی حال ابو اسحٰق احمد ثعلبی کا ہے، ابو محمد عبداللہ جوینی، ابوالقاسم عبدالکریم قشیری، اور ابوالحسن بن احمد اسی طبقہ میں شامل ہیں، اس صدی کی تفسیروں میں صرف اتنا فرق ہے کہ ان میں روایات تو بیان کی جاتی ہیں، مگر ان کے اسناد کو حذف کر دیا جاتا ہے، چنانچہ کشف الظنون میں ہے :۔

ثم الف فی التفسیر طائفۃ من المتاخرین، فاختصروا الاسانید ونقلوا عن الاقوال تبراً فدخل من ھنا الدخیل والتبس الصحیح بالعلیل ثم صار کل من سنح لہ قول یوردہ ومن خطر بالہ شیئ یعتمدہ ثم ینقل ذلک خلف عن السلف ظانا ان لہ اصلا غیر ملتفت الی تحریر ما ورد عن السلف الصالح۔	اس کے بعد متاخرین میں سے ایک جماعت نے تفسیریں تالیف کیں، اور اسنادوں کو مختصر کر دیا، بہت سے اقوال نقل کیے، یہاں سے زاید باتیں داخل ہونے لگ گئیں، اور صحیح و ضعیف آپس میں ملتبس ہو گئے، اس کے بعد جس کسی کو جو بات معلوم ہوئی وہی درج کر دی، اور جو کچھ اس کے خیال میں آیا اسی پر اعتماد کر لیا، اس کے بعد ہر پچھلا طبقہ، اپنے متقدمین سے نقل کرنے لگا، اس خیال سے کہ ضرور کوئی نہ کوئی اس کی اصلیت ہو گی، اُنہوں نے اس کی تحقیق نہ کی کہ سلف صالح سے اس میں کیا منقول ہے؟

ان غلط اور بے بنیاد روایات کا اندازہ علامہ سیوطی کے صرف اس ایک قول سے ہو سکتا ہے کہ :۔

رایت فی تفسیر قولہ تعالیٰ غیر المغضوب علیہم ولا الضالین نحو عشرۃ اقوال مع ان الوارد عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم و	میں نے غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کی تفسیر میں دس مختلف اقوال دیکھے ہیں، حالانکہ رسول علیہ السلام، جمہور صحابہؓ اور جملہ تابعین سے یہود و نصاریٰ کے سوا کوئی دوسرا قول بھی روایت

جمیع الصحابۃ والتابعین لیس غیر الیھود والنصاریٰ | نہیں کیا گیا۔

مابعد کی تفسیریں

جس قدر زمانہ بڑھتا گیا اور عہد نبوت سے بعد و ہجر ہوتا گیا، تفسیر کی صورت بھی نمایاں تبدیلیاں اختیار کرتی گئی، اور انجام کار ایسا انقلاب عظیم پیدا ہوا کہ جن مطالب اور روایات کے حق میں محکمہ تحقیق کا یہ فیصلہ تھا کہ وہ قابل قبول نہیں ہیں، وہی زیادہ مشہور ہوگئیں، اور عام طبائع نے ان کو شرف اجابت بخشا، ہر بات میں پیچیدگی، مشکل پسندی اور عجائب پرستی کا طومار بھر گیا، حکمت و فلسفہ کی نکتہ آفرینیاں دکھائی دینے لگیں، معانی و بیان کے حقائق بیان کئے جانے لگے، اور ہیئت و نجوم کے مطابق قرآن حکیم کی تفسیر ہونے لگی، مگر جس قدر ان چیزوں میں زیادتی ہوتی گئی، اتنی ہی قرآن سے دوری ہوتی گئی، اور منشائے قرآن کی خصوصیت میں فرق آتا گیا۔

اس میں شک نہیں کہ مفسرین کرام کی زندگی کا مقصد وحید اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ اس کتاب عزیز کے اسرار و معارف کی نشر و اشاعت ہو، اور اس کے مفہوم و معانی کی تبلیغ و دعوت ہو، لیکن جب ان تفسیروں میں بحث و نظر کی جاتی ہے، تو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ لا یسمن ولا یغنی من جوع، تفسیر کبیر ہی کو اٹھا کر دیکھ لیجئے، اس میں بطلیموسی ہیئت و نجوم اور فلسفۂ یونان کے سوا کیا دھرا ہے، مخالفین کے شبہات بیان کرینگے، اور اپنا تمام زور استدلالی انکی تقویت میں صرف کردینگے، لیکن جواب کے وقت اس درجہ ضعف و کمزوری کا اظہار کرینگے کہ پڑھنے والے کے دل میں وہ شبہ اور زیادہ قوی ہوجائیگا، بعض ارباب نظر و بصیرت کو خود امام فخر الدین رازی کے اسلام ہی میں تردد ہے، مگر یہ خیال تو درست نہیں البتہ اتنا ضرور ماننا پڑیگا کہ اس میں دنیا جہان کی باتیں ہیں مگر تفسیر نہیں، جو اس کا اصلی موضوع و مقصد تھا، چنانچہ آگے چلکر آپ کو بعض اکابر کی رائے ان کی تفسیر کے متعلق معلوم ہوگی۔ پس اگر بعض نکتہ سنج طبائع کا یہ مطالبہ ہو کہ اس زمانہ میں

تفسیر کبیر کا پڑھنا بے سود ہو تو شاید کچھ لوگ ان کی تائید کے لئے کھڑے ہو جائیںگے۔

قرآن کا نزول تو اس لئے ہوا تھا کہ اس کے درس و فکر سے حیات انفرادی و اجتماعی میں انضمام و توحید پیدا ہو، ہر مسلم قانت کی تشنہ لبی دور رہے، اور ہر ایک فرزند اسلام اس کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنائے، مگر ان تفاسیر سے یہ مقصد حاصل نہ ہو سکا، لوگوں نے ان تفاسیر کا درس و مطالعہ شروع کیا، حالانکہ ضرورت تھی قرآن حکیم کی تلاوت کی، پس وہ چشمہ حیات سے بہت دور جا پڑے، اور اب تو بعض کے نزدیک خود قرآن کا درس ممنوع ونا جائز ہے، یا لیتنی مت قبل ہذا وکنت نسیا منسیا۔ پنجاب کے ایک جلیل القدر سجادہ نشین کی رائے ہے کہ الحمد کے صرف الف کے معانی و مطالب معلوم کرنے کے لئے ۳۶۰ علوم کی ضرورت ہے۔ ذلک مبلغہم من العلم!

مدار روزگار سفلہ پرور را تماشا کن!

دنیا میں ہمیشہ تغیرات و انقلابات رونما ہوتے رہتے ہیں، تمام اقوام و امم عالم بھی ادوار مختلفہ میں سے گزرتی رہتی ہیں، فن تفسیر بھی اس قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ نہ رہ سکا، ہر زمانہ میں اس کا رنگ بدلتا گیا، اور اب تو اس میں ایسی ایسی تبدیلیاں واقع ہو گئیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، ابتدا میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ محدثین نے قرآن حکیم کی آیات کے مناسب تمام ان احادیث، مرویات صحابہ، اور اقوال تابعین کو ایک جگہ جمع کر دیا، جن سے اخذ مطالب، اور فہم معانی میں سہولت و آسانی ہو، اور وہ تمام بصائر و حکم سامنے آجائیں جو براہ راست مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہوں، انکے بعد معتزلہ کا گروہ سامنے آتا ہے جنہوں نے فلسفہ یونان سے مرعوب و ہیبت زدہ ہو کر تمام آیات صفات کی تاویل شروع کر دی، اور متبادر معانی و مطالب کو ترک کر کے بعید از فہم حقائق کی جانب متوجہ ہو گیا، نکتہ آفرینیوں اور فلسفیانہ موشگافیوں کا دروازہ کھول دیا، اور اس طرح ہمیشہ کے لئے الحاد و زندقہ، فتنہ و فساد، اور توجیہ و تاویل کا باب مفتوح کر دیا، فلسفہ کی نشر و اشاعت نے

عقائد واخلاق میں اور زیادہ تزلزل پیدا کر دیا، متکلمین آگے بڑھے، اور ہر شبہہ کا جواب دینے لگے، اس لئے قرآن کی شرح و تفسیر، علم کلام کے مطابق ہونے لگی، فقہا کے گروہ نے صرف استنباط احکام واخذ مسائل ہی کو اپنا مطمح نظر بنالیا، اور ان کی سعی و کوشش یہیں تک محدود رہی، ارباب لغت نے دوسری حیثیت سے نظر ڈالی، علمائے نحو کے سامنے یہی فن تھا، اسی کی خاطر انہوں نے کلام عرب سے شواہد کی تلاش و جستجو کی، اور صرف بسم اللہ الرحمن الرحیم کی تین ہزار ترکیبیں بیان کر دیں، اہل سلوک واحسان نے صرف تصوف کو اپنی غایت الغایات یقین کرکے قرآن حکیم کو تصوف کے قالب میں ڈھال دیا، ظواہر کو چھوڑ کر بطون کے پیچھے پڑ گئے، اور مغز کو پھینک کر محض چھلکے پر قناعت کر بیٹھے سب سے زیادہ نقصان اسلام کو اس ہندوانہ تصوف سے پہنچا، اور لوگ تو اب تک اس کے دام میں پھنسے ہوئے ہیں فھل من مدکر۔

فاران کی چوٹی پر نزول الہام اس لئے ہوا تھا کہ مسلمانوں کے لئے قانون اساسی کے طور پر کام دے، مگر زمانہ کی نیرنگ سازی ملاحظہ ہو کہ وہ اب ہر کس وناکس کی رائے وخیال کا دست خوش بن گیا، اور ہر شخص اپنے مذاق خاص کے مطابق اس کی تفسیر کرنے لگا، اس بے اصول خطرناک آزادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب کا بہت بڑا حصہ زید و عمر کے اقاویل، اور شیخ وسید کے اباطیل واکاذیب کا ذخیرہ بن گیا، آیات احکام کے مفہوم متعین کرنے میں اعجاب کل ذی رای برایہ کی آمیزش ہونے لگی، وسعت معلومات، اسلوب تحریر اور نسج بیان ظاہر کرنے کے لئے تفسیر قرآن میں مفروضات وتخیلات کی حسب قدر جولانی دکھانے بنی اچھی طرح دکھائی گئی اور یہ خیال نہ آیا کہ ہم تلاعب بالقرآن کے مرتکب ہو رہے ہیں، نظامی شاعر تھے، مگر وہ بھی اس دردانگیز وحسرت خیز منظر کو نہ دیکھ سکے، بیتاب ہو گئے، اور ان الفاظ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فریاد کی:۔

دین ترا درپے آرائش اند   درپے آرائش و پیرائش اند

بسکہ بروبستہ شدہ برگ و ساز   گر تو بہ بینی نہ شناسیش باز

یہ کیفیت ہمیں چھٹی صدی ہجری تک تو نظر آتی ہے کہ احساس تو ہے، اگرچہ اس وقت بھی اس عالم آشوب طوفان کے روکنے کی کوئی صورت نہ تھی، لیکن بعد کو تو اس قدر استیلائے کفر و ضلالت ہوا کہ اتنی حس و بیداری بھی باقی نہ رہی، غوغائے عجمیت میں یہ فریاد بھی کسی کی زبان سے نہ نکل سکی، وہ دین فطرت، جو حجاز کی وادیوں میں اپنے اصلی حسن و جمال کے ساتھ دلفریبی اور کشش کا باعث تھا، اس پر مجوسیوں کی عجائب پرستیاں، یہودیوں کے دورازکار افسانے، اور بت پرستوں کے رسم و رواج چھا گئے، اور اب ہمارا زمانہ آیا تو دودھ سے پانی کا جدا کرنا سخت ترین کام ہو گیا، دقت آفرینی اور عجائب پسندی کی بنیاد پر جو جو شاخیں نکلیں، جیسے جیسے شگوفے پھوٹے اور تفسیروں میں جس نہج پر اس قسم کی روایتیں پھلی پھولیں، ان کو دیکھکر بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اور قلم میں طاقت نہیں کہ ان کو تحریر میں لاسکے۔

ابوالفیض فیضی اکبری دربار کے نورتن تھے، قدرت سے طبیعت نکتہ سنج پائی تھی، سواطع الالہام، قرآن کی تفسیر لکھی، جس میں یہ التزام کیا گیا کہ تمام تفسیر میں اوّل سے آخر تک ایک لفظ بھی منقوط نہ ہو، اس نفسانی ہیجان کو پورا کرنے کے لئے انہیں جس قدر اپنی طبیعت پر زور ڈالنا پڑا، اُن کے انداز تحریر سے ظاہر ہے، عبارتوں کی عبارتیں، فقروں کے فقرے، اور ترکیبوں کی ترکیبیں، یکے بعد دیگرے چلی آرہی ہیں، جن میں باہم کوئی ربط و تعلق نہیں، ایک بے معنی کلام ہے، جس کے لئے دلاویز و دلفریب ترکیبوں اور جملوں کی تلاش ہو رہی ہے، صورت ہے لیکن معنی نہیں، جسم ہے مگر روح سے خالی، ایک حی و قائم انسانی وجود ہے جس کے تمام اعضاء و جوارح کاٹ دیے گئے ہیں۔

شیخ علی بن احمد مہائم ضلع گجرات کے رہنے والے تھے، ان کی وفات ۸۳۵ھ ہجری میں ہوئی، شیخ محی الدین بن عربی کے بے انتہا ثناخواں، اور مسئلہ وحدت وجود میں

ان کے نقش قدم پر چلنے والے تھے، انہوں نے تفسیر رحمانی لکھی، چونکہ تصوف میں ذوق رکھتے تھے، اس لئے قرآن حکیم کی تفسیر اسی صوفیانہ رنگ میں کی، آیات کا مطلب احسان وسلوک کے رنگ میں بیان کیا، قرآن کی نظم و ترتیب پر بھی روشنی ڈالی تو یہی چیز غالب رہی، انہیں اس امر کا خیال نہ رہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محض تصوف ہی سکھانے نہ آئے تھے بلکہ وہ مثیل موسی بھی تھے، اور آپ کی بعثت کی غرض وغایت یہ بھی تھی کہ فرزندان اسلام شہداء علی الناس بن جائیں، اور خلافت ارضی کے جائز وارث قرار پائیں

ساتویں صدی ہجری کے اواخر میں قاضی ناصر الدین ابو سعید عبداللہ بن عمر بیضاوی شافعی آئے، انہوں نے ایک تفسیر لکھی جس کا نام انوار التنزیل واسرار التاویل ہے، عربی مدارس میں اس کا ابتدائی حصہ درس میں شامل ہے، اکثر علمانے اس پر حواشی بھی تحریر کئے ہیں، تفسیر کی کیفیت یہ ہے کہ فن معانی، بدیع، اور بلاغت میں جو کچھ لکھتے ہیں جار اللہ زمخشری کی تفسیر کشاف سے لیتے ہیں، اور بغیر حریت رائے و اجتہاد کے اس کی تقلید کرتے ہیں، فلسفہ و کلام کے مسائل کی نوبت آتی ہے تو فخر الدین رازی سے طالب اعانت ہوتے ہیں، جب مفردات الفاظ اور اشتقاق کے مباحث سامنے آتے ہیں تو امام راغب اصفہانی کی جانب رجوع کرتے ہیں۔

ہم نے اوپر جو کچھ لکھا، اس سے ان جلیل القدر بزرگوں کی تقبیح وتنقیص مقصود نہیں بلکہ ایک حقیقت ثابتہ ہے جس کا اظہار ضروری تھا، الساکت عن الحق شیطان اخرس، اور پھر اس وادی میں ہم ہی اکیلے نہیں بلکہ دوسرے ارباب بصیرت بھی ہمارے رفیق طریق ہیں، چنانچہ صاحب کشف الظنون کی رائے ملاحظہ ہو:۔

ثم صنف بعد ذلك قوم برعوا في شئ من العلوم، وملأ كتابه بما غلب على طبعه من الفن واقتصر فيه على ما تمهر	اس کے بعد ایسے لوگوں نے تصنیف کی جنہوں نے کسی ایک علم میں فوقیت حاصل کی ہے، اور اپنی کتاب کو اسی فن سے بھر دیا ہے، جو اس کی طبیعت

هو فيه، كان القرآن انزل لاجل هذا
العلم لا غير مع ان فيه بيان كل شئ
فالنحوي تراه ليس له هم الا الاعراب و
تكثير الاوجه المحتملة فيه وان كانت
بعيدة وينقل قواعد النحو ومسائله و
فروعه وخلافياته كالزجاج والواحدي
في البسيط وابوحيان في البحر والنهر،
والاخباري ليس له شغل الا القصص
واستيفاءها والاخبار عن سلف سواء
كان صحيحة او باطلة، ومنهم الثعلبي،
والفقيه يكاد يسرد فيه الفقه جميعا
وربما استطرد الى اقامة ادلة
الفروع الفقهية التي لاتعلق لها
بالاية اصلا والجواب عن ادلة
المخالفين كالقرطبي، وصاحب العلوم
العقلية خصوصا الامام فخر الدين
قد ملاء تفسيره باقوال الحكماء
والفلاسفة وخرج من شئ الى
شئ حتى يقضي الناظر العجب قال
ابوحيان في البحر جمع الامام الرازي
في تفسيره اشياء كثيرة طويلة لا

میں غالب تھا، اور محض اسی پر اکتفا کیا جس میں
اس نے مہارت حاصل کی تھی، گویا قرآن صرف
اسی علم کے لئے نازل ہوا تھا، حالانکہ اس میں ہر
چیز کا بیان ہے، نحوی کو فقط اعراب اور وجوہ
ترکیب ہی پیش نظر ہیں، اگرچہ وہ بعید ہی کیوں
نہوں، وہ نحو کے قواعد مسائل فروع اور خلافیات
ہی کو داخل کریگا، جس طرح زجاج و واحدی نے
بسیط میں اور ابوحیان نے بحر اور نہر میں کیا ہے،
اخباری کو صرف قصے اور ان کی تکمیل ہی پیش نظر
رہتی ہے، گزشتہ قصوں کا خیال رہتا ہے خواہ وہ
صحیح ہوں یا غلط، ثعلبی ان لوگوں میں سے ہیں،
فقیہ کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ ساری فقہ داخل کردے،
بسا اوقات فقیہ فرعیات فقہ کی دلیلیں لاتا ہے حالانکہ
نفس آیت سے ان کو کوئی تعلق نہیں ہوتا، اور پھر
مخالفین کے جواب بھی نقل کردیتا ہے، اس قسم کے
لوگوں میں سے قرطبی ہیں، ارباب علوم عقلیہ میں
امام رازی ہیں، جنہوں نے اپنی تفسیر کو حکما اور
فلاسفروں کے اقوال سے بھر دیا ہے، اور کہیں سے
کہیں چلے جاتے ہیں، جس سے دیکھنے والا تعجب
میں رہ جاتا ہے، ابوحیان نے بحر میں کہا ہے کہ امام
رازی نے اپنی تفسیر میں بہت سی چیزیں درج

حاجة لها في علم التفسير، ولذلك
قال بعض العلماء فيه كل شيء
الا التفسير، والمبتدع ليس له قصد
الا تحريف الآيات وتسويتها على
مذهبه الفاسد بحيث انه لولاح
له شاردة من بعيد اقتنصها او وجد
موضعاً له فيه ادنى مجال سارع اليه
والملحد فلا تسئل عن كفره والحاده
في آيات الله وافترائه على الله ما لم
يقله ومن ذلك القبيل الذين يتكلمون
في القرآن بلا سند ولا نقل عن السلف
ولا رعاية الاصول الشرعية والقواعد
العربية كتفسير محمد بن حمزة الكرماني
في مجلدين، سماه العجائب والغرائب
ضمنه اقوالا هي عجائب عند العوام و
غرائب عما عهد عن السلف بل هي
اقوال منكرة لا يحل الاعتقاد عليها ولا
ذكرها الا للتحذير من ذلك وسئل
البلقيني عمن فسر بهذا فافتى بانه
ملحد واما كلام الصوفية في القرآن
فليس بتفسير قال ابن الصلاح في فتاواه

کر دیں جن کی علم تفسیر میں کچھ ضرورت نہ تھی،
اسی لئے بعض علما نے کہا ہے کہ امام رازی کی تفسیر
میں سب کچھ ہے مگر تفسیر نہیں۔ ایک بدعتی کی
غرض آیتوں کی تحریف ہوتی ہے تاکہ ان کو اپنے
فاسد مذہب پر منطبق کرے، یہاں تک کہ اگر
اسے کوئی دور کی بات بھی سوجھتی ہے تو اسے
لے لیتا ہے، یا اگر کوئی ایسا موقعہ پاتا ہے جس میں
اس کی کچھ بھی بات بن سکے تو فوراً اپنا لیتا ہے اور
ملحد کا تو ذکر ہی کیا ہے وہ خدا کی نسبت جھوٹ بناتا
ہے جو اس نے بالکل نہیں کہا اور جو لوگ قرآن
میں بلا سند، سلف صالحین کے اقوال کے ماسوا و علم
عربیہ اور اصول شرعیہ کے بغیر کچھ کہتے ہیں، وہ سب
اسی قسم میں شامل ہیں، محمود بن حمزہ کرمانی کی تفسیر
دو جلدوں میں اسی قسم کی ہے جس کا نام العجائب
والغرائب رکھا ہے، اس میں ایسے اقوال نقل کئے
ہیں جو عوام کے نزدیک عجیب، اور طریق سلف
سے دور ہیں، بلکہ ایسے ہیں کہ ان پر اعتقاد ہی جائز
نہیں اور ان کا ذکر تحذیر کے سوا ناجائز ہے، ایسے
لوگوں کے متعلق بلقینی سے فتویٰ طلب کیا گیا تو
انھوں نے کہا کہ ایسے مفسر ملحد ہیں، اور قرآن کے
بارہ میں صوفیہ کا کلام تفسیر نہیں، ابن الصلاح نے

وجدت عن الامام الواحدی انه قال صنف السلمی حقائق التفسیر ان کان قد اعتقد ان ذٰلک تفسیر فقد کفر، قال النسفی فی عقائدہ النصوص تحمل علی ظواھرھا والعدول عنھا الی معانی یدعیھا اھل الباطن الحاد[۱]

اپنے فتاوی میں ذکر کیا ہے کہ میں نے امام واحدی سے دریافت کیا انھوں نے کہا کہ سلمی نے حقائق التفسیر لکھی ہے، جو شخص اس کو تفسیر کہے وہ کافر ہے نسفی نے اپنے عقائد میں کہا کہ نصوص کو اپنے ظواہر پر محمول کیا جائیگا اور ان سے اہل باطن کے معانی کی جانب پھیرنا الحاد ہے۔

اس قسم کی تفاسیر کے درس و مطالعہ اور بحث و نظر نے ہماری تمام قوتوں پر عالم ممات طاری کر دیا چونکہ انسان منفعل اور اثر پذیر واقع ہوا ہے، اس لئے عام لوگوں نے تعطل کی زندگی بسر کرنا شروع کر دی اور آخر یہ کہنا پڑا کہ لم یبق من الاسلام الا رسمہ۔

الفاظ کی غلط تعبیر

دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن حکیم کے اکثر الفاظ کے حقیقی مفہوم و معانی بدل دیے گئے، لسان الٰہی نے ان کو جن مواقع میں استعمال کیا تھا اور جو مطالب صاحب شریعۃ علی صاحب الصلوٰۃ والتحیۃ کے پیش نظر تھے، وہ بالکل فراموش کر دیے گئے، ہم مثال کے طور پر چند الفاظ پیش کرتے ہیں:-

(۱) توکل، عام لوگوں کے نزدیک اس کا یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ ایک انسان، بیکاروں اور اپاہجوں کی زندگی بسر کرے، ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھا رہے کوئی کام نہ کرے، لوگوں کے صدقات وخیرات اور نذور و ہدایا پر نظر رکھے، لیکن قرآن اس کا مفہوم بالکل جداگانہ بتاتا ہے، اس کے نزدیک توکل کے یہ معنی ہونگے کہ مشکلات و مصائب کے وقت ہمت و استقلال، عزم و ثبات قدم اور جوش صادق وولولہ عمل کے ساتھ مصروف کار ہو، نتائج و ثمرات کی طرف سے خوف زدہ ہو کر اپنے فرائض حیات کو ترک نہ کر دے، بلکہ خدائے حق نواز سے پوری توقع رکھے کہ وہ ضرور کامیابی نواز کریگا، چنانچہ فرمایا:-

---

[۱] کشف الظنون، ج ۲ ص   ، مطبوعہ

قَالُوْا یٰمُوْسٰۤی اِنَّ فِیْهَا قَوْمًا جَبَّارِیْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰی یَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ۝ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَیْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَعَلَی اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ (۵ : ۲۵، ۲۶)

وہ لوگ لگے کہنے: اے موسیٰ! اس ملک میں تو بڑے زبردست لوگ رہتے ہیں، اور جب تک وہ وہاں سے نہ نکل جائیں ہم تو اس ملک میں قدم رکھتے نہیں ہاں وہ لوگ اس میں سے نکل جائیں تو ہم ضرور جا داخل ہونگے خدا سے ڈرنیوالوں میں سے دو آدمی تھے جنپر خدا نے اپنی خاص مہربانی کی وہ بول اُٹھے کہ انپر چڑھائی کر کے دروازے میں گھس پڑو، اور جب تم دروازہ میں گھس پڑو تو بلاشبہ تمہاری فتح ہے اور تم ایمان رکھتے ہو تو اللہ پر توکل کرو۔

(۲) صبر: مشہور یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے کوئی تکلیف و مصیبت آپڑے تو غم کا اظہار نہ کریں، ذلتوں اور رسوائیوں کے برداشت کرنے کی عادت ڈال لیں بیٹیں اور اُف نکریں سب طرف سے لعنت و نفرین ہو، اور ہم خاموش بیٹھکر سنا کریں لیکن قرآن کہتا ہے کہ صحیح اصول اور مقاصد صالحہ کو پیش نظر رکھکر کام کرتے وقت جس قدر بھی تکالیف و شدائد آئیں ان کو برداشت کریں باوجود ان آلام و مصائب کے اپنے مقصد کو ہاتھ سے نہ جانے دیں، کام برابر جاری رکھیں، اور رکاوٹوں سے گھبرا کر اپنے آپ کو بے دست و پا نہ بنالیں، حسب ذیل آیتیں اس مفہوم کی تائید کرتی ہیں۔

وَكَاَیِّنْ مِّنْ نَّبِیٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّیُّوْنَ كَثِیْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۗ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ ۝ (۳ : ۱۴۰)

اور بہت سے پیغمبر ہو گزرے ہیں، جنکے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والے لوگ دشمنوں سے لڑے تو جو مصیبت انکو اللہ کی راہ میں پہنچی اسکی وجہ سے نہ تو انہوں نے ہمت ہاری، نہ بودا پن کا اظہار کیا، اور نہ دشمنوں کے آگے عاجزی کا اظہار کیا، اور اللہ صابروں کو دوست رکھتا ہے،

اِصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۟ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (۳ : ۲۰۰)

اپنے مقصد پر مرمٹو، دوسروں کو مرنے کے لئے تیار کرو، دشمنوں کی نقل و حرکت کی نگرانی کرو، اللہ سے ڈرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

قرآن حکیم ارباب صبر واستقامت سے کم از کم اتنی توقع ضرور رکھتا ہے کہ اپنے سے دگنی طاقت کا مقابلہ کر سکیں :-

فَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ ۚ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ○ (۸ : ۶۶)	اگر تم میں سے سو صابر ہونگے تو دو سو پر غالب رہیں گے، اور اگر تم میں سے ایسے ایکہزار ہونگے تو خدا کے حکم سے وہ دو ہزار کافروں پر غالب رہیں گے، اور اللہ تعالیٰ صابروں کے ساتھ ہے۔

(۳) تقدیر، اس عقیدہ کے غلط مفہوم نے بھی مسلمانوں کی تباہی و بربادی میں کچھ کم حصّہ نہ لیا، لوگ سمجھ گئے کہ جب سب کچھ خدا کے حکم سے ہوتا ہے تو ہمیں کام کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، انفرادی و اجتماعی زندگی کے بقاء و قیام کے لئے کوشش کرنا ترک کر دی اپاہجوں کا ایک گروہ بن گیا اور بے دست و پا بن کر دوسروں کے لئے بار دوش ثابت ہوئے، لیکن یقین کیجئے کہ اسلام کبھی اس سے آلودہ دامن نہیں ہوا، اس کی تعلیم کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ مسلمان تعطل و بیکاری کی زندگی بسر کریں بلکہ وہ تو یکسر پیغام عمل ہے، اس نے اپنے نزول کے اوّلین روز بہانگ دہل اس امر کا اعلان کر دیا کہ :-

لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ○ وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَىٰ (۵۳ : ۴۰ و ۴۱)	انسان کو اتنا ہی ملیگا جتنی اس نے کوشش کی، اور یہ کہ اس کی کوشش آگے چل کر دیکھی جائیگی۔

پھر فرمایا :-

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ○ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ○ (۹۹ : ۷ و ۸)	جس نے ذرّہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اس نیکی کو دیکھ لیگا، اور جس نے ذرّہ بھر برائی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لیگا۔

دوسری جگہ کہا :-

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ (۲ : ۱۳۵)	ان کا کیا ان کو، اور تمہارا کیا تم کو۔

گویا اس نے ہر ایک کے سامنے دعوت عمل پیش کی، اور بتا دیا کہ یہ صرف انسان کی اپنی سعی و کوشش ہے جو اچھے اور برے نتائج پیدا کرتی ہے انما ھی اعمالکم ترد علیکم فمن وجد خیرا فلیحمد اللہ ومن وجد غیر ذالک فلا یلومن الا نفسہ میں اسی حقیقت کو واضح کیا۔

قرون اولی کے مومنین قانتین تقدیر کا مفہوم صرف اتنا جانتے تھے کہ دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی حکومت ہمارے نفع و نقصان، سود و زیان، داد و ستد، سلب و عطا، اور حیات و ممات کی مالک نہیں، صرف خدائے یگانہ و قہار ہی کی ذات ہر قسم کے احکام نافذ کرتی ہے "اور اسی کے قبضہ قدرت میں سب کچھ ہے۔ اس عقیدہ نے عرب کے بادیہ نشینوں میں اتنا جوش و ولولہ عمل، اور استقلال و ثبات قدم پیدا کر دیا تھا کہ انہوں نے قیصر و کسری کی تخت گاہوں کو الٹ دیا، اس وقت تو ایک ایک قطرہ طوفان دربغل تھا، اور اب سب کے سب یاس و حسرت کی تصویر بنے ہوئے ہیں، فشتان بینہما۔

(۴) جہاد فی سبیل اللہ، بہت سی زبانیں تو اس کے ذکر ہی سے گنگ ہیں، شیاطین الانس کا خوف ان کے رگ و پے میں اس درجہ اثر کئے ہوئے ہے کہ وہاں اللہ کے خوف کے لئے جگہ نہیں: یَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللَّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً ج (۴: ۷۹) اور جنھیں ابھی بولنے کی طاقت حاصل ہے وہ اسے جہاد بالنفس پر محمول کرتے ہیں، اور رجعنا من الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر کی غلط اور موضوع حدیث سے ان کا نفس خادع تمسک و اعتصام کرتا ہے، گویا ابلیس نے ان علمائے سو کو اپنے اعمال شیطانی کے لئے ایک آلہ بنا لیا ہے اور جس طرح چاہتا ہے ان سے کام لیتا ہے، لیکن قرآن حکیم نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ:۔

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ (۶۱: ۴)	بیشک خدا ان لوگوں کو محبوب رکھتا ہے جو اسکی راہ میں صف باندھ کر لڑتے ہیں گویا وہ ایک دیوار ہیں جسمیں سیسہ پلایا گیا ہے

تاریخ اسلام میں سب سے پہلے جن لوگوں سے تمام تعلقات و روابط منقطع کئے گئے وہ وہی تین جلیل القدر صحابہ تھے جو کاہلی کی بنا پر جنگ تبوک میں شریک نہ ہوئے:۔

وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۟ (۹: ۱۱۹)	اور ان تین پر بھی جو بانتظار امر خداملتوی رکھے گئے تھے یہاں تک کہ جب زمین باوجود فراخی ان پر تنگی کرنے لگی اور وہ اپنی جان سے بھی تنگ آ گئے اور سمجھ لئے کہ خدا کی گرفت سے اسکے سوا اور کہیں پناہ نہیں پھر خدا نے ان کی توبہ قبول کرلی تاکہ وہ آیندہ کے لئے توبہ کئے رہیں بیشک اللہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

جو لوگ جہاد میں شریک نہ ہوں ان کی نسبت فرمایا کہ نہ صرف یہی مصیبتوں اور تکلیفوں کا نشانہ بنیں گے بلکہ ان کی وجہ سے تمام قوم مبتلائے آلام ہو گی۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۟ (۸: ۲۵)	اور اس بلا سے ڈرتے رہو، جو خاص کر انہی لوگوں پر نازل نہیں ہو گی جنہوں نے تم میں سے سرتابی کی ہے بلکہ سب اس کی زد میں آجاؤ گے اور جانتے رہو کہ اللہ کی مار بڑی سخت ہے۔

جس طرح ہر شخص اپنی انفرادی زندگی کے بقا و قیام کے لئے ہر قسم کی جد و جہد کرتا ہے ٹھیک اسی طرح قرآن حکیم نے تمام مسلمانوں پر حیات اجتماعی کے قائم و دائم رکھنے کے لئے جہاد کو الزم اللوازم قرار دیا۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ (۸: ۶۲)	اور سپاہیانہ قوت، اور گھوڑوں کے باندھے رکھنے سے جہاں تک تم سے ہو سکے کافروں کے مقابلے کا سامان مہیا کئے رہو کہ ایسا کرنے سے اللہ کے دشمنوں پر اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو گے۔

پھر نبوت کے اعمال مہمہ میں سب سے اشرف و اعلیٰ مقام اسے نوازش کیا گیا:۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ ط (۸: ۶۶)	اے نبی! مسلمانوں کو جنگ و قتال کرنے کے لئے اُبھارو۔

عالم الغیب والسرائر کو اس امر کی اطلاع تھی کہ آخری زمانہ میں مسلمانوں کی تمام تر زندگی بطالت و بدعملی، اور جبن و نامردی کی تصویر ہوگی، جہاد فی سبیل اللہ سے بچنے کے لئے طرح طرح کے حیلے تراش کر نفس خادع کے فریب میں مبتلا ہو جائینگے اور قتال فی سبیل الحق والحریۃ ترک کر دینگے، اس لئے سورۂ توبہ میں انکے ایک ایک عذر لنگ کو بیان کیا، ہر ایک کی حقیقت آشکارا کر دی، اور بتا دیا کہ تمھیں کسی طرح بھی اس فرض اہم و اقدم سے نجات نہیں مل سکتی، یہ فوجی خدمت ہر مسلم مرد و عورت، امیر و غریب، پادشاہ و فقیر اور آقا و غلام پر لازمی ہے، اور اس سے کسی کو حق استثناء حاصل نہیں، ہم اس وقت صرف اشارات پر اکتفا کرتے ہیں، تفصیل کا مقام دوسرا ہے:۔

(الف) مخالفین و معاندین اسلام نے اپنی مجتمعہ قوت سے اسلامی حکومتوں کو تاخت و تاراج کرنا شروع کر دیا ہے، مسلمانوں کے تمام بلاد و امصار تباہ و برباد ہو رہے ہیں، اندیشہ ہے کہ حمیت مذہبی کی وجہ سے مسلمان مقابلہ کے لئے نہ اُٹھ کھڑے ہوں، دشمنان دین فوراً اپنے مواعید کاذبہ کا اعلان کر دیتے ہیں کہ فرزندان اسلام کے تمام حقوق کی حفظ و نگہداشت کی جائیگی، ان کے مقدس مقامات کا احترام کیا جائیگا، اور ان کے مذہبی و سیاسی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت روا نہ رکھی جائیگی اس قسم کی دل فریب باتیں سن کر اکثر حیلہ جو طبیعتیں پکار اُٹھتی ہیں کہ ایسے لوگوں سے جنگ کرنا حد درجہ کی سفاہت و بداخلاقی ہے، یہ تو پیکر فرشتگی و ملکوتیت ہیں، قرآن کہتا ہے کہ ان پر اعتماد کرنا جہل و نادانی ہے وہ کبھی اپنا وعدہ پورا نہ کرینگے۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَنْ يَعْمُرُوا	مشرکوں کو کوئی حق نہیں کہ اللہ کی مسجدیں آباد رکھیں

مَسٰجِدَ اللّٰہِ شٰھِدِیْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ بِالْکُفْرِ (۹: ۱۷) | اور اپنے اوپر کفر کی گواہی بھی دیتے جائیں۔

(ب) مسلمان اپنے گھروں میں نیک کام کرتے ہیں، علمائے کرام قرآن و حدیث کے درس میں مصروف ہیں، گروہ صوفیہ اپنی خانقاہوں میں اللہ اللہ کے نعرے لگاتا ہے کہ تزکیہ نفس حاصل ہو، ہزاروں لاکھوں انسان ہیں جو ان سے اپنی تشنگی کو دور کرتے اور سیراب ہو ہو کر گھروں کو لوٹتے ہیں، یہ لوگ ان اعمال صالحہ کو پیش کر کے اپنے آپ کو قتال فی سبیل اللہ سے مستثنیٰ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن لسان الٰہی ان بدبختان ملت کو ظالم قرار دیتی ہے:-

اَجَعَلْتُمْ سِقَایَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰھَدَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ؕ لَا یَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ (۹: ۱۱)	کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور خانہ کعبہ کے آباد رکھنے کو اس شخص کی خدمتوں جیسا سمجھ لیا، جو اللہ اور روز آخرۃ پر ایمان لاتا، اور اللہ کے راستہ میں جہاد کرتا ہے، اللہ کے نزدیک تو یہ برابر نہیں، اور اللہ ظالم لوگوں کو راہ راست نہیں دکھایا کرتا۔

حضرت عبداللہ بن المبارک نے اپنے سال کو چار حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا، تین ماہ تجارت کرتے، تین ماہ درس حدیث میں مصروف رہتے، تین مہینوں میں حج ادا کرتے، اور باقی ایام جہاد فی سبیل اللہ میں صرف کرتے، انہوں نے حضرت فضیل بن عیاض کو خط بھیجا جو اس وقت بیت اللہ میں معتکف تھے، اور حضرت عبداللہ مصروف جہاد، اس خط کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

یا عابد الحرمین لو ابصرتنا

لعلمت انک بالعبادۃ تلعب!

فضیل رو پڑے اور کہا ابو عبدالرحمٰن سچ کہتا ہے۔

(ج) بنیادی ضرورتیں، ماں باپ کی محبت، رشتہ داروں کی خبرگیری، مساکین و غربا کی اعانت، اور زمین و جائداد کی حفاظت، ان میں سے ایک چیز بھی جنگ

سے مستثنیٰ نہیں کر سکتی :۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِیْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ؏ (۹: ۲۴)	کہدو اگر تمہارے باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں، کنبے دار، مال جو تم نے کمائے ہیں، سوداگری جس کے مندا پڑ جانے کا تم کو اندیشہ ہو، اور مکانات جن کو تمہارا جی چاہتا ہے، اللہ، اس کے رسول، اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے تم کو زیادہ عزیز ہوں تو صبر کرو، یہاں تک کہ جو کچھ خدا کو کرنا ہو وہ تمہارے سامنے لا موجود کرے، اور اللہ ان لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا جو سرتابی کریں

(د) قلت تعداد، فقدان اسباب، اور ضعف ظاہری کی بنا پر جہاد کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِیْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۚ (۹: ۲۵)	اللہ بہت سے مواقع پر تمہاری مدد کر چکا ہے، اور حنین کے دن جبکہ تمہاری کثرت نے تم کو مغرور کر دیا تھا، تو وہ تمہارے کچھ بھی کام نہ آئی اور زمین باوجود وسعت کے تم پر تنگی کرنے لگی، پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔

(ہ) تاجرانہ تعلقات اور ملازمت کے روابط کی بنا پر کسی قوم سے جنگ کو ملتوی نہیں کیا جا سکتا، اور یہ خیال نہ ہو کہ اس سے علیحدگی اختیار کرنے پر آمدنی کے تمام ذرائع مسدود ہو جائینگے :۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً	مسلمانو! مشرک تو گندے ہیں، تو اس برس کے بعد حرمت والی مسجد کے پاس بھی نہ پھٹکنے پائیں، اور اگر ان کے ساتھ لین دین بند ہو جانے سے تم کو مفلسی کا

فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَآءَ ؕ (۹: ۲۸)

اندیشہ ہو تو خدا چاہے گا تو تم کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔

پس ان تمام آیات نے واضح کر دیا کہ جب تک آنکھوں میں بصارت ہے، کان سن سکتے ہیں، ناک سونگھ سکتی ہے، زبان میں قوت گویائی، ہاتھوں میں پکڑنے کی طاقت، اور پاؤں میں چلنے کی قابلیت ہے، ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ جہاد کی تیاری کرے، تمام محبتوں اور چاہتوں پر اس کی شیفتگی و وارفتگی غالب رہے، اس کا سودا سر میں ہو اور اسی کی زنجیر پاؤں میں ہو کہ یہی احب الاعمال الی اللہ ہے، یہی سنام الاسلام ہے، یہی عصارۂ ایمان، اور مغز عبادت ہے:۔

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝ (۲۲: ۷۷و۷۸)

اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو، جو حق جہاد کرنے کا ہے، اس نے تم کو تمام دنیا کی قوموں میں سے برگزیدگی اور امتیاز کے لئے چن لیا، پھر جو دین تم کو دیا گیا ہے، وہ ایک ایسی شریعت فطری ہے جس میں تمہارے لئے کوئی رکاوٹ نہیں، یہی ملّت تمہارے مورث اعلیٰ ابراہیم خلیل کی ہے، اور اس نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے گزشتہ زمانوں میں بھی اور اب بھی تاکہ رسول تمہارے لئے اور تم تمام عالم کی ہدایت اور نجات کے لئے شاہد ہو۔ پس اللہ کے رشتہ کو مضبوط پکڑو، جان اور مال دونوں کو اس کی عبادت میں لٹاؤ، وہی تمہارا ایک آقا اور مالک ہے اور پھر جس کا خدا مالک و حاکم ہو اس کا کیا اچھا مالک ہے اور کیسا قوی مددگار۔

احادیث نے اس کی اہمیت کو اور زیادہ کھول کر بیان کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

والذی نفسی بیدہ لوددت

خدا کی قسم میں چاہتا ہوں کہ اللہ کی راہ میں شہید ہو کر دوبارہ

ان اقتل فی سبیل اللہ ثم احی ثم اقتل، ثم احی ثم اقتل، ثم احی ثم اقتل	زندہ ہو جاؤں پھر شہادت کا درجہ حاصل کرکے زندہ کیا جاؤں پھر شہید ہو کر زندہ ہوؤں پھر قتل کیا جاؤں۔

دوسری حدیث میں کہا:۔

رباط یوم فی سبیل اللہ خیر من الدنیا وما فیہا	ایک دن اللہ کی راہ میں چوکیداری کرنی بہتر ہے دنیا اور اس کی تمام چیزوں سے۔

جس شخص نے جہاد کا ایک لمحہ کے لئے بھی ارادہ نہ کیا ہو، اور اسی حالت میں مرگیا ہو اس کی نسبت فرمایا کہ وہ منافق کی موت مرا ہے:۔

من مات ولم یغزو ولم یحدث بہ نفسہ مات علی شعبۃ من نفاق	جو شخص مرگیا، نہ تو اس نے اپنی زندگی میں کبھی جہاد کیا، اور نہ اسکے کرنیکا ارادہ ہی کیا، پیدا ہوا وہ نفاق کی موت مرا۔

ایک موقعہ پر یوں ارشاد ہوا:۔

ان ابواب الجنۃ تحت ظلال السیوف۔	جنت کے دروازے تلواروں کے سایہ کے نیچے ہیں۔

غلط فہمی کے اسباب

آیات کا مفہوم سمجھنے میں اکثر غلطیاں اس لئے سنگ راہ ہوگئیں کہ باریک بیں نگاہوں نے الفاظ کو موشگافی کی نظر سے دیکھا، اور جب اس سے بھی سیری نہ ہوئی، تو دامان نگاہ کو تنگ کرنے کے لئے ہر قسم کی تاویلات سے مدد لی، اور بات کہیں سے کہیں جا پڑی، بے شبہ قرآن حکیم کا مفہوم اور مطلب سمجھنے کے لئے سخن فہم اور نکتہ سنج طبیعت کی ضرورت ہے، لیکن اسی کے ساتھ ہر سخن جائے وہر نکتہ مکانے دارد کے اصول سے بھی علیحدگی ممکن نہیں، قرآن کے پڑھنے والے کو جس علم و فن پر عبور لازم ہے وہ اسوہ حسنہ رسول اللہ ہی، جس کی ناواقفیت سے تفسیر میں صدہا مشکلات پیدا ہوگئی ہیں۔

دوسری غلط فہمی شانِ نزول کے متعلق پیدا ہوگئی، ہر آیت کے لیے کوئی نہ کوئی واقعہ فرض کرلیا گیا، پھر اس کے مطالب کو اسی مخصوص حادثہ میں محدود کردیا، ان میں بیشتر وہ واقعات تھے جو اہلِ کتاب سے منقول اور اس لیے ناقابلِ اعتماد تھے، مگر ان اربابِ تفسیر نے انہیں اسرائیلیات کو اصل و اساس قرار دیکر قرآن کی تفسیر لکھی، اور اس طرح اس کتاب کی اجتماعی اور محیط الکل حیثیت کو بالکل نظر انداز کردیا، قرآن کو افسانہ گوئی کی کتاب بنادیا، قصۂ یوسف، واقعہ حسن و عشق بن گیا، اور اب تو عام زبانوں پر یہ جاری ہے :-

کہ من اسیر معشوق او بفرزند است!

سلیمان کے عجائب و غرائب تو زبان زد خاص و عام ہیں، ہاروت و ماروت کا ذکر بھی اسی قبیل سے ہے۔

قرآن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ اُمتوں کے واقعات اس لیے بیان کئے جاتے ہیں کہ لوگ ان سے بصیرت اندوز ہوں، ان سے استخراج و استنباط نتائج و شواہد کریں، جہانگیری و جہانداری کے اصول و ضوابط کی تعلیم ہو۔

پھر مصیبت یہ ہوئی کہ قرآن کے تخاطب کو صرف عرب کے لئے مخصوص کردیا، کہا کہ یاایھا الناس سے مراد کفارِ مکہ ہیں اور یاایھا الذین اٰمنوا کا روئے سخن اہلِ مدینہ کی جانب ہے، اس میں شک نہیں کہ نزولِ قرآن کے وقت اولین مخاطب یہی لوگ ہیں، مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دنیا کی باقی قومیں اور آنے والی نسلیں ان آیات کی مخاطب نہیں بن سکتیں، علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں۔

اختلف اھل الاصول ھل العبرۃ بعموم اللفظ او بخصوص السبب والارجح عندنا الاول۔	اہلِ اصول کا اس امر میں اختلاف ہے کہ عموم لفظ کا اعتبار ہوگا یا خصوص سبب کا، ہمارے نزدیک قول اوّل ہی ارجح و اقویٰ ہے۔

باوجود اس قسم کی تصریحات کے متاخرین نے پھر بھی کچھ خیال نہ کیا، اسی کا آج اثر ہے کہ صرف برکت اور بزرگی کی خاطر قرآن کی تلاوت ہوتی ہے، اس لئے کہ لوگوں کے نزدیک اس کے مخاطب عرب تھے نہ کہ ہم، انھیں یہ خیال نہیں ہوتا کہ قرآن باربار درس و مطالعہ کی دعوت دیتا ہے، محض الفاظ پر زور دینا اور حقیقت سے غافل رہنا شریعت کے نزدیک بیکار ہے، اس کا روئے سخن عالمگیر ہے، وہ ایک بین المللی جامعہ کے قیام کے لئے آیا ہے، وہ ہماری انفرادی و اجتماعی خرابیوں کا تذکرہ کرتا ہے، ان کی اصلاح و تہذیب کے لئے مرتب قانون پیش کرتا ہے، مگر چونکہ یہ حقیقت پیش نظر نہیں اسلئے ہماری قوتیں بیکار ہوگئیں، اپاہجوں کی اُمت بن گئے، احیا اور تجدید کی ضرورت محسوس ہوئی تو یورپ کیجانب دیکھا اسی کی تقلید اعمی کی زنجیروں نے ہمارے پاؤں کو بوجھل کردیا،

اقسام القرآن کا علم نہایت ہی معنی خیز اور لطیف و دلاویز تھا، جس سے صدہا سرائر و محجوبات فطرت کا کشف و بروز ہوتا تھا، مگر اوّل تو اُن کی نظر ہی وہاں تک نہ پہنچی، اور اگر امام فخر الدین رازی کو کچھ تنبہ ہوا بھی تو اتنا سا کہکر رہ گئے کہ قسمیں صرف اُن چیزوں کی بیان کی جاتی ہیں جو جلیل القدر ہوں۔

قرآن حکیم میں باربار کہا گیا کہ جو لوگ ایمان باللہ اور عمل صالح رکھتے ہیں وہ ضرور کامیاب ہونگے، زندگی کے ہر شعبہ میں شادکام و بامراد رہیں گے، اور کبھی انہیں حزن و ملال نصیب نہ ہوگا ارباب تفسیر نے اس امر پر مہر لگادی کہ اعمال صالحہ کے جن نتائج و ثمرات کا ذکر کیا گیا ہے، وہ قیامت کے لئے مخصوص ہیں، دنیا میں مسلمان ذلیل و رسوا رہینگے، اس خیال نے پختگی پیدا کی، اور اب تو یہی عقیدہ ہر مسلمان کے قلب و دماغ پر حاوی ہے، پس مسلمان دنیا کی جانب سے غافل ہوگئے، اور محکومانہ زندگی پر قناعت کربیٹھے، مگر قرآن کہتا ہے کہ:۔

كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَأَتَاهُمُ | جو لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں انھوں نے بھی پیغمبروں کو

العذاب من حيث لا يشعرون ○ فاذاقهم الله الخزي في الحيٰوة الدنيا ج (٣٩: ٢٦، ٢٥)	جھٹلایا تو ان کو عذاب نے ایسی طرف سے آلیا کہ انھیں اس کی خبر بھی نہ تھی، ان کو اس دنیا کی زندگی میں اللہ نے ذلت کا مزا چکھایا۔

دوسری جگہہ فرمایا :-

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ج فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ج وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ط (٢: ٧٩)	تو کیا کتاب الٰہی کی بعض باتوں کو مانتے ہو، اور بعض کو نہیں، پس جو لوگ تم میں سے ایسا کرینگے، اس کے سوا ان کا اور کیا بدلہ ہوسکتا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ان کو ذلت ہو اور آخر کار قیامت کے دن بڑے ہی سخت عذاب کی طرف لوٹائے جائیں۔

ایک مقام پر یوں ارشاد ہوا :-

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ط (٣: ١٠٨)	جہاں دیکھو، ذلت ان پر سوار ہے، مگر اللہ، اور نیز لوگوں کے عہد و پیمان کے ذریعہ سے کہیں ان کو پناہ مل گئی تو دوسری بات ہے، خدا کے غضب میں گرفتار ہیں اور محتاجی ہے کہ الگ ان کے پیچھے پڑ گئی ہے۔

یہ تمام آیات اس حقیقت کو واضح کر رہی ہیں کہ ذلّت و مسکنت، خسران و خذلان، اور غلامی و محکومی اللہ تعالیٰ کے غضب اور اس کے عذاب شدید کی نشانیاں ہیں، البتہ جن ارباب قدس و طہارۃ کو وہ اپنے فضل مخصوص کے لیے چن لیتا ہے، ان کو جنت ارضی، خلافت الٰہی، اور سرفرازی و سربلندی نوازش کرتا ہے، چنانچہ فرمایا :-

لا تهنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان كنتم مومنين (٣: ١٢٣)	نہ ہمّت ہارو، اور نہ غم کرو، تم ہی غالب رہوگے، اگر تم مومن ہو۔

پھر کہا :-

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ۔ اور ہم زبور میں پند و نصیحت کے بعد یہ بات لکھ چکے ہیں کہ ہمارے نیک بندے زمین کی سلطنت کے وارث ہونگے۔

اس سے زیادہ اور کیا صداقت ہوسکتی ہے :-

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (۲۴ : ۵۴)	تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل بھی کرتے ہیں ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو سلطنت ضرور عطا کرے گا۔

سیاست تو ان کے نزدیک شجرۂ ممنوعہ سے کم نہ تھی، اس کا قرب و اتصال بھی ان کے لئے ارتکاب کبیرہ کے برابر تھا اور بعض نکتہ آفریں طبائع نے تو اپنی بدمذاقی کا یہاں تک ثبوت دیا کہ لاتقربا ھذہ الشجرۃ کی تفسیر میں لکھا کہ اس میں جس درخت کے قریب جانے کی ممانعت کی گئی ہے وہ یہی سیاست ہی۔ اس خیرہ نظری کی انتہا یہ ہوئی کہ مذہب اور سیاست کو دو جداگانہ چیزیں سمجھا جانے لگا، اب تو ہر شخص اسکو مسلمانوں کے مسلمہ عقائد میں سے تسلیم کرتا ہے، اور ارباب عمائم اپنے مواعظ و خطب میں ببانگ دہل کہہ اُٹھتے ہیں کہ مذہب کا حلقہ دوسرا ہی اور سیاست کا دوسرا۔ ساء ما یحکمون۔

آہ! ان بدبختان ملت کو یہ تمیز نہ رہی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ معجزات قاہرہ اور بشارات عظیمہ دیکر فرعون کے پاس بھیجتا ہے، فرعون مشرک بھی ہے، مے نوش بھی ہے، بدکار بھی ہے، فاسق بھی ہے، فاجر بھی ہے، غرض وہ سب کچھ ہے جو دنیا کا ایک سیہ کار اور شریر و ظالم انسان ہوسکتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک پیغمبر برحق تھے، توحید الٰہی، رد شرک و اصنام پرستی، تزکیۂ نفس و اخلاق، درس کتاب و حکمت، ان کے فرائض نبوت کے حقیقی ارکان ہیں، ان کا مخاطب، ایک مشرک و فاجر بادشاہ اور ایک مشرک و فاجر حکمران قوم تھی، اگر سیاست اور دین دو الگ الگ چیزیں ہیں جیسا کہ نادانی اور جہل کے ابلیس نے تمہیں سمجھایا ہے،

اور اگر ایک قوم کو غلامی سے نجات دلانا ایک غیر دینی عمل ہی جیسا کہ بدبختانہ تم سمجھتے آرہے ہو تو اب ضرور تھا کہ حضرت موسیٰ کی دعوت و تبلیغ بھی اس چیز سے بالکل علٰحدہ ہی جس کا نام تم نے سیاست رکھا ہے۔ وہ آتے اور فرعون سے سب کچھ چاہتے مگر وہ نہ چاہتے جو نہ تو دین ہے، اور نہ پیغمبرانہ دعوت کا کوئی جزو حقیقی مگر قرآن حکیم تمہارے سامنے موجود ہے، خدا نے فرعون کو نہ تو توحید کی دعوت دی نہ اس کی شراب کی بوتلیں توڑ ڈالیں، نہ اس کی سیاہ کاریوں کا جائزہ لیا، بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس دعوت کا صرف ایک ہی مقصد بتا کر رخصت کیا :-

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۲۰ : ۲۵﴾	فرعون کے پاس جاؤ کیونکہ وہ بڑا سرکش اور ظالم ہو گیا ہی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے پاس آئے، اور اُنہوں نے بجز اس کے اور کچھ نہ کہا کہ :-

اَنْ اَدُّوْٓا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰهِ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿۴۴ : ۱۷﴾	خدا کے بندوں یعنی (بنی اسرائیل) کو مجھے واپس دیدو جسے تم نے اپنا محکوم بنا رکھا ہی، میں تمہارے پاس ایک امانت دار رسول بن کر آیا ہوں۔

تم نے غور کیا، یعنی حضرت موسیٰ نے فرعون کے آگے اپنی تبلیغ کا مقصد یہ نہیں کہا کہ فسق و فجور چھوڑ دو، گناہ اور شرارت سے باز آجاؤ، نیک زندگی اختیار کرو، پاک طریقوں پر عمل کرو، بلکہ اولین مطالبہ یہ کیا کہ خدا کے جن بندوں کے پاؤں میں تو نے اپنی محکومی اور غلامی کی زنجیریں ڈالدی ہیں انھیں چھوڑ دے اور مجھے واپس دیدے، خدا نے مجھے اس قوم کا امین بنایا ہی اس کے بندوں کو میں آزادی دلاؤں گا، محکومی کی جگہ ایک حکمران قوم بناؤں گا، خدا کے بندے خدا کی امانت ہیں، تو ظالم و مستبد ہی اس لئے تو اس امانت کا مستحق نہیں، یہ شرف اللہ نے مجھے عطا فرمایا ہے کہ میں اس امانت کو

ٹھیک ٹھیک اپنے پاس رکھونگا۔

یہ مطالبہ اگرچہ نہایت مختصر الفاظ میں کیا گیا، لیکن درحقیقت وہ سیاست کی روح، سیاست کا مغز اور سیاست کی حقیقی تفسیر تھا۔

دعوت و تبلیغ

اب ہم اتنی منازل مختلفہ طے کرنے کے بعد مذہب کے اس اہم داقدم باب کی طرف توجہ کرتے ہیں جس میں داخل ہونے کے بعد ہر قوم نے کامرانی و سربلندی کی راہیں اپنے سامنے کشادہ پائی ہیں، اور جہاں ذراسی ذلتہ قدم نے اُن کو ہمیشہ کے لئے حرف غلط کی طرح مٹا دیا ہے۔

اسلام سے قبل جس قدر اقوام و امم اس زمین کی پشت پر پیدا ہوئیں، اگر ان کے تنزل و انحطاط کے اصولی اسباب و مراتب کا درس و مطالعہ کیا جائے تو سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز علت یہی نظر آئیگی جو تمام امراض و مفاسد ملی کے لئے بمنزلہ اصل و اساس کے کام دیگی کہ امت کے تمام افراد نے تبلیغ و دعوت کے اہم داقدم فرض سے بعد و ہجر اختیار کیا، اُنہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ بُرائی کا ارتکاب کیا جا رہا ہے مگر ٹس سے مس نہ ہوئے گویا آنکھیں اس لئے نہ دی گئی تھیں کہ اُن سے دیکھنے کا کام لیتے فانہا لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور۔

پھر اس کے ساتھ دوسری مصیبت یہ ہوئی کہ ایک مخصوص گروہ نے دعوت و اصلاح کو اپنے اندر محدود کر دیا کہ کسی دوسرے کو دخل دینے کا حق حاصل نہیں، ہندوؤں میں صرف برہمن ہی ویدوں کے عالم بن سکتے ہیں، دوسروں کو صرف ان معبودان باطل کی رسوم پابندی کرنی پڑتی ہے، رومن کیتھولک کے فادروں نے کتاب مقدس کے اسرار و خزائن پر قبضہ کرکے اپنے آپ کو اربابًا من دون اللہ کا درجہ دیا۔

قرآن حکیم کا نزول ہوا کہ وہ ان بیڑیوں کو کاٹ دے جو لوگوں کے پاؤں میں ڈالدی

گئی ہیں۔ اس نے ہر مسلم کا فرض قرار دیا کہ وہ مبلغ ہے اور اسلام و قرآن کی آواز دنیا کے گوشہ گوشہ اور کونہ کونہ میں پہنچانا اس کا مقصد حیات۔ اس لئے صاف صاف اعلان کر دیا کہ:۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (۳ : ۱۰۶)	لوگوں کی راہ نمائی کے لئے جتنی امتیں پیدا ہوئی ہیں ان میں تم سب سے بہتر ہو کہ اچھے کام کرنے کو کہتے، اور برے کام سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ (۲ : ۱۳۷)	اور اسی طرح ہم نے تم کو درمیانی امت بنایا تا کہ لوگوں کے راہ نما بنو۔

سورۂ حج میں فرمایا:۔

الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ۝ (۲۲ : ۴۲)	اگر حاکم بنا کر ہم زمین میں ان کے پاؤں جما دیں تو نماز پڑھیں گے، زکوٰۃ دیں گے، لوگوں کو اچھے کاموں کے لئے کہیں گے، اور برے کاموں سے منع کرینگے، اور سب چیزوں کا انجام کار اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔

یہ تمام آیات بغیر کسی اختلاف و تفریق کے بابانگ دہل اس حقیقت کا اعلان کر رہی ہیں کہ مسلمان صرف اس غرض کے لئے دنیا میں بھیجے گئے ہیں کہ وہ ہر نیکی کے آمر اور ہر برائی کے ناہی ہیں، تبلیغ و دعوت ان کا طغرائے امتیاز ہے جو ان کو باقی تمام اقوام عالم سے نمایاں کرتا ہے، اس کا ہر ہر فرد پیکر دعوت و اصلاح ہے اور اس میں کسی ایک گروہ کی تخصیص نہیں، بلکہ یہ فرض عام اور سب پر فرداً فرداً حاوی ہے۔

سورۂ عصر نے تو کامیابی اسی تبلیغ و اشاعت ہی کو قرار دیا کہ اگر فرزندان اسلام تواصی بالحق و تواصی بالصبر نہ کرینگے تو خسران و خذلان، اور ذلت و ادبار میں مبتلا ہونگے،

اور پھر وہی لوگ مستوجب عقوبت نہ ہونگے جنہوں نے تبلیغ وارشاد کو اپنی زندگی کا مقصد اصلی قرار دیا اور اس کے ادا کرنے میں تساہل سے کام لینے لگے، بلکہ پوری اُمّت کی اُمّت مبتلائے آلام ہوگی۔ واتقوا فتنۃ لا تصیبن الذین ظلموا منکم خاصۃ

جبکہ ہر مسلم داعی الی الحق پیدا کیا گیا تھا، تو کیسے ممکن تھا کہ لسان نبوت خاموش رہتی، اور صحابہ کرام اس موضوع پر کسی قسم کی روشنی نہ ڈالتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ:-

بلغوا عنی ولو آیۃ۔ | اگر ایک آیت بھی جانتے ہو تو اس کی نشر واشاعت کرو۔

فلیبلغ الشاھد الغائب فان الشاھد عسی ان یبلغ من ھو اوعی لہ منہ۔

ہر وہ شخص جو اس وقت موجود ہے، غائب کو اس کی اطلاع کر دے، ممکن ہے جس کو اس کی خبر پہنچے وہ مبلغ سے زیادہ صاحبِ فہم و فراست ہو۔

پھر ایک جگہ فرمایا۔

من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ وان لم یستطع فبقلبہ وذلک اضعف الایمان۔

تم میں سے جو شخص کسی بُرائی کو دیکھے وہ طاقت سے کام لے کر اس کو روکے، اگر قوت نہیں تو زبان سے، ورنہ دل سے ضرور ہی بُرا جانے، اور یہ ضعیف ترین درجہ ایمان ہے۔

مزید تاکید کے بعد یہ ارشاد کیا:-

الا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ

تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے، اور ہر ایک سے اس کی ذمہ داری کی بابت سوال کیا جائیگا۔

حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ نے ان الفاظ میں اس کی اہمیت کو واضح کیا۔

لو وضعتم الصمصامۃ علی ھذہ واشار الی قفاہ ثم ظننت انی انفذ

اگر تم تلوار کو میری گردن پر رکھ دو، اور مجھے یہ توقع ہو کہ گردن کٹنے سے قبل میں ان کلمات کی

کلمۃ سمعتھا من النبی صلی اللہ علیہ وسلم قبل ان تجیزوا علی لانفذتھا۔	تبلیغ کرسکوں گا جو نبی علیہ السلام سے سن چکا ہوں تو ضرور کہہ کے رہونگا۔

صحابہ کرام کی حیات مقدس اس امر کی شاہد ہے کہ ان میں ایک ایک فرد مجسم دعوۃ اسلام تھا، وہ کہیں جاتے، تبلیغ کا درد ان کے دل میں تھا، ان کا ہر اقدام و ادبار اسی غرض کے لئے ہوتا، تجارت تھی تو اسی کے لئے، زراعت تھی تو اسی کی خاطر، بلاد بعیدہ اور ممالک اجنبیہ کے دور دراز سفر تھے، جنگلوں اور بیابانوں کی بادیہ پیمائی تھی، پہاڑوں کی سر بفلک چوٹیاں سمندروں اور دریاؤں کی طوفان خیز موجیں، آندھیوں اور طوفانوں کی ہلاکت خیز بربادیاں، ان کی راہ میں حائل تھیں مگر ان میں سے کوئی چیز بھی اُن کے لئے سنگ راہ ثابت نہ ہوئی، قید خانوں کی کوٹھری میں بھی وہ اسوۂ یوسفی کو ہاتھ سے نہ دیتے اور برابر تبلیغ میں مصروف رہتے، وہ جانتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام تر زندگی اسی فرض جلیل کے ادا کرنے میں گزر گئی، لوگوں نے آپ پر پتھر برسائے، گالیاں دیں، مجنون و ساحر کہا، کس لئے؟ صرف اس لئے کہ داعی حق، ناشر صداقت اور مبلغ قرآن تھے۔

لیکن آہ ثم آہ! مسلمانوں نے اس اسوہ حسنہ کو ترک کر دیا، اس سے بعد و ہجر اختیار کیا اور اس کو وراء ظھورھم پھینک کر یقین کر لیا کہ ضرور کامیاب ہونگے، لیکن صدیوں کے تجربہ نے آج اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ جب تک ہر فرزند اسلام قرآن حکیم کی دعوت کے لئے سر بکف کوشش نہ کرے گا، اور اس کتاب عزیز کو لے کر سر فروشانہ اقدام نہ کریگا، اُمت مسلمہ کا تنزل و انحطاط سے نجات حاصل کرنا محال قطعی ہے۔

چند ابتدائی صدیوں تک مسلمانوں کا یہ خیال تھا کہ تبلیغ و دعوت ہر مسلمان کا فرض حیات ہے، مگر آخر جمود و استبداد نے ان کی قوتوں کو پامال کر دیا، اور گروہ

علما نے اس پر قبضہ کر لیا، گویا یہ اقلیم فرمانروائی تھی جو صرف انہیں کے لئے مخصوص تھی، لیکن آج وہ بھی اپنے فرض سے غافل اور خانقاہوں میں تسبیح وسجادہ پر قانع ہیں۔
پس وقت آگیا ہے کہ ہر وہ مسلم جس کے دل میں اسلام کا درد، اور دین کی ٹھیس ہے میدان عمل میں آگے بڑھے اور قرآن کی نشر و اشاعت میں لگ جائے،
اِنَّ هٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ ج وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ط (۶: ۱۵۴)

وَاٰخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم

سورۃ البقرۃ

(رکوع ۴۰، آیات ۲۸۶)

سورۃ کا نام

قرآن حکیم میں جس قدر سورتیں ہیں۔ ان کی بعض نمایاں اور ممتاز خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے نام معین کر دیئے ہیں، سورۂ بقرہ میں گائے ذبح کرنے کا قصہ بیان کیا گیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیتے ہیں، وہ اسکی حکمت سے آگاہ نہیں، اس لئے جدل و مناظرہ کا بازار گرم کرتے ہیں تاآنکہ بہت سے سوال و جواب، اور بحث و تمحیص کے بعد تعمیل ارشاد کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، چونکہ اس میں قربانی کے اہم و اعظم ترین اصول کی تعلیم تھی جو اقوام و امم کے عروج و ارتقا کی اساس و بنیاد ہے اس لئے اس سورۂ مبارکہ کا نام بقرہ تجویز ہوا۔

ترتیب نزول

یہ سورہ تمام و کمال دار الہجرت ہی میں نازل ہوئی ہے صاحب اتقان نے صرف دو آیتوں کو مستثنیٰ کیا ہے۔

ماقبل سے تعلق

قرآن حکیم کی موجودہ ترتیب میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ بقرہ آئی ہے، ایک عاجزانہ

درماندہ انسان خدائے قدوس کے حضور میں کھڑا ہو کر الصراط المستقیم کی درخواست کرتا ہے کہ وہ راہ حق کو پالے، اور ضلالت و گمراہی سے محفوظ رہے، اس سورہ مبارکہ میں دعا کو اجابت بخشی گئی، اور ایسی تعلیم نوازش ہوئی جو ہدی للمتقین ہے، اور جس کا طغرائے امتیاز یہ ہے کہ وہ ان کو اولئك على هدى من ربهم و اولئك هم المفلحون کے پاک و مزکی گروہ میں شامل کر دیتی ہے۔

ام الکتاب میں مغضوب علیہم اور الضالین کے نقش قدم پر چلنے سے پناہ مانگی گئی تھی، اس سورہ نے شرح و تفصیل کے ساتھ ان مغضوبین کے جذبات و احساسات، الف و عادات، رسم و رواج، اور امراض و مفاسد سے بحث کی، ضالین کے حقائق مستورہ کو آل عمران نے بے نقاب کیا۔

فاتحۃ الکتاب، متن ہے اور تمام قرآن اس کی شرح و تفسیر، یہ اجمال ہے اور وہ تفصیل۔

موضوع سورۃ

آپ پہلے چند مقدمات کو پیش نظر رکھ لیجئے کہ ان پر ہمارے تمام مباحث تفسیر مبنی ہیں۔

(الف) قرآن حکیم کی ہر سورۃ کا ایک موضوع (ماسنہ عمود) ہے۔ اور اول سے لیکر آخر تک وہ سورۃ اسی پر مبنی ہے، جس قدر مطالب درمیان میں آگئے ہیں، وہ سب کے سب اسی ایک موضوع اصلی کے ناگزیر و ضروری اطراف بحث و تعلیم ہیں۔

(ب) ہر سورۃ کی ابتدا و انتہا، اس موضوع کے معلوم کرنے کی کنجی ہے۔

(ج) جب ہر سورۃ کا ایک موضوع ہے، تو یہ چیز بھی ضمناً آپ کو معلوم ہو گئی کہ قرآن کی تمام آیات باہم مربوط و مسلسل ہیں، اور ایک نظم و اسلوب حقیقی کے ساتھ، سلسلہ بیان، بتدریج اجمال سے تفصیل، دعوی سے دلیل، اور تعلیم سے امثال و نظائر کی طرف بڑھتا اور کھلتا جاتا ہے، اسی کو قرآن حکیم نے "تصریف آیات" سے جابجا تعبیر کیا ہے، "صرف" کے معنی لغت میں رد الشئی من حالۃ الی حالۃ کے ہیں۔

یہ اصول اساسی آپ کے سامنے ہیں، سورۂ بقرہ کی ابتداء میں فرمایا اولئك على هدى من ربهم واولئك هم المفلحون، فلاح کے حسب ذیل معانی بیان کئے گئے ہیں:-

(۱) الذی انفتحت لدی جوہ الظفر ولم يستغلق عليه جسکے لئے ظفر و کامرانی کے ابواب مفتوح ہوں، اور اس کی تمام رکاوٹیں یک قلم مفقود ہو جائیں۔

(۲) الفلاح بمعنی البقاء فیکون المعنی اولئك هم المباقون فی النعیم المقیم، فلاح کے معنی بقا بھی بیان کئے جاتے ہیں، اس اعتبار سے آیت کا مفہوم یہ ہوگا، کہ دائمی نعمتوں میں ہمیشہ رہینگے۔

(۳) اصل الفلاح الشق، فعلى هذا يكون المعنى اولئك هم المقطوع لهم بالخير فی الدنیا والآخرة، فلاح کے معنی انشقاق اور قطع و برید کے بھی آتے ہیں اس لئے معنی یہ ہونگے کہ دنیا و آخرت کی ہر قسم کی خیر و برکت اور عزت و کرامت، صرف فرزندان اسلام کے لئے مخصوص کر دی گئی ہے۔

ان تینوں معانی میں در اصل کوئی اختلاف نہیں، بلکہ سب کے سب ایک ہی حقیقت کو بیان کرتے ہیں مقصد سب کا یہی ہے کہ دنیا کی ہر انتہائی کامیابی و کامرانی، اجلال و تبجیل، جہانگیری و جہانداری، جنت ارضی و سماوی مخصوص ہے ان ارباب فضل و کمال کے لئے جن کے یہ خصائص و امتیازات اور کمالات و فضائل ہیں، اور وہ کبھی ناکام و خاسر نہیں رہ سکتے۔

اسی سورۃ کے آخر میں دعا کی گئی: فانصرنا على القوم الكفرين، جس کے معنی اسکے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں کہ ہمارے مخالفین و معاندین، تباہ و برباد ہوں اور ہمیں ان پر ظفر و کامرانی نصیب ہو۔

پس اس سورۃ کے اوّل و آخر نے ہمیں بتا دیا کہ اس کا موضوع اصلی یہی ہے کہ اس میں ایسی تعلیم دی جائے جو مسلمانوں کے اندر صحیح کیرکٹر پیدا کر دے وہ اپنے مذہب اور اخلاق کے پابند رہ کر دنیا و آخرت کی انتہائی کامیابیوں اور کامرانیوں سے بہرہ اندوز ہوں، گویا دوسر

الفاظ میں اس کا موضوع و مقصد، مسلمانوں کو خلافت کبریٰ کی تعلیم دینا، اور اس سے سرفراز کرنا ہے۔

اگر ہم ان تمام احادیث و آثار کو پیش نظر رکھیں جن میں اس سورہ کے فضائل بیان کئے گئے ہیں تو ہمارے دعوے کی صداقت روز روشن کی طرح واضح ہو جائیگی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

لا تجعلوا بیوتکم مقابر وان البیت الذی تقرا البقرۃ فیہ لا یدخلہ الشیطان۔ ترمذی	اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ، جس گھر میں سورہ بقرہ کی تلاوت ہو وہاں شیطان کا داخلہ بند ہوتا ہے۔

ایک جگہ آپ نے ان الفاظ میں اس کی اہمیت ظاہر کی:-

لکل شیٔ سنام وان سنام القرآن سورۃ البقرۃ ترمذی	ہر ایک چیز کا ممتاز و نمایاں حصہ ضرور ہوتا ہے، قرآن کی یہ خصوصیت کبریٰ اور علو و رفعت، سورہ بقرہ کو حاصل ہے۔

ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنگ کے لئے ایک جماعت بھیجنا تھی، جس کے لئے سردار کی تلاش میں تھے، جن لوگوں نے اپنی خدمات پیش کیں، ان میں سے ہر ایک سے آپ یہ پوچھتے کہ قرآن کے کونسے اجزا حفظ ہیں اتنے میں ایک نوجوان نے کہا کہ مجھے سورۂ بقرہ یاد ہے، آپ نے فرمایا کہ تم اس جماعت کے امیر ہو، حالانکہ عمر کے اعتبار سے وہ سب سے چھوٹا تھا۔[1]

مسلم میں انس بن مالک سے روایت ہے۔

کان الرجل اذا قرا البقرۃ وآل عمران جد بیننا	جو شخص، بقرہ اور آل عمران پڑھ لیتا، اس کی ہم بے انتہا قدر و منزلت کرتے تھے۔

---

[1] ترمذی ج ۲، ص ۱۱۱

بیہقی نے کتاب الدلایل میں عثمان بن ابی العاص سے روایت نقل کی ہے کہ میں باوجود اس امر کے کہ صغیر السن تھا، اور میری عمر کچھ زیادہ نہ تھی، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے طائف کی گورنری نوازش فرمادی، صرف اس لئے کہ میں سورہ بقرہ پڑھی تھی
شعب الایمان میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سورۂ مبارکہ کو آٹھ سال میں ختم کیا، اور اس کے درس و فکر سے فارغ ہونے پر اونٹ ذبح کیا اور تمام دوستوں کو دعوت دی
ان احادیث و آثار کو بار بار پڑھئے، آپ اسکے سوا اور کسی نتیجہ پر نہ پہنچینگے کہ اس سورہ کا موضوع، خلافت کبریٰ ہے اور مسلمانوں کو ایسی تعلیم دینا ہے جو انہیں تمام مہذب ممالک پر حکمراں بنادے، چنانچہ دنیا ایک مرتبہ اس کا تجربہ کر چکی ہے، اب مستقبل کو دیکھنا باقی ہے۔
وما ذلك على الله بعزيز۔

روئے سخن

قرآن حکیم کا درس و فکر ایک اور عجیب و غریب اصل واساس کی جانب ہماری راہ نمائی کرتا ہے۔ دنیا کے اندر صدہا اقوام وامم ہیں، ان کے مذاہب وادیان ہیں، رسوم و عوائد ہیں، عقائد و اخلاق ہیں، قرآن حکیم اس لئے آیا کہ تمام اختلافات کے لئے حکم اور ظنون واوہام کے لئے کتاب مبین ہو، اس لئے ضروری تھا کہ اس کا روئے سخن سب کی جانب ہو، ہر ایک کی غلط کاریاں بیان کرکے اس کو صحیح راہ عمل دکھائے۔
چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا، سورۂ اعراف تک اس نے مختلف ادیان و مذاہب کو مخاطب کیا، قرآن حکیم کے نزول کے وقت یہودیوں کی سب سے بڑی جماعت تھی، جس کو مذہبی ہونے کا دعویٰ تھا، یہ لوگ شریعت موسوی کے حامل، اور اسی کے مبلغ و داعی تھے، لیکن مدت ہائے دراز سے اپنے فرض جلیل سے بعد و ہجر اختیار کر چکے تھے، اس لئے سب سے پہلے بنی اسرائیل کو اس سورۃ میں مخاطب کیا گیا، ان کی انفرادی و اجتماعی خرابیاں ظاہر کیں، ان کی حاکمانہ زندگی کے امراض و مفاسد بیان کئے، تبلیغ و دعوت کے دوران میں انہوں نے جن بدکاریوں کا ارتکاب

کیا تھا، ان پر تفصیلی روشنی ڈالی، اور آخر میں بتا دیا کہ اس وقت یہ لوگ مسند تبلیغ سے علیحدہ کر دیے جاتے ہیں، ان کی جگہ پر مسلمان کام کرینگے۔

دنیا کی قوموں اور ملتوں میں جب کبھی انقلابات ہوئے ہیں، وہ ہمیشہ نتیجہ ہوتے ہیں ارباب علم و فضل کی سعی و کوشش اور دعوت و تبلیغ کا، ان کے وعظ و تذکیر سے زندگی پیدا ہوتی ہے، اور حریت و استقلال کے جذبات میں جوش و ولولہ پیدا ہوتا ہے، اگر یہ لوگ تعصب و بیکاری اختیار کر لیں تو تمام قوم پر عالم ممات طاری ہو جاتا ہے، یہ لوگ قوم کے لئے بمنزلہ قلب کے ہوتے ہیں، ان کی صحت و تندرستی پر حیات ملی کا دار و مدار ہے، اور ان کے بیمار ہونے سے تمام قوم امراض کا شکار ہو جاتی ہے۔

سورہ بقرہ میں یہودی علماء کی خرابیاں ذکر کیں، تاکہ امت مسلمہ کے اہل علم ان سے بصیرت اندوز ہوں، اور اپنے دامن کو ان آلودگیوں سے بچانے کی کوشش کریں۔

مضامین کی فہرست

دنیا میں دو ہی قسم کے آدمی نظر آتے ہیں:

(الف) عوام الناس، جن کی نظر نتائج و ثمرات، اور ظواہر اعمال پر ہوتی ہے، وہ درخت کو اس کے پھل کی وجہ سے شناخت کرتے ہیں، ان لوگوں میں تنبہ و اعتبار پیدا کرنے کے لئے، سورہ بقرہ نے ابتدا سے لیکر دوسرے پارہ کے دوسرے رکوع تک مخصوص کر دیا۔

(ب) ارباب علم و فضل جو حقائق و معارف کے شیفتہ، اسرار و حکم کے دلدادہ، اور دقائق و غوامض کے جویاں ہیں، ان کے لئے سورہ کے تمام بقیہ اجزا ہیں، وہ ان کی تحلیل و تفرید کریں، ارباب سیاست، اس کے درس و فکر میں مصروف ہوں، جو جماعتیں، قوانین و ضوابط کی تنظیم و تشکیل کی ذمہ دار ہیں، اس کو آویزہ گوش بنائیں، اور جن کی سعی و کوشش

صرف علم کے کسب وحصول کے لیے وقف ہو، اسی طرف اپنی توجہ مبذول کریں۔

سورہ بقرہ کو حسب ذیل ابواب وفصول میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

پہلا باب، وحی والہام کی ضرورت، از ابتدا سورۃ تا آیت ۴۳

پہلے دو رکوع میں بتایا، کہ ہر جدید تعلیم وتحریک کے وقت تین قسم کے لوگوں کا پیدا ہونا ضروری ہے۔

(۱) ارباب ایمان وصلاح، جو اس تعلیم حقہ کے آگے اپنی گردنیں خم کر دیتے ہیں۔

(۲) دجاجلہ کفر وشیطنت، جن کا مقصد وحید یہی ہوتا ہے کہ ہر اصلاح کی مخالفت ہو، اور دنیا کا نظام ہمیشہ درہم برہم رہے۔

(۳) منافقین، دونوں جماعتوں سے تعلق رکھتے ہیں، کفار ومشرکین سے یہ لوگ زیادہ خطرناک اور نقصان دہ ہوتے ہیں۔

پھر تذکیر بالاء اللہ کے بعد ان کو قانون الٰہی کی جانب توجہ دلائی، اور بتایا کہ وحی والہام پر صرف وہی لوگ نکتہ چینی کرتے ہیں، جن میں حسب ذیل امراض ہوں:۔

(الف) ایمان کمزور ہو۔

(ب) طبیعت ضعیف ہو۔

(ج) عقل کوتاہ ہو۔

ان کو بتایا کہ مذہب، انسان کی فطرت میں داخل ہے، اس لیے وہ الہام ربانی کے آگے سر جھکانے کو مجبور ہے، چنانچہ آدم علیہ السلام پریشان ومضطرب پھرتے رہے، تا آنکہ وحی الٰہی نے ان پر چند کلمات الہام کئے جو ان کے اطمینان قلب اور ثلج صدر کا باعث بنے۔

پس قصہ آدم سے ثابت ہو گیا، کہ دنیا میں انسان کو سکون واطمینان صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو وحی الٰہی کا پابند بنائے اس کے بغیر نہ تو اسکی زندگی

کسی کام آئیگی، اور نہ وہ حیوانات کے درجہ سے ترقی کر سکے گا۔

دوسرا باب، قرآن حکیم کی ضرورت، آیت ۳۸ سے ۱۴۶ تک،

پانچویں رکوع میں یہودیوں کی اجمالی خرابیاں ذکر کی گئیں اور وہ حسب ذیل ہیں۔

(الف) علمی۔

(ب) عملی۔

(ج) انتظامی۔

ربع اول سے ان امراض ومفاسد پر نہایت ہی شرح وتفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی، اور دو باتوں کا فیصلہ کیا گیا:۔

(۱) آیت ۶۹ تک یہ بتا دیا گیا کہ جس وقت تم خلافت ارضی اور فضیلت علی العلمین سے سرفراز تھے، تم نے ایسی بدکرداریوں اور بدعملیوں کا ارتکاب کیا، جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ تم سے حکومت چھین لی گئی، اور تم پر ذلت ومسکنت طاری کی گئی، حیات ملّی کے لئے تین قسم کے ارباب فضل وکمال کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن تمہاری قوم ان سے یکسر خالی تھی، پس آیندہ ہمیشہ کے لئے تم جہانگیری وجہاں داری سے محروم کر دیے گئے۔

(۲) آیت ۷۰ تک اس حقیقت کو بے حجاب کیا، کہ تم مسلمانوں کے ساتھ مل کر بھی دعوت وارشاد کا فرض اہم واقدم انجام نہیں دے سکتے، اسی ذیل میں ان کے عالموں، دولتمندوں، اور عام لوگوں کی باطل پرستیوں اور غلط عقیدوں کو بیان کیا۔

ان دو صورتوں کے علاوہ، بنی اسرائیل محکومانہ زندگی ہی بسر کر سکتے تھے مگر یہ بھی صاف کر دیا گیا کہ وہ شریف رعایا بننے کی بھی قابلیت نہیں رکھتے، چنانچہ آیت ۸۶ تک اس پر بحث کی، اور ساتھ ہی فرزندان اسلام کو یہ تعلیم دی گئی کہ اپنے تمام تعلقات وروابط سابقہ ان سے منقطع کر لیں جب یہودیوں نے دیکھا کہ بحث کا دائرہ بالکل تنگ ہو گیا، تو نسخ ادیان وملل کی طرف توجہ کی، اور اس کو اپنے شبہات کا نشانہ بنایا، لیکن فوراً ہی مسلمانوں کو بتا دیا گیا، کہ ان شبہات

کے پیش کرنے سے ان کی اصلی غرض کیا ہے۔ آیت ۱۳۱ تک یہی بحث تھی، اب انہوں نے نسخ قبلہ کو لیا، اور اس پر اعتراضات کی بوچھار شروع کر دی قرآن نے اس کے دو جواب دیے:۔

(الف) الزامی

(ب) اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام، بنائے کعبہ اور دعائے خلیل کا تذکرہ کیا اور انہیں بتا دیا کہ اب دنیا کی ہدایت وراہ نمائی صرف قرآن کے لئے مخصوص ہے، اور فرزندان اسلام ہی مسند تبلیغ وارشاد کے مالک ہونگے۔ یہ بحث آیت ۱۵۱ تک ختم ہو جاتی ہے۔

تیسرا باب، تہذیب اخلاق، یہاں سے قرآن کی اصلی تعلیم شروع ہوتی ہے، اور سب سے پہلے ان اخلاق کو پیش کیا جاتا ہے، جو انفرادی حیثیت سے ہر انسان میں پیدا ہونا ضروری ہیں، جو اصل واساس حیات ملی ہیں، اور جن کی غرض وغایت یہ ہے کہ قوم میں صحیح کیرکٹر پیدا ہو، ساتھ ہی اس تعلیم گاہ کی جانب اشارہ کیا، جس میں داخل ہونے کے بعد ان اخلاق کی تشنیہ د تولید ہو سکتی ہے۔ آیت ۱۶۲ تک۔

چوتھا باب، تدبیر منزل، رزق کمانے کے ذرائع ووسائل پر بحث کی، صرف کرنے کا قانون دیا، دیوانی اور فوجداری ضوابط کی تدوین کی، اندیشہ تھا کہ ان امور میں مصروف رہنے کی وجہ سے لوگوں کی روحانیت اور تعلق باللہ میں ضعف وکمزوری نہ پیدا ہو جائے اسلئے روزے فرض کر دیے، اور مذہبی تعلیم کی نشر واشاعت کی جانب توجہ دلائی۔ آیت ۱۸۷ تک۔

پانچواں باب، معاملات، اس میں دو باتوں کا فیصلہ کیا:۔

(الف) ناجائز طریق سے کسی کا مال کھانا قانونی جرم ہے، اس سے پرہیز کرو، اور ان امور کا فیصلہ خود ان کا کیرکٹر کر دیگا کیونکہ پہلے اس کی تعلیم دی جا چکی ہے، عدالت کو شاذ ونادر ہی مداخلت کی نوبت آئیگی۔

(ب) مسلمان اپنے تمام حسابات، قمری مہینوں کے مطابق رکھیں، کیونکہ کائنات خلقت حضرت ابراہیم نے قمری مہینوں میں ایام حج معین کئے ہیں، آیت ۱۸۸ و ۱۸۹

چھٹا باب، سیاست مدن، اس میں تین فصلیں ہیں:۔

فصل اوّل، جہانگیری، اس میں حسب ذیل مسائل بیان کئے گئے ہیں:۔

(۱) کوئی وقت، کوئی شخص، اور کوئی جگہ جہاد فی سبیل اللہ سے مستثنیٰ نہیں قرار دی جاسکتی۔

(۲) ہر مسلمان کا فرض ہے کہ جس قدر روپیہ اس کی جائز اور ضروری حاجات زندگی سے بچ جائے وہ تمام وکمال جہاد فی سبیل اللہ کی خاطر، خلافت اسلامی کی نذر کر دے۔

(۳) حج ضروری قرار دیا گیا تاکہ ان تمام اعمال مہمہ کی مشق ہو، جو جہاد کے لئے الزم اللوازم ہیں۔

(۴) وحدت مقصد ضروری ہے۔

(۵) ہر شریف اور خاندانی انسان کے پاس اسلام کی آواز حق وحریت پہنچانا فرائض دین میں سے ہے۔

(۶) جہاد فی سبیل اللہ کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی۔

(۷) اس راہ ایثار وفدویت میں تکالیف وشدائد سے کوئی چارہ کار نہیں۔

(۸) جہاد کب تک رہیگا، اور اسے کس قدر روپیہ کی ضرورت ہے۔

(۹) ناجائز ذرائع سے کمایا ہوا روپیہ کبھی اس احب الاعمال الی اللہ کے لئے قبول نہیں کیا جاسکتا۔

(۱۰) جب لڑائیوں کی کثرت ہوگی، تو یتامیٰ بھی ضرور بہت زیادہ تعداد میں نظر آئینگے، ان کی تعلیم وتربیت، اور حفظ وصیانت کے لئے قانون بنایا گیا، آیت ۲۲۰ تک۔

فصل ثانی، جہانداری، اس میں ان مسائل کا تذکرہ ہے:۔

(۱) کسی غیر مسلم کو حاکم نہ بنایا جائے۔

(۲) جس قدر قومیں مسلمانوں کے ماتحت رہینگی، اُن کو کامل اندرونی آزادی دی جائیگی۔

(۳) جدید قانون کی وضع و ترتیب کے وقت اس امر کا خیال رہے کہ وہ نظام صالح کا حامی، بر و تقوی کا محافظ و نگران کار، اور نوع انسانی کے لئے زندگی بخش ہو۔

(۴) صدر جمہوریہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے فرائض ادا کرے، اگر اس کے لئے تیار نہ ہو تو اس کو چار ماہ کی مہلت دی جائے، اگر اس نے اپنی اصلاح کرلی تو بہتر، ورنہ معزول کردیا جائے۔

(۵) عزل کے وقت اسکی تمام سابقہ واجب الادا رقوم ادا کردی جائیں۔

(۶) معزول ہونے پر وہ ان اصلاحات کو خراب و برباد کرنے کی کوشش میں نہ لگ جائے، جن کو اس نے اپنے زمانہ حکومت میں نافذ کیا تھا۔

(۷) اگر معزول شدہ حاکم، دوسری مرتبہ، رعایا کے حقوق کی نگرانی کا عہد و میثاق کرے، تو اسے انتخاب میں آنے کا موقعہ دیا جائے۔

(۸) اگر وہ تین مرتبہ معزول ہو تو پھر اُسے امیدوار کی طور پر کھڑے ہونے سے روک دیا جائے۔

(۹) حاکم کی رائے کو کچھ ترجیح ضرور حاصل ہوگی۔

(۱۰) معزول شدہ حاکم، دوسروں کے انتخاب میں رکاوٹیں نہ پیدا کرے۔

(۱۱) حکومت کے لئے خود اپنے آپ کو پیش نہ کرے، بلکہ قوم خود ان لوگوں کی تلاش کرے، اور جن میں قابلیت و استعداد ہو، ان کے ہاتھ میں عنان سلطنت دینے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

(۱۲) حکومت کرنے میں ذاتی اور خاندانی مصلحتوں کی پروا نہ کرے، بلکہ عامہ

ناس کا نفع و سود پیش نظر ہو۔ آیت ۔ ۲۴۲ تک

فصل ثالث، علمی سیاست کا نمونہ، اس میں ان مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۱) یہ ضروری نہیں کہ جو شخص میدان جنگ میں جائیگا، وہ مرہی کے رہیگا

(۲) جنگ کے لئے امیر کا انتخاب ضروری ہے۔

(۳) شرائط انتخاب بیان کئے۔

(۴) رائے عامہ کا احترام ضروری ہے۔

(۵) کام شروع کرنے سے پہلے فوج کا امتحان ہو۔

(۶) صرف ان لوگوں کو میدان جنگ میں بھیجا جائے، جن کے اندر سب سے زیادہ، اعتماد علی اللہ، اور قربانی کا جذبہ صادقہ ہو۔ آیت، ۲۵۲ تک۔

ساتواں باب، خلافت کبریٰ، اس میں حسب ذیل امور کا تذکرہ ہے :۔

(۱) تمام مہذب اور شائستہ ممالک پر مسلمانوں کی حکومت کس طرح قائم ہو سکتی ہے۔

(۲) خلیفۃ المسلمین کے فرائض۔

(۳) مال دار اپنی تمام دولت و ثروت، خلافت اسلامی کی نذر کردے۔

(۴) مال قبول کرنے کے لئے چند شرائط کو بیان کیا، جب تک ان قیود کے ماتحت روپیہ نہ دیا جائیگا۔ خلافت کبھی اس کو لینے کے لئے تیار نہ ہوگی۔

(۵) مالداروں کی طرح، ارباب علم و فضل بھی، ان شرائط کو پیش نظر رکھکر ملک و ملت کے لئے اپنے تمام علوم و معارف وقف کردیں۔

(۶) حب مال کو دور کرنے کے لئے سود کی حرمت بیان کی۔

(۷) قرض کا قانون مدون کیا۔

(۸) ارکان خلافت کو بتادیا، کہ ان کے تعلقات و روابط اپنے خالق کے ساتھ کس قسم کے ہوں، اور انہیں تدوین قانون کے وقت کس امر کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے، آیت ۲۸۶ تک۔

مضامین کی فہرست آپ کے سامنے ہے، اس اجمال نے جہاں اور صدہا امور پر روشنی ڈالی ہے، وہاں ان دو حقیقتوں کو بھی واضح کر دیا ہے کہ:-

(الف) اس سورت کی تمام آیات، باہم مربوط اور مسلسل ہیں، اور ایک نظم و اسلوب حقیقی کے ساتھ تمام کڑیاں باہم وگر پیوست کر دی گئی ہیں۔

(ب) اس میں خلافت کبریٰ کے نظم و ادارہ کی تعلیم دی ہے، اور اس سورۃ کا مقصد یہ ہے کہ فرزندان اسلام، کمزوری کی جگہ طاقت کے لئے، بے کسی کی جگہ فرماں روائی کے لئے، اور رونے کی جگہ خوشیوں کے لئے تمام عالم میں نمایاں اور ممتاز ہوں۔

باب ا
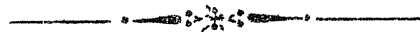
وحی الٰہی کی ضرورت

(۱) الٓمٓ

حروف مقطعات

قرآن حکیم میں ۲۹ سورتیں ہیں، جن کی ابتدا حروف مقطعات سے کی گئی ہے، مفسرین کرام ان حروف کے متعلق مختلف خیالات رکھتے ہیں، کچھ لوگوں کی یہ رائے ہے کہ اللہ تعالےٰ کے بہت سے اسرار و رموز ہیں، جن کی اطلاع کسی انسان کو نہیں دی گئی، یہ حروف بھی ان میں شامل ہیں، بعض یہ کہتے ہیں کہ ان کے معانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہیں، کیونکہ یہ اللہ اور اسکے رسول کے اسرار و خفایا ہیں، بعض اس طرف گئے ہیں کہ یہ متشابہات ہیں، اور ان میں گفتگو کرنا قرآن کی رو سے جرم ہے، لیکن ایسے بھی ہیں جو ان کے مطالب بیان کرتے ہیں، چنانچہ ابن مسعود اور ابن عباس کا یہی مذہب ہے۔

سب سے پہلے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دنیا میں قرآن حکیم کا نزول اس لئے ہوا کہ اس کی ضلالت و گمراہی دور ہو، اور عمل حق و صالح کی قاہرانہ قوت ناطق ہو۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے اس امر کو تسلیم کر لیں کہ قرآن کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جسکے مطالب کوئی فرد بشر نہیں جانتا، تو دوسرے الفاظ میں اس اعتقاد کے یہ معنی ہونگے کہ قرآن کا ایک جزو ایسا

ہے جس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا، اور اس لئے بیکار ہے، حالانکہ قرآن اپنی نسبت اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ وہ ہدی للناس ہے، برہان ہے، بصائر ہے، نور ہے، بصیرۃ ہے اور سب سے آخر یہ کہ وہ العلم ہے، دنیا کے پاس اسکے سوا جو کچھ ہے ظن ہے، تخمین ہے، اٹکل کی باتیں اور قیاسات ہیں، اس زمین کی پشت پر جس قدر ادعار علم کے اعلانات ہیں ظن اور شک سے آگے نہیں بڑھ سکتے، پس یہ ایک لمحہ کے لئے بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ حروف مقطعات کا علم کسی کو نہیں دیا گیا۔

البتہ جن لوگوں نے ان کو متشابہات میں داخل کیا، اور اس لئے ان کے درس و فکر سے الگ ہو گئے ان سے ہمیں کچھ عرض کرنا ہے، انہوں نے جس آیت سے استدلال کیا وہ حسب ذیل ہے:

هو الذی انزل علیك الكتاب منه اٰیات محكمات هن ام الكتاب واخر متشابهات، فاما الذین فی قلوبهم زیغ فیتبعون ما تشابه منه ابتغاء الفتنة وابتغاء تاویله، وما یعلم تاویله الا الله والراسخون فی العلم یقولون اٰمنا به كل من عند ربنا وما یذكر الا اولوا الالباب۔ (۳ : ۵)

وہی ہے جس نے تم پر یہ کتاب اتاری، جس میں سے بعض آیتیں محکم ہیں کہ وہی اصل کتاب ہیں، اور دوسری متشابہ، تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے، وہ تو قرآن کی متشابہ آیتوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں، تاکہ فساد پیدا کریں، اور ان کے اصل مطلب کی ٹوہ لگائیں۔ حالانکہ اللہ کے سوا ان کا اصلی مطلب کسی کو معلوم نہیں، اور جو لوگ علم میں بڑی پائگاہ رکھتے ہیں وہ تو اتنا ہی کہکر رہ جاتے ہیں کہ ان پر ہمارا ایمان ہے، سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے، اور وہی سمجھتے ہیں جن کو عقل ہے۔

اس آیت میں دو لفظ بیان کئے گئے ہیں۔

محکم،

متشابہ،

یہی دونوں لفظ محل بحث و نظر ہیں، اس لئے ہم فی الحال ان کو ترک کرکے ایک اور

چیز پیش کرنا چاہتے ہیں۔

دنیا میں جس قدر علوم و معارف موجود ہیں، اگر ان تمام کی تحلیل و تفریق کی جائے تو دو چیزیں ممتاز نظر آئینگی جن پر تمام مباحث علمیہ کا دار و مدار ہوگا، اور جو حقیقی اور فطری تقسیم ہوگی ہر علم اور کتاب کی، وہ جلیل القدر اصل و اساس حسب ذیل ہیں۔

(الف) بدیہی جس کا فہم و ادراک ہر شخص کے لئے آسان و سہل تر ہو جس کے لئے دلیل و حجت کی ضرورت نہ ہو،

(ب) نظری، پہلے بدیہی مقدمات کو ترتیب دینے کی ضرورت پڑتی ہے، تب کہیں جا کر اس کی حقیقت مستورہ بے نقاب ہوتی ہے۔

تعلیم دینے کا فطری طریق یہی ہے کہ ابتدا میں بدیہیات کو پیش کیا جائے، پھر جوں جوں استعدادی قابلیت بڑھتی جائے، نظریات کی جانب توجہ ہو۔ اسی قاعدہ کی پابندی سے صحیح نشو و نما اور تربیت ہو سکتی ہے، لیکن جو لوگ کوتاہ بین اور کج فہم ہوتے ہیں وہ ہمیشہ نظریات کو پہلے لیتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی تعلیم بیکار رہ جاتی ہے، اور کوئی ثمرہ مرتب نہیں ہوتا۔

یہ دو اصول آپ کو ہر جگہ جاری و ساری نظر آئیں گے، فلسفہ، منطق، ہندسہ، نجوم، مابعد الطبیعات، علم النفس وغیرہ کوئی علم اور کتاب نہیں، جس نے ان اصولوں کی پابندی نہ کی ہو۔

یہی وہ اصول ہیں جن کی جانب، آل عمران کی اس آیت نے ہماری راہ نمائی کی ہے، وہ بتاتی ہے کہ قرآن کی تمام آیات دو حصّوں میں تقسیم ہو سکتی ہیں:۔

(الف) محکمات، جن کو آپ بدیہیات سے تعبیر کرتے ہیں، اور یہی اصل و اساس ہیں، انہیں پر تمام تعلیمات الٰہیہ کا دار و مدار ہے۔

(ب) متشابہات، جن کے لئے دوسرا لفظ نظریات کا ہے۔

قرآن میں بحث و نظر کا صحیح طریق تو یہی تھا کہ ابتدا میں محکمات کو لیتے، جب ان سے فارغ ہو جاتے، پھر متشابہات کی جانب توجہ کرتے، لیکن جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہو، وہ اس قاعدہ سے گریز کرتے ہیں، اور سب سے پہلے متشابہات میں گفتگو شروع کر دیتے ہیں اور ایسا کرنے میں چند مقاصد ان کے پیش نظر ہوتے ہیں :-

(۱) لوگوں کو پریشان کر کے تشویش و اضطراب میں ڈال دیں، جن عقائد و اخلاق کو وہ اب تک درست تسلیم کرتے تھے، انھیں غلط معلوم ہونے لگیں، ایک آیت کا مفہوم دوسری کے خلاف کر دیں، اصول سے الگ ہو کر اپنی رائے سے قرآن کی آیات کا مطلب جداگانہ قرار دیں۔ شک پیدا کر کے قوائے عملیہ کو فنا کریں۔

(۲) چونکہ ان کی عملی قوت بالکل بیکار ہوتی ہے، اس لئے چاہتے ہیں کہ احکام و اوامر پر عمل کرنے سے قبل ہی ان کے نتائج و ثمرات سے آگاہی حاصل کریں، اپنی خواہش اور باطل عقیدہ کے مطابق معنی کریں، اور محکمات کو چھوڑ کر محض متشابہات ہی پر حصر کر دیں۔

ان اوامر و نواہی کے نتائج و عواقب نہ صرف اللہ ہی جانتا ہے، بلکہ راسخین فی العلم بھی ان سے محروم نہیں رہتے، یہ درجہ علیا ان کو صرف اس لئے نصیب ہوا کہ پہلے انہوں نے محکمات و بدیہیات کو لیا، جب ان میں رسوخ و کمال پیدا کر لیا تو متشابہات و نظریات کی جانب جھک گئے، اور یہ راہِ حق صرف وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جو ارباب بصیرت ہوں اور عقل و خرد سے بہرہ وافر رکھتے ہوں۔

اس قدر گفتگو سے یہ واضح ہو گیا، کہ جن لوگوں کو رسوخ فی العلم حاصل ہو وہ متشابہات اور حروف مقطعات کے مطالب سے آگاہ ہوتے ہیں، اب صرف اتنا سوال باقی رہ جاتا ہے کہ وہ ارباب فہم و بصیرت کون ہیں، جو اس گروہ میں شامل ہونگے، اس کا جواب بھی خود قرآن ہی سے دریافت کرنا چاہیے۔

قرآن حکیم نے دین الٰہی کا دوسرا نام العلم رکھا ہے۔

ولئن اتبعت اھواءھم بعد الذی جاءك من العلم (۲ : ۱۴۵) | اور اگر تو نے ان کی خواہشوں کی پیروی کی، بعد اس کے کہ تیرے پاس علم یعنی دین الٰہی آچکا ہے۔

ہر جگہہ گمراہ قوموں کے بغی و ضلالت اور عدوان و سرکشی پر ملامت کرتے ہوئے کہا فما اختلفوا الا من بعد ما جاءھم العلم بغیا بینھم (۴۵ : ۱۷) حاملین قرآن کی نسبت کہا: فی صدور الذین اوتوا العلم (۲۹ : ۴۹) وہ ان کے سینوں میں ہے جن کو علم دیا گیا، نیز کہا کہ یہ برہان ہے، اور نور و ہدی ہے، اور ہر جگہہ کفر کو کہا کہ وہ ظن ہے، شک ہے تخمین ہے، اور اٹکل کی باتیں اور قیاسات ہیں، وما لھم بذلك من علم ان ھم الا یظنون (۴۵ : ۲۴) پھر دین الٰہی کے ماننے اور اطاعت کرنے کو ایمان کہا، اور ایمان والوں کو مومن، ایمان، امن سے ہے، اور امن کے معنی طمانیۃ النفس اور زوال خوف و شک کے ہیں، ان تمام تصریحات سے واضح ہوگیا کہ دنیا میں علم و یقین صرف ایک ہی ہے، اور وہ وحی الٰہی ہے، اور اس کے سوا اور جس قدر ادعاء علم کے اعلانات ہیں، ظن اور شک سے آگے نہیں بڑھ سکتے، نیز یہ کہ ایمان کے معنی یقین حاصل کرنے کے ہیں، اور مومن وہ ہے جس کے پاس شک کی جگہہ یقین ہو، یہی وجہ ہے کہ مومن اور غیر مومن کو الذین یعلمون اور الذین لا یعلمون اور الاعمی اور البصیر سے تشبیہ دی، یعنی صاحبان علم اور بینا، اور ارباب جہل اور اندھے۔

اس بنا پر علم اضافی و محدود تو دنیا کے پاس ہے، مگر علی الاطلاق العلم، قرآن کے سوا اور کوئی نہیں، اور قرآن جس کے پاس ہے، وہی دنیا میں سب سے زیادہ عالم، اور سب سے بڑا جاننے والا ہے۔ پس وہ راسخ فی العلم ہے، اور اسی کو حق حاصل ہے کہ حروف مقطعات اور متشابہات میں گفتگو کرے۔

ہمیں یہ یقیناً معلوم ہے کہ عرب میں مقطعات حروف کا استعمال عام طور پر ہوتا تھا، عرب کے لوگ اس سے اجنبی نہ تھے، اگر یہ کوئی جدت طرازی ہوتی تو ضرور تھا کہ سب سے پہلے وہی اس کی مخالفت کرتے، کیونکہ ان سے بڑھ کر قرآن کا دشمن اور کون ہو سکتا تھا؟ تاریخ

میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں پیش کیا جا سکتا جس سے اس امر کی تائید ہو سکے کہ کسی عرب نے اعتراض کیا ہو۔

عرب میں حروف ہجا کو اصول کلمات تسلیم کیا جاتا تھا، اور ان میں سے ہر ایک کے معنی معلوم تھے، بلکہ بعض اوقات اذکیاء ملک کا انھیں میں امتحان ہوتا تھا، اہل عرب کا دعویٰ ہے کہ جس لفظ میں نون و فا جمع ہوں، اس کے معنی ہمیشہ خروج کے ہونگے، مثلاً نفر، نفث، نفح، نفخ، نفق، نفذ، و نفد وغیرہ، اگر فا و لام جمع ہوں تو اسکے معنی شگافتن کے آئینگے، مثلاً فلق، فلج، فلذ، فلو وغیرہ،

اسی طرح اگر ہم ترقی کرتے چلے جائیں تو صرف ایک حرف کے معانی و مطالب بھی معلوم کئے جا سکتے ہیں، اگر ان قواعد کو ملحوظ رکھا جائے جن سے حروف مقطعات کے مطالب معلوم ہو سکتے ہیں تو کہا جا سکتا ہے کہ الم اس سورت کا نام ہے، اور اس سورت میں جسقدر مضامین شرح و بسط کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، الم میں ان کی جانب اجمالی اشارہ ہے۔

شیخ صدر الدین قونوی نے حروف مقطعات کے متعلق دو رسالے تحریر کئے ہیں جن میں ان کے اجمالی معانی و مطالب پر روشنی ڈالی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے فوز الکبیر میں ایسے اصول و ضوابط بیان کئے ہیں جن پر کاربند ہو کر ارباب فضل و کمال مقطعات کے معانی معلوم کر سکتے ہیں، و من شاء التفصیل فلیرجع ثمہ۔

موعودہ کتاب

(۲) ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ | اس کتاب میں کچھ شک نہیں ڈرو الوں کو راہ بتاتی ہے۔

اس سورۃ میں بنی اسرائیل سے خطاب ہے، ان سے کہا جاتا ہے کہ یہ وہی کتاب ہے جس کے نازل کرنے کا وعدہ موسیٰ سے کیا گیا تھا، اس میں ذرا شک و اشتباہ کی گنجایش نہیں، اس کی صداقت حسب ذیل آیت سے ہوتی ہے۔

"میں اُن کے لئے، ان کے بھائیوں میں سے، تجھ سا ایک نبی برپا کرونگا، اور اپنا

کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا، اور جو کچھ میں اُسے فرماؤنگا وہ سب اُن سے کہیگا،" (استثناء، ۱۸: ۱۸)

یہ دعویٰ تھا، اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ ھدی للمتقین ہے، قرآن حکیم نے اپنی نسبت دوسری جگہہ کہا وہ ھدی للناس ہے، لیکن دراصل دونوں میں کوئی اختلاف نہیں، جہاں اس نے کہا، وہ ھدی للناس ہے، تو اس سے یہ مراد ہے کہ اس میں متقی اور غیر متقی دونوں شامل ہیں، اس جگہہ صرف ھدی للمتقین کہا، اس نے غیر متقی کو اس درجہ حقیر و ذلیل خیال کیا کہ اس کا ذکر ہی مناسب نہ سمجھا۔

تقویٰ کے معنی حسب ذیل بیان کئے گئے ہیں:۔

جعل النفس فی وقایۃ مما یخاف، ہر اس چیز سے بچنے کی کوشش کرنا جو اس کے لئے ضرر و نقصان کا باعث ہو۔

حفظ النفس مما یوثم، گناہ کی جانب دعوت دینے والی چیزوں سے پرہیز کرنا۔

حضرت ابوہریرہ سے ایک شخص نے پوچھا، تقویٰ کی کیا تعریف ہے، اُنہوں نے کہا جب تم ایسے راستہ سے گذرو جس میں چاروں طرف خاردار جھاڑیاں ہوں، تو کیا کروگے، سائل نے جواب دیا کہ اس وقت میری کوشش یہ ہوگی کہ میں ہر ممکن طریق سے اپنے دامن کو کانٹوں میں اُلجھنے سے بچاؤں، اور صحت و سلامتی کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچ جاؤں، فرمایا یہی تقویٰ ہے۔

ان کا مطلب یہ تھا کہ متقی وہ شخص ہے، جو ہر اس چیز سے پرہیز کرے، جو اس کے مقصد حیات میں رکاوٹ پیدا کرے، ہر تکلیف و مصیبت پر غالب آئے اور راہ آزادی کی تمام الجھنوں اور دلربائیوں سے دامن کو پاک رکھتا ہوا منزل مقصود تک پہنچ جائے، دوسرے الفاظ میں وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ صرف اسی کو متقی کہا جاسکتا ہے، جو اپنے مقصد حیات پر مر مٹے۔

بہر حال ان تمام تصریحات نے بتا دیا کہ اس کتاب میں ایسی ہدایتیں اور بصیرتیں موجود ہیں،

جن پر عمل کرنے سے متقی تیار ہوتے ہیں اور کوئی شخص متقی نہیں بن سکتا، جب تک وہ قرآن حکیم کو اپنے ہاتھ میں نہ لیلے۔

فارسی میں کہتے ہیں "این دایہ شیرہ این جوان است" ظاہر ہے کہ جوانی کے عالم میں دودھ پلانے کی ضرورت نہ تھی، بلکہ عہد طفولیت میں دودھ دیا گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قوی وطاقتور بن گیا، چونکہ اس کی جوانی اور توانائی ثمرہ ہے اس دودھ کا، اس لئے کہا گیا کہ شیرہ جوان است۔ ٹھیک اسی طرح قرآن نے کہا کہ ذلک الکتاب ھدی للمتقین، اس کتاب کی ہدایت سے متقین تیار ہوتے ہیں، قرآن کا ایک حصہ مکہ میں نازل ہو چکا ہے، اس پر عمل کر کے بہت سے لوگ ارباب صلاح وتقوی کے پاک ومزکی گروہ میں داخل ہو چکے ہیں، اس لئے یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ذلک الکتاب ھدی للمتقین۔

درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، اگر یہ معلوم کرنا چاہو کہ فلاں شخص طبیب اور معالج ہے تو دیکھو اس کے مریضوں کی کیا کیفیت ہے، اور اس کے بیمار کس قدر شفایاب ہوتے ہیں، اسی اصول پر مذاہب، اور صحائف واسفار آسمانی کی حقیقت معلوم کی جا سکتی ہے، اگر ایک کتاب کی تعلیم بہترین انسان بنا دیتی ہے، تو یقین کیجئے کہ وہ منزل من اللہ ہے ورنہ تحریف وتبدیل نے اس کے اثر کو زائل کر دیا ہے۔

یہودیوں کے پاس موسیٰ کی کتاب ہے، جس کی نسبت قرآن بھی ہدی و نور کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ وہ لوگ تورات کو کتاب الہٰی مانتے ہیں، وحی والہام کے سلسلہ کو تسلیم کرتے ہیں، جن اصولوں پر وہ اپنی کتاب کو وحی الہٰی ثابت کرتے ہیں وہی قرآن کے متعلق استعمال کر کے دیکھ لیں، اور پھر بتائیں کہ اس وقت کس کتاب کو زیادہ حق حاصل ہے کتاب الہٰی ہونے کا، تورات کو یا قرآن کو۔

تمہارا دعوی ہے کہ تورات نے متقین کی ایک جماعت تیار کی، قرآن بھی اپنے ارباب تقوی وطہارت کو پیش کرتا ہے، دونوں کا باہمی مقابلہ کرو، اور انصاف وحق پرستی کو پیش نظر

رکھ کر بتاؤ کہ کونسی تعلیم زیادہ موثر نتیجہ خیز اور مثمر برکات ہے۔ چنانچہ اگلی دو آیتوں میں ان متقین کو پیش کیا جاتا ہے، جو قرآن کی تعلیم سے تیار ہوئے پھر ان کا مقابلہ ہوگا ان لوگوں سے جو توراۃ کی تعلیم کا بہترین نمونہ تھے۔

ارباب تقویٰ

(۳) اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ	جو یقین کرتے ہیں بن دیکھا، اور درست کرتے ہیں نماز اور ہمارا دیا کچھ خرچ کرتے ہیں۔

ایمان بالغیب

جس چیز کا ہمارے ظاہری اور باطنی حواس ادراک نہیں کر سکتے وہ غیب ہے، ارباب تقویٰ کی اولین خصوصیت یہ بتائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر وہ ہر اس چیز کو ماننے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، جس کو انہوں نے کسی طریق پر بھی محسوس نہ کیا ہو، حضرت ابوبکر اور علی رضی اللہ عنہما سے یہ جملہ بار بار نقل کیا جاتا ہے کہ لو کشف الغطاء ما ازددت یقیناً، اگر درمیانی حجاب اوٹھا دیے جائیں تو ہمارے یقین و اذعان میں کسی قسم کا اضافہ نہ ہوگا، رسول کا کہنا اور اپنی آنکھوں سے دیکھنا دونوں برابر ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و ہم نشینی اور قرآن حکیم کی تعلیم و تربیت نے ایسے ارباب طہارت پیدا کر دیئے جن کا طغرائے امتیاز یہی تھا کہ وہ بغیر کسی دلیل و حجت کی رسول کے آگے جھک گئے، اور اللہ تعالےٰ پر ایمان لائے، حضرت موسیٰ علیہ السلام طور سینا سے توراۃ لیکر آتے ہیں، بنی اسرائیل کو اس پر ایمان لانے کو کہتے ہیں لیکن وہ جواب دیتے ہیں کہ لن نؤمن لک حتی نری اللہ جھرۃ، (۲: ۵۲) جب تک ہم خدا کو ظاہر میں نہ دیکھ لیں، ہم تو کسی طرح تمہارا یقین کرنے والے نہیں۔

اقامت صلوٰۃ

لغوی طور پر صلوٰۃ کا لفظ دعا اور رحمت کے لئے استعمال ہوتا ہے، لیکن قرآن حکیم نے

اس کو ایک اصطلاحی معنی کے لئے مخصوص کر لیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے طرز عمل سے اس کی تفسیر بیان کر دی ہے، اور اب اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ نماز کو ادا کریں، فرائض و واجبات، سنن و مستحبات کا خیال ہو، اوقات کی پابندی ہو اور تعدیل ارکان پیش نظر رہے،

جس وقت سورہ مزمل نازل ہوئی اور قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا کا حکم ہوا، ظاہر ہے کہ اس میں صرف رسول اللہ ہی مخاطب تھے، لیکن صحابہ بھی آپ کے شریک ہو گئے تمام شب اللہ کے حضور میں کھڑے رہتے، اور ہر وقت یہ خوف دامن گیر رہتا کہ کہیں تھوڑا وقت صرف کرنے پر عتاب نازل نہ ہو، یہ اس وقت کی حالت ہے جبکہ پانچ نمازیں فرض نہ ہوئی تھیں جس وقت ان نمازوں کا حکم ہوا، تو صحابہ کی یہ کیفیت تھی کہ اپنے اپنے کاروبار میں مصروف ہیں حی علی الصلوٰۃ کے الفاظ کان میں پڑے، اور سب کچھ چھوڑ کر فوراً مسجد میں آ گئے۔ انھیں کے بارہ میں کہا گیا: رِجَالٌ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلٰوةِ، (۲۴: ۳۷) یہ وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ کا نام سنتے ہیں تو اس پر قربان ہونے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں کوئی بڑی سے بڑی چیز بھی ان کو اپنی دلفریبیوں اور محبوبیتوں کا شیفتہ نہیں بنا سکتی۔

پس ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ جب وہ نماز پڑھے تو یہ سمجھ لے کہ جس طرح میں اس وقت حی علی الصلوٰۃ کے الفاظ سنتے ہی مسجد میں آ گیا ہوں ایسے ہی جب کبھی اسلام کو میری زندگی کی ضرورت ہو، تو میں فوراً اپنے آپ کو پیش کر دوں اور کوئی چیز بھی میرے لئے رکاوٹ کا باعث نہ بن جائے، سوتے وقت ہر مسلمان اپنے ایمان و اسلام کو دیکھے کہ اللہ کے ساتھ میں نے جو عہد باندھا ہے، اس میں کسی قسم کی کمی تو نہیں پیدا ہو گئی، اور کیا میں اس کے نام پر اپنے آپ کو قربان کرنے کے لئے تیار ہوں؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: حاسبوا قبل ان تحاسبوا، ہر شخص خود اپنا محتسب بن جائے اور قبل اسکے دوسرے لوگ اس پر حرف گیری کریں وہ خود ہی عیوب کو دیکھے اور اصلاح کرے۔

بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا، ادخلوا الباب سجدا، (۲: ۵۸) سجدہ کرکے دروازہ میں داخل ہو، وہ اس پر عمل تو کیا کرتے الٹا اس کے ساتھ تمسخر و استہزا کیا اور سرین کے بل رینگتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے فنستان بینھما۔

انفاق فی سبیل اللہ

متقین کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر چیز اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں خواہ روپیہ ہو، ان کے قوائے عملیہ ہوں، اور خواہ ان کی جان ہو، وہ سب کچھ حق و حریت کے لئے قربان کر دیتے ہیں، صحابہ کی جانی اور مالی قربانیوں سے تاریخ کے اوراق بھرے ہوئے ہیں، اور کسی مزید ثبوت کے محتاج نہیں، لیکن مثال کے طور پر صرف ایک واقعہ کافی ہوگا، جانی قربانی کے بارہ میں بخاری کی حسب ذیل روایت ملاحظہ ہو:-

قال المقداد یوم بدر یا رسول اللہ انا لا نقول لک کما قالت بنو اسرائیل لموسیٰ فاذھب انت وربک فقاتلا انا ھھنا قاعدون، ولکن امض ونحن معک (بخاری کتاب التفسیر)	معرکہ بدر میں مقداد نے کہا یا رسول اللہ! ہم بنی اسرائیل کی طرح نہیں کہ انہوں نے موسیٰ سے یہ کہہ دیا اذھب انت وربک فقاتلا ھھنا قاعدون بلکہ آپ تشریف لے چلیں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔

مالی قربانی کی کیفیت یہ ہے کہ جنگ کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے، ابوبکر جاتے ہیں اور سب کچھ لاکر نذر رسالت کر دیتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دریافت فرماتے ہیں کہ گھر میں بچوں کے لئے کیا رکھا، جواب دیتے ہیں کہ اللہ اور اس کا رسول۔

ان کے مقابلہ میں یہودیوں کی یہ حالت ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام ان سے بیت المقدس پر حملہ کرنے کے لئے کہتے ہیں تو ان کی طرف سے یہ جواب ہوتا ہے: فاذھب انت وربک فقاتلا انا ھھنا قاعدون، (۵: ۲۴) تم جاؤ اور تمہارا خدا، دونوں جاکر لڑو، ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ جب کبھی ان سے روپیہ مانگا جاتا ہے تو کہتے، ید اللہ مغلولۃ، (۵: ۶۴) خدا

کا ہاتھ تنگ ہے۔

انصار

یہاں تک مہاجرین کا تذکرہ تھا، جو سرزمین مکہ میں تعلیم قرآن سے تیار ہوئے، اب ان لوگوں کا ذکر آتا ہے، جو مدینہ میں اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے۔

(۴) وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ج وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ط ○	اور جو یقین کرتے ہیں جو کچھ اترا تجھ پر اور جو کچھ اترا تجھ سے پہلے اور وہ آخرت کو یقین جانتے ہیں۔

مدینہ منورہ میں یہودیوں کے تین قبائل آباد تھے، بنو نضیر[1]، قریظہ[2]، بنو قینقاع[3]، انصار کے دو قبیلے تھے، اوس اور خزرج، یہودیوں اور انصاریوں کی باہمی جنگ رہتی، جب کبھی یہودیوں کو ناکامی ہوتی تو وہ کہا کرتے کہ نبی آخر الزماں کے ساتھ ملکر ہم تم کو فنا کر دینگے، علاوہ ازیں اُنہوں نے مدینہ اور اس کے اطراف میں اپنی تعلیم گاہیں جاری کر رکھی تھیں، جن کو بیت المدارس کہتے تھے، انصار کے لڑکے ان کے مدارس میں تعلیم حاصل کرتے، اور ان کے عقائد وغیرہ سے واقف ہوتے، اس لئے جس وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا، یہ لوگ جوق جوق اسلام میں داخل ہونے لگے، ان میں عبداللہ بن سلام وغیرہ بھی شامل ہیں، ان لوگوں کی حسب ذیل خصوصیات اس آیت میں بیان کی گئیں:۔

(الف) قرآن حکیم پر اُن کا ایمان ہے۔

(ب) اس سے ماقبل کے تمام صحائف و اسفار آسمانی کے قائل ہیں۔

(ج) جزائے اعمال کا بھی انہیں یقین ہے۔

(۵) اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ق وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○	اُنہوں نے پائی ہے راہ اپنے رب کی، اور وہی مراد کو پہنچے

مہاجرین و انصار کے یہی دو گروہ ہیں جو راہ حق پر قائم ہیں، اور دنیا میں خلافت کبریٰ سے سرفراز ہونگے، چنانچہ دنیا اس کا تجربہ کر چکی ہے۔

کفار

ہر جدید تحریک کے وقت تین قسم کے لوگوں کا پیدا ہونا ضروری ہے۔

(الف) اس تحریک کے حامیان کار ہوں۔

(ب) سخت مخالف ہوں۔

(ج) جن کے تعلقات دونوں کے ساتھ ہوں۔

پہلی تین آیتوں میں ارباب صلاح و تقویٰ کا ذکر کیا، اب کفار و مخالفین کا تذکرہ آتا ہے۔

(۶) اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○	وہ جو منکر ہوئے، برابر ہے اُن کو تو ڈراوے، یا نہ ڈراوے وہ نہ مانیں گے،
(۷) خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ز وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ	مہر کر دی اللہ نے ان کے دل پر، اور اُن کے کان پر، اور اُن کی آنکھوں پر ہے پردہ، اور اُن کو بڑی مار ہے۔

فطرت انسانی کے متعلق مذاہب مختلفہ

اب تک فطرت انسانی کے بارہ میں دنیا کے خیالات حسب ذیل رہے ہیں:۔

(الف) انسان کی فطرت میں بدی ہی بدی ہے، باہر کی تربیت اسکو عارضی طور پر خوش نما کر دیتی ہے، وہ خصائص فطرت کے اعتبار سے بالکل حیوان ہے، لیکن تربیت پذیری کے لحاظ سے اس پر فوقیت رکھتا ہے، درخت کی شاخیں متناسب نہیں ہوتیں، لیکن ان کو کاٹ کر اور چھیل کر درست کر لیتے ہیں (Diogenes) دیوجانس کلبی اس فلسفہ اخلاق کا مشہور پیشوا گذرا ہے۔

(ب) اس کی فطرت بالکل سادہ ہے، اس میں نہ نیکی ہے نہ بدی، وہ محض ایک منفعل،

اثر پذیر اور نقش انگیز وجود ہے، وہ ایک دامن ہے جس کے اندر گنجایش کے سوا اور کچھ نہیں، اگر اس کو پتھر ملا ہے تو اس کو بھر لیگا، پھول ملے ہیں تو ان کو اٹھا لیگا، حکما، یونان میں اس مذہب کا ایک دور رہ چکا ہے، معتزلہ نے بھی زیادہ تر اسی کی پیروی کی، آج یورپ میں بھی حکما، اخلاق کا ایک بڑا گروہ یہی کہتا ہے۔

(ج) نیکی اور بدی دونوں اس کی فطرت میں موجود ہیں، بالقوہ وہ شیطان اور فرشتہ، دونوں ہے، دنیا میں آکر جس قسم کے خارجی اثرات ملتے ہیں انہی کے مطابق اسکی کوئی ایک قوت نشو و نما پاتی اور بروز کرتی ہے۔ اگر نیکی کے اثرات ملے تو قوت ملکوتی ابھرےگی اور چمکیگی، لیکن اگر برخلاف اس کے بدی کا گرد و غبار چھا جائیگا تو نیکی کی چمک ماند پڑجائیگی، اور بدی کی تاریکی پھیل جائیگی۔ دنیا کے قدیم و جدید دوروں میں اس مذہب نے سب سے زیادہ مقبولیت حاصل کی ارسطو کا یہی مذہب تھا، تقریباً تمام حکمائے اسلام اسکے قائل ہیں، ابن مسکویہ اسی کا داعی ہے، دور جدید کے حکمائے اخلاق نے اسی کے آگے اپنی گردنیں خم کردیں فخرالدین رازی نے وھدینٰہ النجدین اور فالھمھا فجورھا وتقوٰھا کی اسی مذہب کی بنا پر تفسیر کی ہے۔

قرآن کا فیصلہ

لیکن قرآن نے ان سب سے الگ اپنی راہ نکالی، وہ کہتا ہے کہ انسان خالص و کامل نیکی ہے، اس میں خیر کے سوا اور کچھ نہیں، جس قدر بھی برائی ہے وہ اس کا کسب خارجی ہے، نیکی اس کا فطری عمل اور بدی غیر فطری، خارجی اور یکسر صناعی ہے، اگر وہ نیک ہے تو یہ فطرت ہے، اگر بد ہے تو یہ تصنع ہے، قرآن اسی کو فطرت صالحہ، دین الٰہی، دین قیم، دین حنیفی، صراط مستقیم، فطرت اللہ، صبغۃ اللہ، اور اسلام کہتا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ انسان کی اصلی فطرت، اسلام ہے، اور کفر ایک صناعی اور غیر فطری عمل، اگر ایک انسان مسلم ہے تو اس کو یوں کہو کہ وہ اپنی اصلی فطرت صالحہ پر قایم ہے، اسکی

فطری روشنی نور دے رہی ہے، لیکن اگر ایک انسان مسلم نہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ فطرت حقیقی کا چراغ بجھ گیا، اس کے اندر کا آئینہ زنگ آلود ہو گیا، گرد و غبار کی کثافت نے اس کو سیاہ کر دیا، اور وہ فطرت کی صورت حقیقی کی جگہ ایک مسخ شدہ غیر فطری و مصنوعی جانور بن گیا۔ معصیت سے یہ فطری آئینہ زنگ آلود ہوتا ہے، اور کفر زنگ آلودگی کی وہ آخری حالت ہے جبکہ آئینہ بالکل سیاہ ہو گیا، اور ایک دھندلی سی چمک بھی اس میں باقی نہ رہی خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ اور سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وغیرہ تصریحات قرآنیہ میں اسی آخری درجہ ضلالت کی طرف اشارہ ہے اور لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا الآیۃ اولئك كالانعام بل هم اضل اور وجعلنا على قلوبهم اكنة ان يفقهوه میں اسی فطرت صالحہ کی پامالی اور ایک غیر فطری حالت مسخ و انقلاب کو واضح کر دیا گیا ہے۔

یہی معنی ہیں مسلم کی اس مشہور حدیث کے:۔ کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یہودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے اپنی اصل اور بے میل فطرت ہی پر پیدا ہوتا ہے، اب باہر کی ہوائیں اس کے اندر کی روشنی کو تہ و بالا کرنے لگتی ہیں، اگر یہودیت کے اثرات اس پر غالب آ گئے تو یہودیت کا جھونکا اس کے چراغ فطرت کو گل کر دیگا، اگر نصرانیت یا مجوسیت کا طوفان اٹھا تو اسی میں اس کی کشتی فطرت ڈگمگانے لگے گی۔

جب خدا نے ذریت انسان سے پوچھا: الست بربکم کیا میں ہی تمہارا پروردگار نہیں ہوں، تو اس نے تصدیق کی، اور بلٰی کہا، اب اگر تصدیق ربوبیت کی جگہ وہ انکار کرتا ہے، تو یہ اس کی فطرت کی صدا نہیں ہے، ایک غیر فطری صناعی ہے۔

اسی فطرۃ صالحہ کا نام قلب سلیم ہے اذ جاء ربہ بقلب سلیم جبکہ ابراہیم اللہ کے حضور میں فطرۃ صالحہ غیر آلودہ کے ساتھ حاضر ہوئے اس کی فطرت کو باہر کا کوئی بڑے سے بڑا جلوہ بھی مرعوب و ہیبت زدہ نہ کر سکا۔

شرائع الٰہیہ کا نزول اس لئے ہوتا ہے کہ انسان نے صناعی اور خارجی ضلالت کا جو زنگ فطرۃ صالحہ پر چڑھالیا ہے اسے دور کر دے، اور اس کی اصلی روشنی پھر چمک اٹھے، اسی لئے ہدایت الٰہی کو قرآن نے ذکر اور کفر و ضلالت کو نسیان کہا ہے، نسیان کی انتہا غفلت ہے، اس کو قرآن نے منتہائے ضلالت قرار دیا، لھم قلوب لا یفقھون بھا الآیتہ، کی یہی تفسیر ہے، الذین نسوا اللہ فانساھم انفسھم یعنی اپنی فطرت صالحہ کو بھول گئے، کیونکہ فطرۃ صالحہ تو وہ تھی جس نے بلے کہا تھا، یعنی خدا کی ربوبیت اور اس کے رشتہ کا اقرار کیا تھا، اب اگر وہ اس ہستی کے رشتہ کو بھلا رہے ہیں جس کے آگے اصلی فطرت بلی کہہ چکی ہے تو اس رشتہ کو نہیں بھلا رہے بلکہ اپنی فطرت اصلی کو بھلا رہے ہیں۔

پس جن لوگوں نے اپنی فطرت صالحہ کو مسخ کر دیا، اور اوس کی روشنی کو آندھی اور طوفان سے محفوظ نہ رکھا، اس پر ظلمت اور تاریکی چھا گئی، وہ انسانیت سے نکلکر حیوانوں کے دائرہ میں داخل ہو گیا، اب اس کے لئے نبی کا انذار و عدم انذار برابر ہے علم و معرفت حاصل کرنے کے تین ہی ذرائع تھے، دل، آنکھ، اور کان، مگر کفر کی زنگ آلودگی نے اس کے آئینہ کو بالکل سیاہ کر دیا، اور ایک دھندلی سی چمک بھی اس میں باقی نہیں رہی اب اس کو جس قدر بھی عذاب دیا جائے کم ہے کہ اس نے اپنی تصدیق کو بھلا دیا جو اس کے اندر ودیعت کی گئی تھی۔

منافقین

(۸) وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا ھُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ ۝	اور ایک لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں ہم یقین لائے اللہ پر، اور پچھلے دن پر اور ان کو یقین نہیں۔

بنی اسرائیل جن کو اس سورۃ میں مخاطب کیا گیا ہے کہہ سکتے ہیں کہ مدینہ میں ایسے لوگ ہیں، جو تمام اعمال مذہبی کے پابند ہیں، مگر ان کی اخلاقی حالت میں کسی قسم کی اصلاح نہیں پیدا ہوئی، اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ خود قرآن کی تعلیم ہی محل بحث و نظر ہے یہاں سے

اس اعتراض کا جواب دیا جاتا ہے، اور اس جماعت کے سرائر و حجوبات کو بے نقاب کیا جاتا ہے،

منافقت کے اقسام حسب ذیل ہیں:۔

(الف) بظاہر ایمان کا اظہار ہو، لیکن حقیقت میں وہ تمام ضروریات ملی کا منکر، اور تعلیم الٰہیہ کا اشد شدید دشمن ہو۔

(ب) ظاہر و باطن، دونوں اعتبار سے تذبذب اور اضطراب ہو۔

(ج) فسق و فجور کی کثرت اور عدوان و ضلالت کا اثر اس درجہ غالب آگیا ہو، کہ دنیا کو دین پر، انفراد کو اجتماع پر، اور کفر کو اسلام پر ترجیح دے۔

اگر ان مراتب سہ گانہ کو پیش نظر رکھا جائے، تو کتاب و سنت کے تمام مقامات حل ہو جائیں گے، اور کسی آیت اور حدیث میں اختلاف معلوم نہ ہوگا، حدیث میں منافق کی علامتیں مندرجہ ذیل بیان کی گئی ہیں:۔

(۱) ہر بات جھوٹ کہے۔

(۲) ہمیشہ بد عہدی کرے۔

(۳) خائن اور بے ایمان ہو۔

(۴) جھگڑے کے وقت گالیوں پر اُتر آئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے قبل مدینہ میں عبداللہ ابی بن سلول ایک بااثر شخص تھا، وہاں کے لوگوں نے اس کو بادشاہ بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا، چنانچہ تاج بھی تیار ہو چکا تھا، اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے، شہر کی تمام جماعتوں نے مل کر یہ طے کر لیا کہ آپ ہی انکے تمام مناقشات و منازعات کا فیصلہ کریں، عبداللہ کے لئے اب اس وقت اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ اپنی کمزوری کو محسوس کر کے خاموشی اختیار کرے، مخالفت کرنے کی طاقت نہ تھی، اس نے بھی اسلام کا اظہار کر دیا اور مسلمانوں کے ساتھ

مل گیا، لیکن دراصل اس کی یہی کوشش رہی کہ بن پڑے تو مسلمانوں کا نام ونشان دنیا سے مٹا دیا جائے، ظاہر ہے کہ اس قسم کے لوگوں کی وجہ سے تعلیم قرآن پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔

(۹) يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝	دغابازی کرتے ہیں اللہ سے اور ایمان والوں سے، اور کسی کو دغا نہیں دیتے مگر آپ کو، اور نہیں بوجھتے،

اسلام کے دو درجے ہیں:-

(الف) اعمال کے ساتھ، اخلاق کی تہذیب وشائستگی کا بھی خیال ہو، تو دنیا اور آخرت دونوں جگہ عزت ملیگی۔

(ب) ظاہری اعمال کی پابندی پر زور دیا جائے، اور اصلاح اخلاق سے آنکھیں بالکل بند کرلی جائیں ممکن ہے بعض اسباب کی بنا پر دنیا میں ان لوگوں کو عزت وکرامت نصیب ہو، لیکن مرنے کے بعد تو قطعاً محروم رہیں گے۔

ان منافقین کی حالت یہ ہے کہ محاسن اعمال وفضائل اخلاق کی طرف تو توجہ نہیں کرتے، اور اس پر اُمید رکھتے ہیں کہ مرنے کے بعد نجات کے مستحق ہونگے گویا اللہ کو دہوکا دینا چاہتے ہیں، کیونکہ نتائج اعمال تو وہی دیگا، دنیا میں اس امر کی انہیں آرزو ہے کہ مسلمان ان کا اکرام واحترام کریں، اور اس طرح مسلمانوں کو بھی خدع وفریب میں رکھنا چاہتے ہیں، مگر حقیقت میں وہ خود ہی دہوکا کھاتے ہوئے ہیں، اپنی فطرت صالحہ کو فراموش کرچکے ہیں اور یہی منتہائے ضلالت ہے کہ تنزل کو ترقی سمجھنے لگ جاتے ہیں۔

(۱۰) فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ	ان کے دل میں آزار ہے پھر زیادہ دیا اللہ نے انکو آزار، اور ان کو دکھ کی مار ہے اس پر کہ جھوٹ کہتے تھے،

آپ کو معلوم ہے کہ عبداللہ بن ابی کی رسم تاجپوشی ادا ہونے والی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے رُک گئی، اس نے مسلمانوں کا ساتھ دیا، مگر اس

نہایت تفصیل سے ان جزئیات کو بیان کیا ہے، ہم اختصار کی خاطر صرف چند اقتباسات پر اکتفا کرتے ہیں :-

(۱) چور چوری کرتا ہے، ایک کا گھر برباد ہوتا ہے، لیکن خود چور کا گھر آباد ہو جاتا ہے، اسلئے یہ فساد بھی ایک دوسری صورت میں اصلاح ہے، با این ہمہ اس کو ہر شخص افساد کہتا ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں پر جب مصر میں پیمانہ کی چوری کا الزام لگایا گیا تو انہوں نے کہا :-

تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سَارِقِيْنَ ۝ (۱۲:۷۳) | خدا کی قسم، تم لوگ جانتے ہو کہ ہم اس لئے یہاں نہیں آئے کہ زمین میں فساد کریں، اور ہم چور نہیں ہیں۔

(۲) ایک شخص اس سے بھی زیادہ ترقی کرتا ہے اور محدود چوری کی جگہ ڈاکے ڈالتا ہے، اس سے اگرچہ لٹنے والوں کی بستی بالکل لٹ جاتی ہے، مگر لوٹنے والوں کا گھر، مال و دولت کی کان بھی بن جاتا ہے، ایک شخص غیر فطری طریقوں سے لذت نفسانی حاصل کرتا ہے، اور اسکو اپنے نفس کی بھلائی اسی میں نظر آتی ہے، وہ اس کو فلسفہ عیش و اُمید کے لقب سے یاد کرتا ہے، لیکن ہمیں معلوم ہے کہ یہ کیسا مفسدانہ فلسفہ ہے جو حفظ صحت کو، نسل کو، مال و دولت کو اور انسان کے قوائے طبعی کو بکسر برباد کر دیتا ہے۔

اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ط (۲۹ : ۲۸) | تم فعل خلاف وضع فطری کرتے ہو، ڈاکہ ڈالتے ہو اور اپنی مجلسوں میں بداخلاقیوں کے کام کرتے ہو۔

انہی نتائج مہلکہ کے لحاظ سے ایک پیغمبر خدا نے بے اختیار ہو کر کہہ دیا :-

رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ (۲۹ : ۲۹) خدایا مجھکو مفسد لوگوں پر نصرت عطا کر۔

(۳) ایک حکومت، ایک قوم کی حریت و آزادی سلب کر لیتی ہے، اس سے غلاموں کی طرح کام لیتی ہے، اس کی قوت کو فنا کر دیتی ہے، اس کی اخلاقی طاقت کو برباد کر دیتی ہے، اس کا یہ عمل باطل یک قلم سرچشمہ فساد ہے، لیکن وہ کہتی ہے کہ میں اپنی قوم کی اصلاح کرتی

ہوں، اور اس کی اصلاح و عروج کے لئے دوسری قوم کو اپنا غلام بنائی ہوں، پس جو شخص اس حکومت کے برخلاف جہاد کرتا ہے، وہ اس کو مفسد قرار دیتی ہے، لیکن تم کو معلوم ہے کہ خدا اس کو کیا کہتا ہے:-

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ○ (۲۸: ۳)	فرعون نے مصر میں سرکشی کا بڑا ہی سر اٹھایا تھا، اس نے رعایا کو کمزور کرنے کے لئے گروہ در گروہ کر دیا، ان میں سے ایک گروہ کو کمزور کرنا چاہتا تھا، وہ ان کے بچوں کو ذبح کرتا، ان کی عورتوں کو بے

عصمتی کے لئے چھوڑ دیتا، بلاشبہ وہ فساد کرنے والوں میں سے تھا۔

انکے علاوہ اور بے شمار جزئیات ہیں، قرآن حکیم نے مفسدین کی کوئی خاص دنیوی علامت نہیں بتائی جو ان کے اعمال کی عکسی تصویر ہو، بلکہ وہ صرف اپنے اعمال ہی سے شناخت کئے جا سکتے ہیں، فساد، دراصل عدم محض و تیرگی خالص کا نام ہے، اور تاریکی میں صرف تاریکی ہی نظر آتی ہے۔

اب اصلاح کی بعض امثلہ و نظائر ملاحظہ ہوں:

(۱) ارباب اصلاح جو کام کرتے ہیں، صرف اپنے نور ایمان کی ہدایت سے کرتے ہیں، اُن کو ترغیبات کی ضرورت نہیں ہوتی:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ ۖ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ○ (۱۰: ۹)	جو لوگ اللہ پر ایمان لائے، اور صالح اعمال اختیار کئے، تو اللہ اُن کے ایمان کی روشنی کو ان کے لئے شمع ہدایت بنا دیتا ہے اُن کے لئے نعمتوں کی جنت ہے اور اس کی

نہروں کی روانی کا .... نظارہ۔

(۲) مصلحین میں ہمیشہ باہم محبت و یگانگی ہوتی ہے، باہمی پھوٹ اور نفاق صاحب اصلاح گروہ میں نہیں ہو سکتا:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ۝ (۱۹: ۹۶)	جو لوگ ایمان لائے، اور عمل صالح کیا، سو قریب ہے کہ خدائے رحمٰن ان کے لئے محبت کا دروازہ کھول دیگا۔

(۳) عمل صالح انسان کے دل کو سنوارتا ہے، اس لئے پچھلے گناہوں کا جو داغ دل میں ہوتا ہے، اُس کو بھی مٹا دیتا ہے:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ۝ (۴۷: ۲)	اور جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کیا، اور قرآن حکیم پر یقین کیا، جو ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے لئے پیام حق ہے، سو وہ یقین کریں کہ ان کے تمام گناہ جھڑ گئے، اور ان کے دل کو سنوار دیا گیا۔

ان مثالوں سے واضح ہو گیا کہ اعمال صالحہ کی حالت، اعمال مفسدہ سے بالکل مختلف ہے، وہ زندگی اور طاقت و صحت ہیں، اس لئے زندگی ہی کے نتائج کا ان سے ظہور ہوتا ہے، وہ روشنی ہیں، اس لئے روشنی ہی کے تمام آثار و علائم اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔

(ب) صلاح و افساد یا خیر و شر، دنیا میں مخلوط اور بالکل ملے جلے ہیں، لیکن اصلاح افساد پر، خیر، شر، پر کماً و کیفاً غالب ہے، یعنی بلحاظ حقیقت کے بھی، بلحاظ وجود کے بھی، اور بلحاظ نتائج کے بھی۔

مفسدین و مصلحین کی صفیں تمہارے سامنے ہیں، تم نے صلاح کو افساد سے، نور کو ظلمت سے، پھول کو کانٹوں سے الگ کر کے دیکھ لیا، لیکن یہ بالکل ظاہر ہے کہ کاغذ کے صفحات پر تو ان کو الگ کیا جا سکتا ہے، سطح زمین پر ان کی بزم آرائی نہیں ہو سکتی، فرشتوں نے خلقت آدم پر اعتراض کیا، اور بظاہر آدم نے جنت ہی میں ان کے اعتراض کی تصدیق بھی کر دی، لیکن تم کو صرف آدم کے عمل ہی کو نہیں دیکھنا چاہئے، بلکہ اس کے دقیق نتائج پر بھی نظر ڈالنا ضروری ہے، آدم نے غلطی کی اور خود اپنا بنا بنایا گھر اجاڑا، لیکن تم نے دیکھا کہ اس افساد نے کیا اصلاح کی، اس تخریب نے کیا تعمیر کی، بغور دیکھو! اس تخریب نے ایک عالم کھڑا کر دیا،

جس میں آدم کی اولاد پھلتی پھولتی نظر آتی ہے، اس لئے آدم کا یہ گناہ، فرشتوں کے اعتراض کی تصدیق نہیں کرتا، بلکہ یہ اس کا عملی جواب ہے، انہوں نے کہا تھا کہ فساد سے دنیا برباد ہوجائیگی، خدا نے ان کو دکھا دیا کہ اصلاح وافساد لازم ملزوم ہیں، اس لئے اگر ایک گھر برباد ہوگا تو دوسرا آباد بھی ہوجائیگا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ مادہ عالم کی ترکیب میں دونوں اجزا برابر کی نسبت رکھتے ہیں، یا ان میں کوئی جز غالب بھی ہے، خدا کا فیض عام جواب دیتا ہے کہ:

سبقت رحمتی علی غضبی	میری رحمت، میرے غصہ پر سبقت لے گئی ہے۔

اس لئے خیر شر پر، اصلاح افساد پر غالب ہے، خدا نے فرشتوں کو یہی جواب دیا ہے، فرشتوں کو حضرت آدم کے دامن پر صرف ایک فساد کا دھبہ نظر آیا تھا جس کو خون کے چھینٹوں نے اور رنگین و نمایاں کر دیا تھا، لیکن خدا نے کہا کہ ایک دھبہ ہزاروں نقش و نگار کے پردوں میں چھپ جا سکتا ہے۔

پس جس طرح مقدار و کمیت کے لحاظ سے خیر شر پر غالب ہے، اسی طرح کیفیت کے اعتبار سے بھی وہ شر و فساد سے زیادہ لطیف، نرم، رقیق، اور تربیت پذیر ہے، شر و فساد ایک کوئلہ ہے جو پھونکنے کے بعد بھڑکتا ہے، لیکن خیر و اصلاح کی [illegible] جو دفعۃً روشن ہوجاتی ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۝ (۹۱: ۹ و ۱۰)	وہ شخص کامیاب ہوا جس نے اس کا تزکیہ کیا، اور وہ ناکامیاب رہا جس نے اس کو دفن کر دیا۔

اصلاح اصل فطرت صالحہ ہے اور افساد خارجی ضلالت کا نتیجہ، پس ضرورت صرف تزکیہ و تربیت کی ہے تاکہ زنگ دور ہوجائے اور آئینہ چمک اٹھے، اس تربیت و تزکیہ کے بعد اس کا قوام اس قدر لطیف ہوجاتا ہے کہ:۔

يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ط	قریب ہے کہ اس کا تیل روشن ہوجائے، اگرچہ اس میں

نُورٌ عَلٰی نُورٍ یَهْدِی اللّٰهُ لِنُورِهٖ مَنْ یَّشَآءُ (۲۴ : ۳۵)	آگ نہ لگائی جائے، روشنی پر روشنی ہے، خدا اپنی روشنی کی طرف جس کو چاہتا ہے راہ دکھاتا ہے،

(ج) ان دونوں کے درمیان ایک حدفاصل ہے، جو ایک کو دوسرے سے ممتاز کردیتی ہے۔

جس وقت اللہ تعالی نے خیر وشر کو پیدا کیا، اسی وقت سے حد بھی قائم کردی، آدم کو یہ حد بتائی گئی تھی:

وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِینَ ۝ (۲ : ۳۳)	اور اس درخت کے قریب نہ پھٹکنا، تاکہ زیادتی و انحراف کرنے والوں میں سے نہ ہوجاؤ۔

لیکن چونکہ یہ حد محسوس نہ تھی اس لئے شریعت نے اسکے امتیاز کا ذریعہ صرف ذوق صحیح کو قرار دیا، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

الاثم ما حاك فی نفسك	گناہ وہ ہے جو دل میں کھٹکے۔

اور یہ ذوقی شہادت فطرتی چیز ہے، آدمی جب گناہ کرتا ہے، تو اس کا دل دھڑکنے لگتا ہے، چہرہ متغیر ہوجاتا ہے، اسی کا نام نور ایمان ہے، اور یہی خیر وشر کی حد فاصل قائم کرسکتا ہے۔

(د) اصلاح وافساد کا توازن طبعی، صرف دین الہی کے ذریعہ سے قائم رہ سکتا ہے۔

دنیا میں ہزاروں سیارات گردش کررہے ہیں، ہر ایک چاہتا ہے کہ دوسرے کی حد میں قدم رکھے، لیکن فطرت ان کو مضبوط رسی میں جکڑ دیتی ہے، قدرت الہی ان کو کشش باہمی سے ایک دوسرے کی طرف بڑھنے نہیں دیتی اس لئے سب اپنے اپنے طور پر ایک نہایت منتظم، نہایت باقاعدہ اور نہایت مرتب گردش کررہے ہیں۔

انسان کا، اس کے اعمال کا، اور اس کے اخلاق وعادات کا بھی یہی حال ہے، وہ ایک دوسرے سے ٹکرانا چاہتے ہیں، اس لئے وحی الہی، مذہب کی سنہری زنجیر سے

ان کی مطلق العنانیوں کو جکڑ دیتی ہے:-

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا (۳: ۹۸)	سب کے سب خدا کی رسی کو مضبوط پکڑ لو کہ ایک دوسرے پر تعدی نہ کرنے پائے اور دنیا کی میزان عدل کا پلہ برابر رہے۔
لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ أَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (۵۷: ۲۵)	ہم نے اپنے رسولوں کو دلائل حقہ و براہین واضحہ کے ساتھ بھیجا، اور اُن کے ساتھ کتاب اور میزان کو اُتارا تاکہ عدل و توازن قائم رہے۔

(۵) لیکن اس توازن کے قائم رکھنے کے لئے جزئیات عمل میں مصالح عامہ کا لحاظ ضروری ہے۔

انسان کے جذبات، فطرت کے دوسرے قوائے طبیعیہ سے زیادہ ذکی الحس، زود انگیز اور سریع الاشتعال ہیں اس لئے وہ باوجود اس جذب و کشش کے باہم ٹکرانا چاہتے ہیں پس:

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ (۲۳: ۷۱)	اگر حق بھی ان کا اتباع کرتا، تو زمین و آسمان اور ان کے رہنے والے برباد ہو جاتے۔

دنیا کو اس تباہی سے بچانے کے لئے اس کو بجبر و اکراہ ایک مرکز پر لانے کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہی فطری ضرورت جہاد، قصاص، اور تعزیر و عقوبت کی سنگ بنیاد ہے:

وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (۵۷: ۲۵)	اور ہم نے لوہا اُتارا کہ اس میں سلطان و نفوذ کی بڑی خوفناکی ہے، اور لوگوں کے لئے فوائد بھی ہیں۔

قرآن حکیم نے جابجا اسی توازن طبعی کے ذریعہ قیام امن و سلام عام کی طرف اشارہ کیا ہے:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ	اور اگر خدا بعض آدمیوں کے ظلم و زیادتی کو بعض کے

بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۲: ۲۵۲)	ذریعہ دفع نہ کرتا، تو زمین تباہ ہوجاتی لیکن خدا تو دنیا پر احسان کرنے والا ہے۔

اس منطقیانہ ترتیب سے جو اوپر گذر چکی ہے، دو باتیں خود بخود بطور نتیجہ کے ثابت ہوتی ہیں، اور ان پر کسی مزید دلیل و برہان کی ضرورت نہیں رہتی:۔

(۱) اعمال صالحہ کی ایک محدود زندگی ہے، اور وہ جسمانیات کی طرح صحت و مرض، یعنی اصلاح و افساد سے گھری ہے۔

(۲) جمہوریت صالحہ اور اجتماعی قوت عادلہ اس کو امراض سے محفوظ رکھتی ہے، اور اصلاح کو ترقی دیتی ہے۔

چونکہ قرآن حکیم کی تفسیر میں اصلاح و افساد، ایک اہم و اقدم باب تھا، اس لئے ہم نے تفصیل سے کام لیا کہ تمام مراتب کا کشف و ظہور ہوجائے، اب آپ اس آیت کو پھر ایک مرتبہ دیکھ لیجئے جو اس مبحث کے آغاز میں تحریر ہوئی ہے۔ ان منافقین کی کوشش یہ ہے کہ حق دب کر رہے، اور کفر کو غلبہ و اقتدار نصیب ہو، اس لئے وہ مفسد ہیں۔

جرم کا اقرار

(۱۳) وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝	اور جب کہئے ان کو ایمان میں آؤ، جس طرح ایمان میں آئے سب لوگ، کہیں کیا ہم اس طرح مسلمان ہوں جیسے مسلمان ہوئے بیوقوف، سنتا ہے وہی ہیں بیوقوف پر نہیں جانتے۔

سفاہت کہتے ہیں، کوتاہ عقلی، اور ناعاقبت اندیشی کو، منافقین اپنے آپ کو ارباب فہم و فراست خیال کرتے ہیں، اور مسلمانوں کو بیوقوف کہتے ہیں، کیونکہ انہوں نے اسلام کی خاطر، اپنے وطن و دیار کو، عزیز و اقارب کو، اور مال و جائداد کو قربان کردیا، حقیقت میں بیوقوف وہ شخص ہے جو علم کی پرواہ نہیں کرتا، اخلاق کی جانب سے اپنی آنکھیں بند کرلیتا

ہے اور فضائل و محاسن کے کسب وحصول کی ضرورت محسوس نہیں کرتا، اور یقیناً ہر سلیم الفطرۃ انسان اس کی تصدیق کریگا۔

(۱۴) وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ (۱۵) اَللّٰهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَیَمُدُّهُمْ فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ

اور جب ملتے ہیں ان لوگوں سے جو ایمان لائے، کہتے ہیں ایمان لائے ہم، اور جب اکیلے ہوتے ہیں طرف سرداروں اپنے کے کہتے ہیں تحقیق ہم ساتھ تمہارے ہیں، سوائے اسکے نہیں کہ ہم ٹھٹھا کرتے ہیں، اللہ ٹھٹھا کرتا ہے ان سے اور کھینچتا ہے ان کو بیچ سرکشی ان کی کے، بہکتے ہیں،

یہ لوگ خود اپنی زبان سے اس امر کا اقرار کر رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس میں صرف استہزا و تمسخر کی غرض سے جاتے ہیں، ورنہ در اصل ان کو تلاش وجستجوئے حق نہیں ہوتی، لیکن حقیقت میں وہ اپنے ہی ساتھ ہنسی کرتے ہیں، اور اپنے نفسوں کی صلاحیت کو فراموش کر دیتے ہیں، وہ دونوں جگہہ عزت کے آرزومند ہیں، مگر جلد ہی ان کی حقیقت مستورہ بے نقاب ہو جاتی ہے، اور پھر چاروں طرف سے ذلت ورسوائی نصیب ہوتی ہے۔

شیاطین سے مراد ان کے سردار اور رؤسائے کفر وضلالت ہیں۔

یہاں تک منافقین کی چند اصولی غلط کاریاں صاف کر دی گئیں:۔

(۱) ان کے ظاہر وباطن میں اختلاف شدید ہوتا ہے۔

(۲) خدع وفریب ان کی عادت ہے۔

(۳) جاہ طلبی ان کی غایت الغایات ہے۔

(۴) مسلمانوں کی نسبت انہیں پورا یقین ہے کہ قرآن کے پابند رہ کر کبھی ترقی نہیں کرسکتے۔

(۵) فرزندان اسلام کو غیروں کا غلام بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

(۶) فساد پھیلانے کی فکر میں رہتے ہیں۔

(۷) مسلمانوں کو ناعاقبت اندیش اور کوتاہ بین خیال کرتے ہیں۔

(۸) جانی و مالی قربانی سے گریز کرتے ہیں۔

(۹) تعلیم الٰہی کے ساتھ تمسخر و استہزا کرتے ہیں۔

امثال قرآنی

(۱۶) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۪ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝	یہی لوگ ہیں، جنہوں نے مول لی گمراہی بدلے ہدایت کے، پس نہ فائدہ پایا سوداگری اُن کی نے، اور نہ ہوئے راہ پانے والے۔

قرآن حکیم کا درس فکر ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بسا اوقات اپنے اعلیٰ ترین مطالب و مقاصد کے اظہار کے لئے امثلہ و نظائر پیش کرتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کا بہت بڑا حصہ انہی تمثیلات پر مشتمل ہے، کہیں ہواؤں کی تصریف ہے، بادلوں کا انبساط ہے، زمین کی نشو و نما ہے، لیل و نہار کا اختلاف ہے، موجودات و مخلوقات کے مختلف اشکال و الوان ہیں، کواکب و سیارات، اور نجوم و ثوابت کے طلوع و غروب ہیں، انقلابات طبیعیہ کے مناظر جمیلہ ہیں، رعد و برق کے دہشت انگیز اور خوف دلانے والے نظارے ہیں، بیع و شرا، اور خرید و فروخت کی منازعات و مناقشات ہیں، اور ان میں وہ تمام اسرار و معارف بیان کئے گئے ہیں جو فہم انسانی کا منتہائے ادراک ہیں۔ ولقد ضربنا للناس فی هذا القرآن من کل مثل لعلهم یتذکرون (۲۹:۲۸)

ان امثال و نظائر کے بیان کرنے سے قرآن حکیم کا مقصد یہ ہے کہ انسانوں کی قلبی و روحی حیات و ممات، اقوام و ملل کے انقلابات، ملکوں اور حکومتوں کے تسلّط و تنزع، اور ہدایت الٰہی اور تفاوت انسانی کے مختلف مدارج و مراتب سامنے آجائیں: وما یعقلها الا العالمون۔

منجملہ ان امثال قرآنیہ کے بیع و شرا کی ایک لطیف و بدیع، اور جامع و مانع تمثیل ہے جس پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ ایک شخص بازار جاتا ہے کہ کچھ خرید کرے، اس کی انتہائی سعی و کوشش یہی ہوگی کہ بہتر سے بہتر چیز خریدے، کبھی اس کو اپنا نقصان گوارہ نہ ہوگا، مگر

ان لوگوں کی حماقت و نادانی ملاحظہ ہو کہ ہدایت دے کر گمراہی اور ضلالت خرید رہے ہیں، پس یہ تجارت کہاں نفع بخش ثابت ہو سکتی ہے، اور یہ لوگ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

دو قسم کے لوگ

منافقین کے مختلف اقسام ہیں، کچھ تو اس درجہ اسلام کے دشمن ہیں کہ ان سے کبھی نیکی کی توقع ہی نہیں ہو سکتی، بلکہ وہ ہمیشہ اسلام کی تباہی و بربادی کی تجاویز سوچتے رہتے ہیں، لیکن بہت سے لوگ اپنی طبعی کمزوری سے مجبور ہیں، ہر اثر کو قبول کر لیتے ہیں، ہر صحبت و ہمنشینی ان پر غالب آجاتی ہے، اور ہر زبردست شخصیت اُن کو اپنے قابو میں لا سکتی ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ قرآن، جس طرح پہلی جماعت کی پروا نہیں کرتا، دوسری طرف سے آنکھیں بند کر لے، اور اُن کی ہدایت و راہ نمائی کی کوئی سبیل تجویز نہ کرے۔

اگلی آیتوں میں دو قسم کی مثالیں بیان کی گئی ہیں، عام مفسرین کا خیال ہے کہ ان مثالوں سے ایک ہی طرح کے لوگ مراد ہیں، حالانکہ حقیقت بالکل اُن کے برخلاف ہے، دو الگ الگ گروہ ہیں، اور دونوں کے خصائص و امتیازات کو واضح کیا جا رہا ہے، ایک کی شقاوت قلبی، اور جحود و کفر کو روشن کیا ہے، تو دوسرے کی کمزوری و ناتوانی کو بھی ذکر کر دیا ہے، تاکہ اگر پہلی جماعت سے اعتنا نہ کیا جائے، تو دوسرے گروہ کو وقف فراموشی نہ کر دیا جائے، ممکن ہے دوسرا طائفہ، ترہیب و ترغیب کے ذریعہ دائرہ اسلام میں داخل ہو کر اپنی اصلاح کر لے۔

اس قدر تمہید کے بعد اب آپ آیات مندرجہ ذیل میں غور و فکر کیجئے:-

(۱۷) مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ ○ (۱۸) صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ○	مثال ان کی جیسے مثال اُس شخص کی ہے جو جلائے آگ، پس جب روشن کیا، جو کچھ گرد اُسکے تھا لے گیا اللہ روشنی اُنکی، اور چھوڑ دیا اُنکو بیچ اندھیروں کے نہیں دیکھتے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، پس وہ نہیں پھر آتے

ان دونوں آیتوں میں منافقین کی اس جماعت کو بیان کیا گیا ہے، جو ایمان لے آئی، سے اسلام کی حقیت و حقانیت کا یقین ہو گیا، لیکن جس وقت آگے چلکر اس کے مصالح خصوصی و ذاتی اغراض کا مفاد اسلام و منافع اجتماعیہ کے ساتھ تصادم ہوا تو فوراً ایمان و اسلام سے ہاتھ دھو بیٹھے اور یوں اپنی تمام قوتوں کو برباد کر دیا، پس اُن کی آنکھوں، اُنکے کانوں، اور اُن کی زبانوں کا بیکار ہو جانا، نتیجہ ہے اُن کی بداعمالی کا اور اُن کے راہ حق کو ترک کر دینے کا، جس کو وہ صحیح یقین کر چکے تھے۔

(١٩) أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ج يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِم مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ط وَاللّٰهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ (٢٠) يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ ط كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُم مَّشَوْا فِيهِ ق وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا ط وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ط إِنَّ اللّٰهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ع

یا جیسے مینہ برستا ہو آسمان سے، اس میں ہیں اندھیرے، اور گرج، اور بجلی ڈالتے ہیں انگلیاں اپنے کانوں میں مارے کڑک کے، ڈر سے موت کے، اور اللہ گھیر رہا ہے منکروں کو، قریب ہے بجلی کہ اُچک لے اُن کی آنکھیں، جس بار چمکتی ہے اُن پر چلتے ہیں اس میں، اور جب اندھیرا پڑا، کھڑے رہے، اور اگر چاہے اللہ لیجاوے اُنکے کان، اور آنکھیں، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

یہ دوسری قسم کے لوگ ہیں، جو اپنی کمزوری طبیعت کی وجہ سے ان مصیبتوں کا نشانہ بن رہے ہیں، ان لوگوں کی مثال ٹھیک اس شخص کی سی ہے جو شب کے وقت کہیں جا رہا ہو، رعد و برق کے خوف سے اپنی جان بچانے کی فکر میں ہو، اسلام تو قبول کر لیا مگر اب یہاں مشکلات کا سامنا ہے، عزیز و قریب، وطن و دیار، مال و جائداد سے علیحدگی ہے، جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے لئے سر بکف پھرنا ہے، منہیات شرعیہ سے اجتناب ہے، یہ قربانیاں ان کو تکلیفوں میں مبتلا کئے ہوئے ہیں، یہ چونکہ طبیعت کے کمزور ہیں اس لئے ان کو دھمکی دی گئی کہ اگر اب بھی اپنے کانوں اور آنکھوں سے کام نہ لینگے تو اُن پر عالم ممات طاری کر دیا جائیگا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس مثال سے منافقین کی حقیقت اصلیہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے، انکی عام طور پر یہی کیفیت ہوتی ہے مذبذبین بین ذلک لا الی ھولاء ولا الی ھولاء کی پوری تصویر بنے ہوئے ہوتے ہیں، انکی طبیعت کا رجحان یہ ہوتا ہے کہ دونوں جماعتوں سے تعلقات قایم رہیں، اگر اسلام کے ساتھ دوستی ہے تو کفر سے بھی رشتہ اخوت نہ ٹوٹنے پائے، حق کی تائید ہے تو باطل بھی قائم ودائم رہے، نور سے استفادہ ہو رہا ہے تو ظلمت وتاریکی بھی کوئی بری چیز نہیں، پھر کیوں اس سے مفت میں بیر مول لیا جائے۔

منافقین کا پہلا گروہ تو از فرق تا بقدم، اسلام کا اشد شدید دشمن ہے، اس سے کسی خیر وصلاحیت کی توقع ہی رکھنی فضول ہے، البتہ دوسری قسم کے لوگ ایسے ہیں کہ انکی رکاوٹوں کو دور کیا جائے رشد وہدایت ان کے سامنے ہو۔ ممکن ہے ترغیب وترہیب سے وہ اپنے اندر عبرت وموعظت پیدا کریں، اور دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں، اس لئے اگلی آیات میں اُن کی جانب توجہ کی جاتی ہے، اور تذکیر بالاء اللہ کے ذریعہ ان کے لئے تنبہ واعتبار کی راہیں کھولی جاتی ہیں:-

دعوۃ الی التوحید

گزشتہ آیات میں تین قسم کے لوگوں کا تذکرہ کیا گیا تھا، آخر میں منافقین کے متعلق بحث تھی کہ یہ دو قسم کے ہیں کچھ تو اس درجہ اشد شدید دشمن اسلام ہیں کہ ان سے کسی قسم کی توقع رکھنا ہی بے سود اور لاحاصل ہے، البتہ دوسری جماعت بھی ہے جو اپنی طبعی کمزوری کی بنا پر منفعل اور اثر پذیر واقع ہوئی ہے، ہر صحبت اور سوسائٹی اسے اپنے اندر جذب کریگی، اسی آخری گروہ کی نسبت کہا گیا تھا کہ اگر اس نے اپنے ظاہری وباطنی حواس سے کام نہ لیا تو آخر کار کچھ مدت کے بعد ان پر تعطل وبیکاری چھا جائیگی، اور پھر ان سے کام نہ لیا جا سکیگا، اگلی آیتوں میں اسی جماعت کو توحید کی جانب دعوت دی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ اپنی نعمتیں یاد دلاتا ہے کہ شاید ان سے تذکیر وموعظت پیدا ہو اور وہ اپنی اصلاح وتہذیب کی طرف توجہ کرے۔

(۲۱) يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۲۲) الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ج فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ٥

اے لوگو! بندگی کرو اپنے رب کی، جس نے بنایا تم کو، اور تم سے اگلوں کو، شاید تم پرہیزگاری پکڑو، جس نے بنا دیا تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان عمارت، اور اُتارا آسمان سے پانی، پھر نکالا اس سے میوہ کھانا تمہارا سو نہ ٹھیراؤ اللہ کے برابر کوئی اور تم جانتے ہو۔

قرآن حکیم کا درس وفکر ہمیں بتاتا ہے کہ مخالفین و معاندین کو راہ حق پر لانے کے لیے تین قسم کی تذکیر و موعظت سے کام لیا جاتا ہے:۔

(الف) تذکیر بالاء اللہ، اپنی نعمتیں یاد دلا کر عبرت و بصیرت پیدا کرنا، مثلاً فاذکروا الاء اللہ لعلکم تفلحون، (۷: ۶۷)

(ب) تذکیر بایام اللہ، گزشتہ اقوام و امم کے عروج و تسفل کی تاریخ، اور اس سے استنباط نتائج وغیرہ مثلاً وذکرھم بایام اللہ، ان فی ذلک لایت لکل صبار شکور، (۱۴: ۵)

(ج) تذکیر بما بعد الموت، مرنے کے بعد اعمال انسانی کے نتائج بیان کر کے نیکی کا شوق دلانا، مثلاً افلا یعلم اذا بعثر ما فی القبور ۝ وحصل ما فی الصدور (۱۰۰: ۹ و ۱۰)

ان آیات میں تذکیر بالاء اللہ سے کام لیا گیا ہے، تمام انبیاء و رسل کی تعلیمات صالحہ کی اصل و اساس توحید باری ہے، وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین ۝ حنفاء (۹۸: ۴) زندگی کے جس قدر مراتب مختلفہ ہیں، سب خدائے واحد کے قبضہ میں ہیں، موت و حیات کا وہی مالک ہے، وہی بادلوں سے پانی برساتا ہے، اور وہی حیات انسانی کے بقا و قیام کے تمام ضروری سامان پیدا کرتا ہے، پھر یہ کس قدر کوتاہ بینی اور جہل و ضلالت ہے کہ غلامی کرتے وقت ہم کسی اور کو بھی اس کا شریک بنالیں، خواہ وہ اصنام و طواغیت ہوں، رسوم و عوائد ہوں، نسلی روایات و عقائد مالوفہ ہوں، اور خواہ وہ سلاطین جابرہ ہوں،

غرضکہ ہر وہ چیز جس کو ارباباً من دون اللہ کا درجہ عملاً یا اعتقاداً دیا جائے، سب اس میں داخل ہیں۔

سورۂ یوسف میں اسی طرف اشارہ کیا: ءارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القہار o ما تعبدون من دونہ الا اسماء سمیتموہا انتم و اباءکم ما انزل اللہ بہا من سلطان ط ان الحکم الا للہ ط امر الا تعبدوا الا ایاہ ط (۱۲: ۳۹ و ۴۰)

حضرت لقمان نے اپنے صاحبزادہ کو ان الفاظ میں نصیحت کی: یٰبنی لا تشرک باللہ ط ان الشرک لظلم عظیم (۳۱: ۱۲)

(۲۳) وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ص وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲۴) فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ج اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ (۲۵) وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ط كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ط وَلَهُمْ فِيْهَا اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ o

اور اگر تم ہو شک میں اس کلام کی جو اُتارا ہم نے اپنے بندے پر، تو لے آؤ ایک سورۃ اس قسم کی، اور بلاؤ اپنے مددگاروں کو اللہ کے سوا، اگر تم سچے ہو، پھر اگر نہ کرو، اور البتہ نہ کرو گے، پس بچو آگ سے، جس کا ایندھن ہیں آدمی اور پتھر تیار ہی منکروں کے واسطے، اور خوشخبری دے انکو جو ایمان لائے اور نیک کام کئے، اُن کے لئے ہیں باغ بہشتی، ان کے نیچے ندیاں ہیں، جس بار ملے انکو وہاں کوئی میوہ کھانے کو، کہیں یہ وہی ہے جو ملا تھا ہمکو آگے، اور اُنکے پاس وہ آویگا ایک طرح کا، اور انکے لئے ہیں وہاں عورتیں پاکیزہ، اور انہیں ہاں ہمیشہ رہنا ہے۔

قرآن حکیم نے مخالفین اسلام سے بار بار اس امر کا مطالبہ کیا ہے کہ ان میں اگر اس کتاب عزیز کے مقابلہ کی طاقت ہے تو اپنے تمام اعوان و انصار اور اولیاء الشیطان کی مدد سے اسکے مثل لکھنے کی کوشش کریں۔ ایک جگہہ فرمایا ہے:۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ○
(۱۷ : ۹۰)

کہو کہ اگر آدمی اور جنات جمع ہو کر اس بات پر آمادہ ہوں کہ اس قرآن کی طرح کا اور کلام بنا لائیں تاہم اس جیسا نہیں بنا لا سکتے، اگرچہ ان میں سے ایک کی پشتی پر ایک کیوں نہ ہو۔

ایک موقع پر یوں ارشاد ہوا۔

قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مثلہ مفتریت وادعوا من استطعتم من دون اللہ ان کنتم صدقین
(۱۱ : ۱۶)

کہدو کہ اگر تم اپنے دعوی میں سچے ہو تو تم بھی اسی طرح کی بنائی ہوئی زیادہ نہیں تو دس ہی سورتیں لے آؤ، اور خدا کے سوا جس کو مدد کے لئے تم سے بلاتے بن پڑے بلا لو۔

پھر ان الفاظ میں مطالبہ کیا :۔

ام یقولون افترٰہ ، قل فاتوا بسورۃ مثلہ وادعوا من استطعتم من دون اللہ ان کنتم صدقین،
(۱۰ : ۳۹)

کیا یہ لوگ قرآن کی نسبت کہتے ہیں کہ اس کو خود پیغمبر نے بنا لیا ہے، تو ان سے کہدو کہ اگر تم اپنے دعوی میں سچّے ہو تو تم بھی ایسی ہی ایک سورۃ بنا لاؤ اور خدا کے سوا جس کو تم سے بلاتے بن پڑے بلا لو۔

چنانچہ آیت زیر بحث میں بھی یہی مطالبہ کیا گیا کہ ایک سورۃ بنا کر لے آؤ، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ جواب کس اعتبار سے مانگا جا رہا ہے عام مفسرین کی رائے ہے کہ فصاحت و بلاغت میں مقابلہ کی دعوت دی گئی ہے، اس میں شک نہیں کہ مسلمان تو ایک طرف، خود معاندین اسلام بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں، اور تسلیم کرتے ہیں کہ ایسی فصیح و بلیغ عبارت پیش کرنا غیر ممکن اور انسانی طاقت سے باہر ہے، جب خود اہل زبان اس کی مثل لانے سے عاجز ہوں تو دوسروں کی حقیقت ہی کیا ہے۔

قرآن حکیم نے اپنی نسبت کہا کہ وہ ھدی للناس ہے، نور ہے، بصائر ہے، اس کا

روئے سخن عالمگیر ہے، وہ تمام اقوام و امم عالم میں وحدت و جمعیت پیدا کرنے آیا ہے، اس کا مقصد اصلی ایک امتہ صالحہ اور مدنیۃ فاضلہ کا بقا و قیام ہے، وہ تہذیب اخلاق، تدبیر منزل، سیاست مدنیۃ اور خلافت کبریٰ کی تعلیم دینے آیا ہے، یہ اسی کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ اس نے عرب کو ایک زندہ قوم بنا دیا، جس نے زناکاری، شراب خواری، قماربازی، اور صدہا جرائم کو آن واحد میں سرزمین عرب سے حرف غلط کی طرح محو و باطل کر دیا، جس نے عرب کے جنگلوں اور وحشیوں کو خدا کا مقدس دست عمل بنا دیا جو قیصر و کسریٰ کے خزائن کے مالک بنا دیے گئے، اور یہ سب سے زیادہ حیرت انگیز اور محیر العقول انقلاب عظیم صرف تئیس ۲۳ سال کے قلیل ترین زمانہ میں ہوا، کیا دنیا کی تاریخ ہمیں کوئی ایسی نظیر بتا سکتی ہے کہ کسی بڑے سے بڑے ریفارمر اور مصلح کو ایسی عظیم الشان کامیابی نصیب ہوئی ہو۔

یہ حقائق ثابتہ ہیں جو تاریخ کے اوراق میں اب تک اپنی تابناکی و درخشندگی سے دیکھنے والوں کی آنکھوں کو خیرہ کر رہے ہیں، یہ واقعات ہیں جن کو انسان اگر بھول جائیں تو ممکن ہے مگر نہ تو آسمان پر چمکنے والے ستارے فراموش کر سکتے ہیں، اور نہ زمین کے رینگنے والے جانور اور سمندروں اور دریاؤں کے تیرنے والی مچھلیاں ان کو بھلا سکتی ہیں۔

جو کچھ اوپر مذکور ہوا، یہ قرآن حکیم کا اثر تھا، پس اگر مخالفین اسلام میں ہمت ہی تو وہ کوشش کر کے دیکھیں، اپنے تمام اعوان و انصار اور اولیاء الشیطان کی مدد سے ایسا قانون مرتب کر کے لائیں، اور اگر تمام دنیا اس کی نظیر لانے سے عاجز ہے تو پھر قرین عقل و انصاف یہی ہی کہ اسی کتاب عزیز کے آگے سر نیاز جھکا دیں، اور اپنی گردنیں خم کر کے بغیر کسی قسم کے بحث و مذاکرہ کے اس کو اپنا امام و پیشوا تسلیم کر لیں، ورنہ انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ بداخلاقی و بدکرداری کے عواقب الیمہ سے انھیں کوئی نجات نہ دلا سکیگا۔

البتہ جو لوگ اس قانون کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنا لینگے وہ جنت میں داخل ہونگے، سب سے پہلے اُن کے اعمال صالحہ کی جزا اسی دنیا میں انھیں ملیگی، بہشت زار ارضی کے

مالک بنا دیے جائینگے اور خلافت ونیابت الٰہی کے مستحق قرار پائینگے، یہ خیال بالکل غلط اور بے بنیاد ہے کہ نیک کاموں کا بدلہ دنیا میں نہیں ملتا، بلکہ اس کی اولین قسط اسی جگہ سے شروع ہوتی ہے لا تھنوا و لا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین (۳ : ۱۳۳) میں اسی طرف اشارہ ہے، پھر حقیقی ثمرات ونتائج مرنے کے بعد ظہور پذیر ہونگے جن کی نسبت قرآن نے کہا :-

فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین ج جزاء بما کانوا یعملون، (۳۲ : ۱۷)	کوئی شخص بھی نہیں جانتا کہ لوگوں کے نیک عملوں کے بدلے میں کیسی کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک اُن کے لئے پردۂ غیب میں موجود ہے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں ارشاد فرمایا :-

مالا عین رات، ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر،	نہ تو آنکھوں نے دیکھا، نہ کانوں نے سنا، اور نہ کسی انسانی دل ودماغ میں ان کا خیال گذرا۔

اس آیت میں بھی جنت کی چند خصوصیات بیان کی گئی ہیں، ان میں نہریں بہتی ہونگی، جن کی وجہ سے ان میں شادابی اور تروتازگی ہمیشہ رہیگی، کھانے کو مختلف قسم کے پھل ملینگے، جو اگرچہ ظاہری شکل وصورت میں ایک دوسرے کے مشابہ ہوں مگر کھاتے وقت معلوم ہوگا کہ ہر ایک کا مزا اور ذائقہ جداگانہ ہے، پھر پاکیزہ اور طاہر بیبیاں ہونگی، اور سب سے آخر میں یہ کہ اس زندگی میں دوام اور خلود ہوگا وفی ذلك فلیتنافس المتنافسون،

نکتہ چینی

انسانی تمرد وسرکشی نے بہت کم عجز وانکساری کا اظہار کیا ہے، بلکہ اپنے ظہور وشہود کے لئے دوسری راہیں نکال لیتی ہے، جب قرآن حکیم کے مقابلہ میں کامیاب نہ ہوسکے تو اس کی تعلیم پر نکتہ چینی شروع کردی، مکّہ مبارکہ میں قرآن کا ایک حصّہ نازل ہوچکا تھا، عوام الناس نے خدائے قدوس کو چھوڑ کر احبار اور رہبان کو اربابا من دون اللہ کا درجہ دیدیا تھا،

بت پرستی میں سب کے سب مبتلا تھے، ان لوگوں کی جہالت و نادانی واضح کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا :-

مثل الذین اتخذوا من دون اللہ اولیاء کمثل العنکبوت ج اتخذت بیتا ط وان اوھن البیوت لبیت العنکبوت م لو کانوا یعلمون ○ (۲۹ : ۴۰)	جن لوگوں نے خدا کے سوا دوسرے کارساز بنا رکھے ہیں، ان کی مثال مکڑی کی سی ہے کہ اس نے گھر بنایا، اور کچھ شک نہیں کہ گھروں میں بودے سے بودا مکڑی کا گھر ہے، اے کاش یہ لوگ اتنی بات سمجھتے ۔

پھر سورۂ حج میں کہا :-

یا یھا الناس ضرب مثل فاستمعوا لہ ط ان الذین تدعون من دون اللہ لن یخلقوا ذبابا ولو اجتمعوا لہ ط وان یسلبھم الذباب شیئا لا یستنقذوہ منہ ط ضعف الطالب والمطلوب ○ (۲۲ : ۷۲)	لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے، تو اس کو کان لگا کر سنو، خدا کے سوا جن معبودوں کو تم پکارتے ہو، ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے، اگرچہ اس کے لئے سب کے سب اکٹھے ہی کیوں نہ ہو جائیں، اور اگر مکھی ان سے کچھ چھین لے جائے تو اس کو اس سے چھڑا نہیں سکتے، کیسے بودے یہ بت جو مکھی کے پیچھے پڑیں، اور اسکو نہ پکڑ سکیں، اور کیسی بودی وہ بیچاری مکھی، جس کا پیچھا کیا جائے اور پھر بھی ہاتھ نہ آسکے ۔

اس قسم کی آیات سن کر منافقین کے دلوں میں مختلف قسم کے شبہات پیدا ہوئے، اور آخر وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ جس کتاب میں ایسی حقیر و ذلیل اور مکروہ چیزوں کا ذکر ہو، وہ اللہ کی کتاب نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ ان چیزوں کا نام لینا اخلاق و مروت کے قانون میں جرم و معصیت ہے، کوئی تہذیب یافتہ انسان، ان کا ذکر اپنی زبان پر نہ لائیگا، پھر وحی والہام تو اس سے کہیں زیادہ ارفع و اعلیٰ مقام رکھتا ہے، اگلی آیت میں اسی اعتراض کا جواب دیا گیا ہے :-

(۲۶) إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِ أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا

اور اللہ کچھ شرماتا نہیں کہ بیان کرے کوئی مثال ایک مچھر یا اس سے اوپر، پھر جو یقین رکھتے ہیں، سو جانتے ہیں کہ وہ ٹھیک ہے ان کے رب کا کیا، اور جو منکر ہیں سو کہتے ہیں کیا غرض تھی اللہ کو اس مثال سے۔

ہر چیز کا حسن وقبح اس کے نتائج وثمرات سے تعلق رکھتا ہے، درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، عاقبت کار ہی نیکی وبدی کا پتہ دیتی ہے، انما الاعمال بالخواتیم میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ہر صاحب بصیرت کی نظر انجام پر ہوتی ہے، مگر احمق اپنی جہالت ونادانی کی بناپر ابتداے کار ہی میں کٹ حجتی شروع کر دیتے ہیں۔

تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ بہتر سے بہتر زبان میں، آسان سے آسان ترکیبوں اور جملوں کے ذریعہ لوگوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا جائے، اگر فصاحت وبلاغت کا خیال ہو تو مشکل الفاظ غیر معروف ترکیبیں، اور نامانوس طرز بیان اختیار کیا جائے، فلسفہ ومنطق کی مدد سے استدلال میں زور پیدا کیا جائے، ہندسہ ونجوم کے لاینحل مسائل سے اوراق کتاب کو زینت دی جائے تو اس کا یہ نتیجہ ہوگا کہ ایک مخصوص طبقہ تو ضرور ان علمی تحقیقات سے فائدہ اٹھا سکیگا جس کی تعداد بہت ہی کم ہوگی، مگر بیشتر افراد علم کی برکات سے محروم محض رہینگے، آج یورپ کے ماہرین فن تعلیم باوجود اس قدر علم وفضل کے اس اصول کو تسلیم کر چکے ہیں کہ سہل ترین زبان کے ذریعہ تعلیم دینا بے انتہا مفید ونفع بخش ہے، چنانچہ اس قاعدہ کے ماتحت جدید مصنفات کا ذخیرہ فراہم کیا جارہا ہے۔

قرآن حکیم نے تیرہ صدی پیشتر اس نظریہ کو وضع کیا، اس نے شرک وبت پرستی، اصنام وطواغیت کی غلامی اور دجاجلہ وشیاطین کی کج نظری کو ایسی عام فہم مثالوں میں واضح کیا کہ سب کے سامنے ان کی حقیقت اصلیہ آگئی، اور لاکھوں کروڑوں انسان راہ راست پر آگئے، اس نے تہذیب وشائستگی، جہانگیری وجہانداری اور عمران و اجتماع کے مسائل

کو قصص و اخبار ماضیہ کی شکل میں پیش کیا کہ خود استنباط نتائج و استخراج عبر کر لیں۔
پس ایسے امثلہ و نظائر، جو ہزاروں انسانوں کی ہدایت و راہ نمائی کا باعث بنجائیں، اس قابل ہیں کہ ان کا بار بار ذکر کیا جائے، اور اُن کے ذکر سے زبان کبھی نہ تھکے، اللہ تعالیٰ کے پیش نظر انسانوں کی فلاح و کامرانی ہے پھر وہ کیوں نہ ان چیزوں کا ذکر کرے، اس قسم کی مثالوں کے جہاں اور صدہا فوائد و منافع ہیں، اس کا یہ ایک بین اور لازمی نتیجہ ضرور ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے قلوب، غبار شک و اشتباہ سے گرد آلود نہ ہوں، جو اب تک اپنی فطرۃ صالحہ پر قائم ہوں، اور جو خارجی اثرات ضلالت سے منفعل اور اثر پذیر نہ ہوئے ہوں وہ ان مثالوں کے سنتے ہی فوراً پکار اُٹھتے ہیں کہ یہ تعلیم بیشک اللہ کی جانب سے نازل ہوئی ہے، اور ایسا ہی ہونا بھی چاہیے تھا۔ ان کے دل تو پہلے ہی سے مومن تھے، مگر اب تک انہیں اظہار کا موقع نہ ملا تھا، اب خود بخود ان کی زبان پر ایسے الفاظ جاری ہو گئے جن سے ان کا اسلام عالم آشکارا ہو گیا۔
مگر جن کے دلوں میں کجی ہوتی ہے، قلب سلیم کی جگہ زنگ آلود اور سیاہ دل رکھتے ہیں، اعمال فاسقہ کی کثرت اور کفر و جہل کے غلبہ و استیلا کی بنا پر اُن کی ہدایت کی تمام راہیں بند ہوتی ہیں، روشنی کی جگہ تاریکی، حق کی جگہ باطل، اور اسلام کی جگہ کفر کی فرمانروائی ہوتی ہے، جو بدبخت اپنے مصالح خصوصی کی بنا پر اپنے کفر و نفاق کو چھپائے پھرتے تھے، اور مسلمانوں کے مجامع میں اسلام پرستی کا اظہار کرتے تھے، ایسی مثالوں کے سنتے ہی کہتے ہیں کہ بھلا ان مثالوں کی ضرورت ہی کیا تھی، ان سے تو اور زیادہ لوگوں کے دلوں میں نفرت پیدا ہو گئی، وہ بظاہر اپنی دینی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں، لیکن حقیقت میں ان کی منافقت اپنا ظہور کرتی ہے کہ فرزندان اسلام ان کی چالبازیوں میں نہ آئیں، اور آیندہ کے لئے اُن سے احتراز و اجتناب کریں۔

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا	گمراہ کرتا ہے اس سے بہتیرے، اور راہ پر لاتا ہے

يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ○ (۲۷) الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ص وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ط اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ○

اس سے بہتیرے، اور گمراہ کرتا ہے انہیں کو جو بے حکم ہیں جو توڑتے ہیں اقرار اللہ کا مضبوط کیے پیچھے، اور توڑتے ہیں جو چیز اللہ نے فرمائی جوڑنی اور فساد کرتے ہیں ملک میں، انہیں کو آیا نقصان۔

اس کا یہ منشا نہیں کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو گمراہ کرتا ہے، بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس قسم کی مثالوں سے بہت سے لوگوں کی گمراہی کا اظہار ہوتا ہے، اور بہتوں کی ہدایت ظاہر ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ جب خدائے قدوس نیکی اور طہارت کا سرچشمہ ہے تو وہ کیسے دوسروں کو گمراہ کریگا، وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے بندوں کے واسطے کفر و ضلالت کو پسند نہیں کرسکتا ولا یرضیٰ لعبادہ الکفر (۳۹ : ۱۰) پس اس کا یہی مطلب ہے کہ ان کی ضلالت اور گمراہی کا اظہار ہوتا ہے، اور گمراہ بھی وہی لوگ ہوتے ہیں جن میں حسب ذیل امراض ہیں:-

(الف) **ایمانی کمزوری**، ایک شخص جب دوسروں کے لئے قانون بنائیگا تو اُن کی سہولت و آسانی کی پرواہ نہ کریگا، مگر جب اپنی نوبت آئیگی تو ہر قسم کی سہولتیں تلاش کریگا، لیکن اس کا ایمان اس درجہ کمزور ہوتا ہے کہ باوجود اس قدر سہل و آسان تر قانون ہونے کے وہ پھر بھی اس کا پابند نہیں رہ سکتا، اور نقض عہد کا مرتکب ہوتا ہے۔

(ب) **ضعف طبیعت**، فطرت انسانی اس بات کی مقتضی ہے کہ خاندانی تعلقات قائم رہیں، صلہ رحمی کی جائے، اور قرابت داری کے جو روابط ہیں ٹوٹنے نہ پائیں۔ منافق کی فطرت اس درجہ کمزور ہوتی ہے کہ وہ اس کو بھی پورا نہیں کرسکتا، گھر والوں میں جھگڑا اور فساد ڈالتا ہے اور خاندانوں میں جنگ و جدل برپا کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔

(ج) **کوتاہ عقلی**، فتنہ و فساد کو ہر شخص ناپسند کرتا ہے کہ اس میں ضیاع مال و دولت کے علاوہ زندگی ہمیشہ خطرہ میں رہتی ہے، مگر اس کی سعی و کوشش ہی یہی رہتی ہے کہ حق و صداقت کو فنا کرے، اور کفر و بطالت اس کی جگہہ لے،

یہی وہ بدطینت اور بداخلاق ہیں جو اس تعلیم صحیح سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے، اور یہی وہ لوگ ہیں جو ہمیشہ ناکام خاسر رہیں گے۔

(۲۸) كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۲۹) هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا ق ثُمَّ اسْتَوٰى إِلَى السَّمَاءِ فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ط وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○

تم کس طرح منکر ہوا اللہ سے، اور تھے تم مردے، پھر اس نے تم کو جلایا، پھر تم کو مارتا ہے، پھر جلاویگا پھر اُسی کے پاس اُلٹے جاؤگے وہی ہے جس نے بنایا تمہارے واسطے جو کچھ زمین میں ہے سب، پھر چڑھ گیا آسمان کو تو ٹھیک کیا اُن کو سات آسمان، اور وہ ہر چیز سے واقف ہے۔

جس کارساز قدرت کے قبضہ میں زندگی اور موت، اور اس کے تمام اسباب و مراتب ہوں، اس سے انحراف و بغاوت کی کوئی صورت نہیں، بلکہ طوعًا و کرہًا اسی چوکھٹ پر اپنا سر نیاز جھکانا پڑے گا، دوسری جگہ فرمایا:۔

افغیر دین اللہ یبغون ولہ اسلم من فی السمٰوٰت والارض طوعا وکرھا والیہ یرجعون ○ (۳ : ۷۷)

کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا کسی اور دین کی تلاش میں ہیں، حالانکہ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، چار و ناچار اسی کے حکم بردار ہیں، اور اسی کی طرف سب کو لوٹ کر جانا ہے۔

پھر ایک جگہ یوں ارشاد کیا:۔

یٰمعشر الجن والانس ان استطعتم ان تنفذوا من اقطار السمٰوٰت والارض فانفذوا لا تنفذون الا بسلطٰن ○ (۵۵ : ۳۳)

اے گروہ جن و انسان! اگر تم سے ہو سکے کہ آسمانوں اور زمین کے کناروں سے ہو کر کہیں کو نکل بھاگو تو نکل دیکھو، مگر کچھ ایسا ہی زور ہو تو نکلو۔

پس ہر فرزند آدم کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ رب الارباب

کے آگے اپنی گردن خم کردے، اور اسکے تشریعی و تکوینی قانون کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنائے،

اگر ہم انسان کی تحلیل و تجزیہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو چیزوں سے ترکیب دیا گیا ہے، (۱) جسم (۲) روح، اور انھیں کا نام انسان ہے، جسم کی کثافت اس امر کی مقتضی ہے کہ اس کے مالوفات و مطلوبات اور ہوں، اور روح کے دواعی اور، اس لئے کہ یہ یکسر نورانیت اور لطافت ہے پس اس کی طلب و جستجو بھی اس سے جداگانہ ہونی چاہیئے،

جب اللہ تعالیٰ نے جسم اور روح کو پیدا کیا تو ان کی تربیت اور تکمیل بھی وہی کریگا، ان علینا للھدیٰ (۹۲: ۱۲) میں اسی طرف اشارہ ہے، چنانچہ جسمانی ضرورتوں کے لئے اسنے کرہ ارضی کی تخلیق کی، اور روحانیات کے لئے آسمان بنایا، زمین و آسمان دونوں مل کر ہماری تمام روحانی و جسمانی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں، سورہ تغابن میں اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا :-

خلق السمٰوات والارض بالحق وصورکم فاحسن صورکم والیہ المصیر، (۶۴ : ۳)	عین ضرورت کے مطابق اس نے روحانیات و مادیت کے دو مخزن بنائے، پھر ان سے فائدہ اٹھانے کے بہتر سے بہتر اسباب و سائل بہم پہونچائے اور ہر

چیز کا محل استعمال، قوی و اسباب کے لحاظ سے نتائج کا آخری فیصلہ خدا ہی پر ہو سکتا ہے، دوسری تمام قوتیں وہاں بیکار ہیں -

جب ہماری موت و حیات، اور ان کے تمام درمیانی مراحل وابستہ ہیں اسی یگانہ و قہار کے ساتھ، پھر یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ ہم اس کے قانون سے اپنے آپ کو آزاد کرلیں بلکہ کسی نہ کسی شکل میں اس کی پابندی کرنی پڑیگی -

گزشتہ تین رکوع میں اس مسئلہ کو واضح کردیا گیا کہ ہر انسان کو قانون الٰہی تسلیم کرنا ضروری ہے، اور اس سے مفر کی کوئی صورت نہیں، آیندہ حضرت آدم کا قصہ بیان کیا

جائیگا تاکہ اس مثال سے اور زیادہ وضاحت ہو، اور کسی قسم کا شک واشتباہ باقی نہ رہے، اس قصہ کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ سے تعلقات قائم کرنا، وحی الٰہی کی پابندی اور مذہب کا اتباع، انسان کا فطری جذبہ ہے، مذہب کی پیروی صرف اسلئے کرائی جاتی ہے کہ اس کے جذبات فطرت کی تکمیل و تربیت ہو، وہ حقائق و معارف، جو ذاتی تجربہ کی بنا پر انسان کو صدیوں کے بعد معلوم ہوتے، وحی الٰہی کی معرفت چند لمحوں کے اندر جان لے۔

جنگل میں ایک شخص زخمی ہوتا ہے، کوئی نہیں جو اس کا علاج و مداوا کرے، طبی امداد و اعانت کی کوئی صورت نہیں، خود اس کی طبیعت علاج کرتی ہے، اور ایک مدت کے بعد اس کا زخم مندمل ہونے لگتا ہے، تا آنکہ وہ بالکل تندرست ہو جاتا ہے، اگر زخم لگتے ہی اسے ڈاکٹری دوا میسر آجاتی تو اسے اتنی تکلیف نہ برداشت کرنی پڑتی اور قلیل ترین زمانہ میں اس کا زخم اچھا ہو جاتا، اور یقیناً اس کا ہر رگ و پے ڈاکٹر کا شکر گزار ہوتا کہ اتنی مصیبت سے نجات بخشدی۔

یہی حال مذہب اور انبیاء و رسل کا ہے، انسان کی فطرت، خود اس بات کی مقتضی ہے کہ اپنے خالق کے ساتھ وابستہ رہے، اگر اسے اپنی طبیعت پر چھوڑ دیا جاتا تو مدتہائے دراز کے بعد تکمیل ہوتی، اللہ تعالیٰ نے اپنی کمال رافت و رحمت سے کام لیکر اس دشوار گزار راستہ کو نہایت ہی مختصر کر دیا، اور انبیائے کرام کے ذریعہ اس کی تمام مشکلات آسان کردیں، چنانچہ قصہ آدم سے یہ حقیقت واضح ہو جائیگی۔

گزشتہ رکوع کی آخری آیت میں فرمایا تھا کہ ھوالذی خلق لکم ما فی الارض

جمیعا ثم استوی الی السماء فسوٰھن سبع سمٰوٰت ہ وھو بکل شئ علیم ہ

(۲ : ۲۰) زمین و آسمان کی تخلیق کیوں عمل میں آئی، اور ان کو کس غرض کے لئے پیدا کیا گیا؟ قصہ آدم ان تمام باتوں پر روشنی ڈالیگا، اور ان تمام کا ماحصل یہ ہوگا کہ رسے ... باغی

ہو کر صرف ایک کے وفادار بن جائیں، اسی کا عشق دامن گیر ہو، اور اسی کی محبت و شیفتگی میں مجنوں وار بادیہ پیمائی ہو۔

آدم علیہ السلام

(۲۸) وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ قَالُوٓا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ قَالَ إِنِّيٓ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ○

اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو مجھکو بنانا ہے زمین میں ایک نائب بولے کیا تو رکھیگا اسمیں وہ شخص جو فساد کرے وہاں، اور کرے خون، اور ہم پڑھتے ہیں تیری خوبیاں اور یاد کرتے ہیں تیری پاک ذات کو، کہا مجھکو معلوم ہے جو تم نہیں جانتے،

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو اپنے ارادہ سے اطلاع دی کہ میں اس زمین میں اپنا ایک نائب بھیجنا چاہتا ہوں، جو نوع انسانی کی سعادت وہدایت کے لئے ایک خاص ذمہ دار حکومت قائم کرے، میری عدالت کو دنیا میں نافذ کرے، ظلم وجور، طغیان وسرکشی، اور ضلالت وگمراہی سے میری زمین پاک ہو، میرا وہ ہمہ گیر قانون عدل، جو تمام کائنات ہستی میں سورج سے لیکر زمین کے ذرات تک قائم ہے، زمین کے گوشے گوشے اور چپے چپے میں جاری وساری ہو، اور کرۂ ارضی سعادت وامنیت کی ایک بہشت زار بن جائے۔

آدم مختلف عناصر واجزائے ارضی سے ترکیب دیے گئے تھے، ضرور تھا کہ آگے چلکر ان کی اولاد میں ان گوناگوں اجزائے ترکیبی کے اثرات ونتائج کا ظہور ہو، ذرہ ذرہ قبائے آدم خون کے چھینٹوں سے رنگین نظر آئی، اس لئے فرشتوں نے محض اظہار حقیقت کی غرض سے کہا کہ اس کی اولاد سے فتنہ وفساد کا اندیشہ ہے، انہیں آدم کے کمالات اور محاسن وفضائل کی اطلاع نہ تھی، اس لیے حق بجانب تھے لیکن واقفیت ہونے پر انہیں اپنی لاعلمی کا اعتراف کرنا پڑا۔

فرشتے ہر وقت اللہ کی تسبیح و تقدیس میں مصروف رہتے ہیں، وہ اقرار کرتے ہیں کہ خدا کی ذات نقائص و ذمائم سے پاک و صاف ہے، مگر ساتھ ہی اس کے جب یہ دیکھتے ہیں کہ اولاد آدم خون کی ندیاں بہا دیگی اور قتل و غارت گری کی مرتکب ہوگی، تو جہاں وہ آدم کے متعلق اپنے شبہات پیش کرتے ہیں، اسی کے ساتھ اس سے بھی غافل نہیں کہ اس کی پیدایش میں کوئی حکمت مضمر ہے جو ان کی سمجھ سے بالاتر ہے، چنانچہ ان کو یہی جواب دیا گیا کہ تخلیق آدم کی غرض و غایت سے ہم واقف ہیں، اور تھوڑے سے انتظار کے بعد تم بھی جان لوگے۔

(۲۹) وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۳۰) قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ (۳۱) قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ○

اور سکھائے آدم کو نام سارے، پھر وہ دکھلائے فرشتوں کو، کہا بتاؤ مجھکو نام ان کے اگر تم سچے ہو، بولے تو سب سے نرالا ہے ہم کو نہیں معلوم مگر جتنا تونے سکھایا تو ہی اصلی دانا پختہ کار، کہا اے آدم! بتادے ان کو نام اُن کے، پھر جب اس نے بتادیے نام اُن کے، کہا میں نے نہ کہا تھا تم کو مجھ کو معلوم ہیں پردے آسمان اور زمین کے اور معلوم ہے جو تم ظاھر کرو اور جو چھپاتے ہو۔

چونکہ آدم کو خلافت ارضی اور نیابت الٰہی کے لئے پیدا کیا گیا تھا اسلئے اس کو تمام وہ علوم و معارف سکھائے گئے جو قانون عدل کے قیام و نفاذ، ضلالت و طغیان کے رفع و انسداد، اور سعادت و امنیت عالم کے لئے ضروری و ناگزیر تھے، ہر چیز کی حقیقت و ماہیت، اس سے جلب منافع اور دفع مضرات کے تمام طرق کی تعلیم دی، اور اس قدر قابلیت و استعداد پیدا کردی کہ تمام اشیاء کے استعمال کے اسباب و ذرائع، اور

ان کے انتہائی ثمرات و نتائج معلوم کرنے کی ضرورت و احتیاج خود بخود اس کے مشکلات و موانع کو دور کر دیگی، اگر ایک شخص بھوک کی شدّت سے تڑپ رہا ہے، اور اتفاق سے اس نے انگور کا باغ دیکھ لیا، تو خود بخود اس کے لئے راستہ تلاش کر لیگا۔

ملائکۃ الرحمٰن کی نسبت یہ بات مشہور ہے کہ وہ تمام حوائج نفسانی سے پاک ہیں، کھانے پینے کی انہیں ضرورت نہیں، وہ فرمان الٰہی کے تابع ہیں اور ان کا طغرائے امتیاز یہ ہے کہ لایعصون اللہ ما امرھم ویفعلون ما یومرون (۶۶ : ۶) پھر ان سے یہ توقع کیسے ہوسکتی تھی کہ وہ زمین کی چیزوں کے خواص و امتیازات سے واقف ہونگے، مگر چونکہ انہوں نے خلق آدم پر اپنا شبہ ظاہر کیا تھا اسلئے ان کے اطمینان کی خاطر اور رفع اشتباہ کے واسطے ان سے کہا گیا کہ ان اشیاء کی حقیقت و ماہیت پر روشنی ڈالو، وہ فوراً سمجھ گئے اور اپنی لاعلمی کے معترف ہوئے، اور مان گئے کہ فعل الحکیم لایخلو عن الحکمۃ، تو ہی ان اسرار و مصالح سے واقف ہے جو وجود آدم میں پنہاں ہیں، ہم میں یہ استعداد ہی نہیں کہ ان چیزوں کے متعلق کچھ لب کشائی کرسکیں۔

آدم کو ان میں سے ہر ایک چیز سے کام لینا تھا، اس لئے انہوں نے سب کچھ بتا دیا، اور واضح کر دیا کہ اللہ کی زمین میں نظم و نسق قائم کرنے، اور اس کو الصراط المستقیم پر لانے کے لئے جس قدر عقل و دانائی، فہم و فراست، اور علم و دانشمندی کی ضرورت ہے، ملاء سافل کے فرشتے اس سے یکسر محروم ہیں، اس فضیلت علمی کے ظاہر ہونے پر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو مخاطب کرکے فرمایا کہ میں خوب جانتا تھا کہ زمین و آسمان کی تمام چیزیں کس غرض کے لئے پیدا کی گئیں ہیں، کون ان سے کام لے سکتا ہے، اور یہ بھی مجھے معلوم تھا کہ تمہاری موجودہ استعداد کتنی ہے، اور آئندہ چل کر تم میں کہاں تک ترقی ہوسکتی ہے، پس ان تمام امور کو پیش نظر رکھ کر آدم کی تخلیق عمل میں آئی۔

فرشتوں کا سجدہ

(۳۴) وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

اور جب ہم نے کہا فرشتوں کو سجدہ کرو آدم کو تو سجدہ میں گر پڑے مگر ابلیس نے قبول نہ کیا، اور تکبر کیا اور وہ تھا منکروں میں سے۔

آپ پہلے معلوم کر چکے ہیں کہ آدم کی پیدائش اسلئے عمل میں آئی کہ وہ دنیا میں نیکی اور پاکیزگی کے قیام کا باعث بنے، اس کی وجہ سے عادل و منصف حکومت قائم ہو، زمین امن و سلامتی کا گہوارہ بن جائے، انسانوں کی گمراہیاں اور ضلالتیں دور ہوں، لوگ تہذیب اخلاق اور اصلاح اعمال کی جانب متوجہ ہوں، اور کرۂ ارضی کی ہر چیز سے بہرہ اندوز ہوں، پس جب آدم کی تخلیق اس لئے ہوئی تو ضرور تھا کہ تمام فرشتوں کو اس کا مطیع و فرماں بردار بنا دیا جاتا، اسکے احکام و اوامر کے آگے ان کی گردنیں جھک جاتیں تاکہ وہ قلوب بنی آدم میں نیکی اور طہارت کی تحریک کریں، وحی الٰہی کو لبیک کہنے اور انبیاء و رسل کی تعلیم کے آگے سر نیاز خم کرنے کے لئے ان کو تیار کریں، اس طرح آدم کی راہ میں جو مشکلات و موانع ہوں اُن کے دور کرنے میں اس کے معین و مددگار ہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو اطاعت آدم کا حکم دیا، انہیں اب کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہ تھی،

آفتاب آمد دلیل آفتاب گر دلیلے بایداز وے رخ متاب

اس کی فضیلت علمی کا اقرار وہ پہلے کر چکے ہیں، اس حکم کے سنتے ہی ان کی گردنیں آدم کے آگے جھک گئیں، اور گویا زبان حال سے اس امر کا عہد و میثاق کیا کہ وہ کبھی اس سے منحرف نہ ہونگے اور ہمیشہ اس کے تابع فرمان رہینگے۔

ابلیس نے آدم کی اطاعت و انقیاد سے صاف انکار کر دیا، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ فرشتہ تھا، لیکن قرآن حکیم صاف اعلان کرتا ہے کہ اس کو فرشتوں سے کوئی

تعلق نہیں بلکہ کان من الجن ففسق عن امر ربہ (۱۸ : ۴۸) وہ جنات کے گروہ سے تھا دوسری جگہہ آیا :-

ویوم یحشرھم جمیعا ثم یقول للملئکۃ اھؤلاء ایاکم کانوا یعبدون قالوا سبحنک انت ولینا من دونھم بل کانوا یعبدون الجن ج اکثرھم بھم مومنون ○ (۳۴ : ۳۹ و ۴۰)	اور جبکہ خدا سب لوگوں کو جمع کیے پیچھے فرشتوں سے پوچھے گا کہ کیا یہ آدم زاد تمہاری ہی پرستش کیا کرتے تھے، وہ عرض کرینگے کہ خدایا تو پاک ہی ہم کو تجھ سے سروکار ہے نہ ان سے، ہماری نہیں بلکہ یہ لوگ شیاطین کی پرستش کیا کرتے تھے اکثر انہیں کے معتقد تھے۔

پھر ایک جگہہ کہا :-

افتتخذونہ وذریتہ اولیاء من دونی (۱۸ : ۴۸)	تو لوگو! کیا ہم کو چھوڑ کر ابلیس کو اور اس کی نسل کو اپنا دوست بناتے ہو۔

حالانکہ فرشتگان خداوندی کے لئے کسی نے بھی آج تک اولاد ثابت نہیں کی، اولاد ہمیشہ مرد و عورت کے اختلاط و امتزاج سے پیدا ہوتی ہے اور فرشتے اس سے پاک ہیں، لوگ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے مگر اللہ تعالی نے اس کا صاف صاف انکار کیا اور فرمایا وجعلوا الملئکۃ الذین ھم عبد الرحمن اناثا (۴۳ : ۱۸) پھر فرشتوں کی خصوصیت کبری یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ طہارت و پاکیزگی، اور نیکی و معصومیت کے پیکر ہیں لا یعصون اللہ ما امرھم ویفعلون ما یومرون (۶۶ : ۶) لیکن ابلیس کا جہاں ذکر آیا تمرد و سرکشی اور طغیان و ضلالت کے ساتھ آیا، پس یہ بات صاف ہوگئی کہ ابلیس ایک جداگانہ مخلوق ہے جو فرشتوں کے بخط مستقیم مخالف ہی، جس کی رگ و پے میں عصیان و عدوان سرائت کئے ہوئے ہے، اس سے اطاعت و فرماں برداری کی توقع رکھنا بھی فضول ہے، اس لئے جس وقت اس کو سجدہ کے لئے کہا گیا، وہ فوراً بول اٹھا ءاسجد لمن خلقت طینا (۱۷ : ۶۳) دوسری جگہہ اور زیادہ

تفصیل آئی ہے، جب اس نے سجدہ سے انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

ما منعك الا تسجد اذ امرتك ط قال انا خیر منه ج خلقتنی من نار و خلقته من طین (۷ : ۱۱)	جب ہمنے تجھکو حکم دیا تو آدم کے آگے جھکنے سے تجھکو کون چیز مانع ہوئی؟ وہ بولا میں اس سے بہتر ہوں کیونکہ مجھکو تونے آگ سے پیدا کیا اور اسکو خاک سے پیدا کیا۔

گویا انکار کی اصلی وجہ اس کا غرور باطل تھا کہ وہ اپنے آپ کو آدم سے بہتر خیال کرتا تھا، مگر اللہ تعالیٰ کو یہ استکبار کبھی پسند نہیں آسکتا، چنانچہ اس کبر و نخوت کا نتیجہ یہ ہوا کہ لعنت کا طوق ہمیشہ کے لئے اس کی گردن میں ڈالا گیا۔

آدم کی جنت

(۳۵) وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۖ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ	اور کہا ہم نے اے آدم! بس تو اور تیری عورت جنت میں رہ اور کھاؤ اس میں محظوظ ہو کر جس جگہ چاہو اور نزدیک نہ جاؤ اس درخت کے، پھر تم بے انصاف ہوگے

کتاب و سنت میں بحث و نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہی کہ ایک ایسا عالم بھی موجود ہی، جس کی ترکیب جسمانیات سے نہیں ہی، اس کو نہ تو اجزائے ارضی سے کوئی تعلق ہے، اور نہ وہاں عناصر کا سلسلہ چل سکتا ہی، وہ یکسر روحانیت ہی ہے، تمام وہ حقائق جو ہمارے روزمرہ کے محاورے میں صرف معانی تک محدود ہیں اس عالم میں ان کا وجود بھی ہے، جو صفات و مختصات کے اعتبار سے ہوتا ہے مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

بینا انا نائم رایت الناس یعرضون علی وعلیهم قمص منها ما یبلغ الثدی ومنها ما دون ذلك وعرض علی عمر بن الخطاب وعلیه قمیص یجره، قالوا فما اولت ذلك	خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ لوگوں کو میرے سامنے پیش کیا جا رہا ہی، وہ قمیص پہنے ہوئے ہیں مگر کسی کا قمیص تو سینہ تک ہی اور کسی کا اس سے نیچے، اتنے میں عمر کی باری آئی تو ان کا قمیص اتنا لمبا تھا کہ کھنچ

یا رسول اللہ، قال الدین، | جارہے تھے صحابہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ اسکی تعبیر کیا ہے، آپ نے فرمایا، دین۔

دوسرے موقعہ پر یوں کہا:۔

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول بینا انا نائم اتیت بقدح لبن فشربت حتی انی لاری الری یخرج فی اظفاری، ثم اعطیت فضلی عمر بن الخطاب، قالوا فما اولته یا رسول اللہ! قال العلم۔ | میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا، آپ فرماتے تھے کہ میں سو رہا تھا کہ میرے پاس دودھ کا پیالہ لایا گیا، میں نے اتنا سیر ہو کر پیا کہ اُسکی تروتازگی میرے ناخنوں سے ظاہر ہونے لگی، پھر بقیہ دودھ عمر کے حوالہ کر دیا، صحابہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! اسکی تاویل کیا ہے، فرمایا علم۔

عوام الناس کے نزدیک دینداری اور علم و فضل کی حقیقت معانی کے سوا اور کچھ نہیں، مگر اس عالم میں ان کے وجود ہیں، اسی قسم کے اور صدہا احادیث ملینگی، جن میں اس موضوع پر اور زیادہ روشنی ڈالی گئی ہے، حکمائے اسلام کی اصطلاح میں اسے عالم مثال کہتے ہیں، عالم مثال آثار و علائم اور نتائج و ثمرات کے اعتبار سے عالم اجسام سے کہیں زیادہ قوی ہوتا ہے، اور اس کا دائرہ عمل بھی اثر و نفوذ کے لحاظ سے نہایت ہی وسیع ہوتا ہے۔

آدم کو جس جنت میں رہنے کا حکم دیا گیا ظاہر ہے کہ وہ حقیقی جنت نہیں ہوسکتی اس لئے کہ قرآن حکیم کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں داخل ہونے کے بعد پھر نکلنا نہ ہوگا، بلکہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

لا یمسہم فیہا نصب وما ہم منہا بمخرجین، (۱۵: ۴۸) | ان کو بہشت میں کسی طرح کی تکلیف چھوئیگی بھی تو نہیں، اور نہ یہ کبھی بہشت سے نکالے جائیں گے۔

وہم فیہا خالدون بھی اسی کی ایک خصوصیت بیان کی گئی ہے، تو ضرور ہے کہ زمین ہی کا ایک ٹکڑا اس غرض کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہو جس میں قوائے مثالیہ کے ذریعہ جنت کے آثار و مختصات پیدا کر دیے گئے ہوں، یہ ظاہر ہے کہ آدم خلافت ارضی

کے لئے خلق ہوئے تھے پھر اس حقیقی جنت میں کیسے رہ سکتے تھے۔ اس جنت ارضی میں بھی انہیں صرف اسلئے عارضی طور پر رکھا گیا تھا کہ ان کی قوتیں نشوونما حاصل کرلیں اور زمین میں کام کرنے کے قابل ہو جائیں، ان کی مثال اس بچہ کی سی ہی جو ابھی ماں کی گود میں ہی کچھ مدّت تک اس کا صرف دودھ پر گذارہ ہی، اگر کھانے کی قابلیت اس میں پیدا ہو، جس طرح بچہ ہمیشہ کے لئے ماں کا دودھ نہیں پی سکتا، اسی طرح آدم دائمی طور پر اس جنت میں نہیں رہ سکتے بلکہ جس وقت ان میں محنت ومشقت کی استعداد پیدا ہو جائیگی فوراً وہاں سے نکال دیے جائینگے۔

مگر انہیں ایک درخت کے قریب جانے سے روک دیا گیا، مفسرین کرام نے اس درخت کی حقیقت و ماہیت پر بہت کچھ لکھا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ تمام و کمال جولانی طبع کے سوا اور کچھ نہیں، کتاب وسنت سے اس بات کا پتہ نہیں لگتا کہ وہ درخت کونسا تھا، پھر جب ناموس الٰہی اور لسان نبوت نے خاموشی اختیار کی ہو تو ہمیں فلسفیانہ موشگافیاں کرنے کا کیا حق حاصل ہے، البتہ اس درخت کی مثال اس کڑوی دوا سے دی جاسکتی ہے جو ماں اپنے پستان پر اس لئے لگالیتی ہے کہ بچہ دودھ پینا چھوڑ دے اور ساتھ ہی اسکی محبت بھی والدین کے ساتھ بدستور قائم رہے۔ والدہ بچہ کو اس کے قریب جانے سے روک دیتی ہے، اگر جب وہ نہیں مانتا اور اسے مُنہ لگا ہی دیتا ہی تو آخر اس کا کڑواپن اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے دودھ ترک کر دے۔ یہی کیفیت آدم کے متعلق نظر آتی ہے، انہیں روک دیا جاتا ہے کہ اس کے قریب بھی نہ جانا، ورنہ اس کا خمیازہ بھگتنا پڑیگا۔

(۳۶) فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۖ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ٥	پھر پھسلا دیا اُن کو شیطان نے اس سے، پھر نکالا اُن کو وہاں سے جس آرام میں تھے، اور کہا ہم نے تم سب اترو، ایک دوسرے کے دشمن ہو، اور تم کو زمین میں ٹھیرنا ہے اور کام چلانا ایک وقت تک۔

آدم ایک مدت تک وہاں رہے تا آنکہ ان کے نکلنے کا زمانہ آگیا، دوسری جگہہ آتا ہے کہ:-

ولقد عهدنا الی آدم من قبل فنسی ولم نجد له عزما (۲۰: ۱۱۴)	اور ہم نے اگلے زمانے میں آدم سے درخت کو نہ کھانیکا ایک عہد و پیمان لیا تھا تو آدم اسکو بھول گئے، اور ہم نے انکے ارادے میں استقلال نہ پایا۔

درخت کا کھانا تھا کہ جنت ارضی کی تمام نعمتیں یک قلم مفقود ہو گئیں، اس کے تمام اثرات وعلائم جاتے رہے، اور وہ زمین کا ایک معمولی ٹکڑا رہ گیا، جنت کی سرزمین حوائج انسانی سے بالکل پاک ہی، سورہ طٰہٰ میں ہے:-

ان لك الا تجوع فيها ولا تعرىٰ وانك لا تظموا فيها ولا تضحىٰ ۝ (۲۰: ۱۱۶ و ۱۱۷)	یہاں بہشت میں تو تم کو ایسے مزے ہیں کہ نہ تم بھوکے رہتے ہو، اور نہ ننگے رہتے ہو، اور نیز یہ کہ یہاں نہ تم پیاسے رہتے ہو، اور نہ دھوپ میں رہتے ہو۔

جس وقت انہوں نے پھل کھایا اور پیشاب پاخانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس کے لئے کوئی مناسب مقام تلاش کرنے لگے، مگر وہ تو تمام سامان عارضی تھا اب جبکہ وہ کام کرنے کے قابل ہو گئے تو ان سے سب کچھ چھین لیا گیا:-

فبدت لهما سوأتهما وطفقا يخصفن عليهما من ورق الجنة (۲۰: ۱۱۹)	تو اپنی اپنی پردے کی چیزیں ان پر ظاہر ہو گئیں، اور لگے باغ بہشت کے پتے اپنے او پر چپکانے،

چونکہ یہ پہلے سے طے شدہ بات تھی کہ آدم ہمیشہ کے لئے اس جنت ارضی میں نہیں رہ سکتے، شجرہ ممنوعہ کو ان کے اخراج کا ایک سبب قرار دیا گیا، اس لئے اس کے پھل کا کھانا تھا کہ انہیں وہاں سے نکلنے کا حکم صادر کر دیا گیا، ہبط کے لفظ سے بعض ارباب علم کو یہ شبہ ہوا ہی کہ آدم کی جنت ضرور آسمانوں پر ہوگی کیونکہ ہبوط کے معنی اوپر سے نیچے آنے کے ہیں، قرآن نے بنی اسرائیل کے لئے یہی لفظ استعمال کیا: اهبطوا مصرا (۲: ۵۸)

وہاں سب کا اتفاق ہے کہ اس جگہ نقل مکان کے معنی میں یہ لفظ آیا ہے، تکلیف و مصیبت میں مبتلا ہونے کو بھی کہتے ہیں، پس یہاں بھی ہبوط آدم کے یہی معنی ہیں کہ ان کو جنت ارضی سے نکال کر دوسری زمین میں رہنے کا حکم دیا گیا۔

جنت سے نکلنے کا باعث ابلیس ہوا، اس سے پہلے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ ابلیس کی لعنت کا سبب آدم تھے، اس لئے اب قدرتی طور پر دونوں میں بغض و عداوت کا بیج بویا گیا، اور وہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے دشمن بن گئے، دوسری جگہ آتا ہے:۔

فقلنا یآدم ان ھٰذا عدو لك ولزوجك فلا یخرجنكما من الجنة فتشقٰى (٢٠ : ١١٥)

تو ہم نے آدم سے کہا کہ آدم! یہ ابلیس، تمہارا اور تمہاری بی بی کا دشمن ہے، تو ایسا نہ ہو کہ تم دونوں کو بہشت سے نکلوا باہر کرے، اور تمہاری شامت آجائے۔

پھر دائمی طور پر فرزندان آدم کو ان الفاظ میں تنبیہ کر دی:۔

یٰبنی آدم لا یفتننكم الشیطٰن كما اخرج ابویكم من الجنة ینزع عنهما لباسهما لیریهما سواٰتهما انه یرٰكم هو وقبیله من حیث لا ترونهم ط (٧ : ٢٦)

اے بنی آدم! کہیں شیطان تم کو راہ خدا سے بہکا نہ دے، جس طرح کہ اس نے تمہارے والدین کو بہشت سے نکلوایا، کہ لگا ان کا لباس ان سے اتروائے تاکہ ان کے پردہ کرنے کی چیزیں ان پر ظاہر کر دے، غرض اغوائے شیطان سے بچتے رہو کیونکہ وہ اور اس کی ذریات تم کو ادھر سے دیکھتے رہتے ہیں، جدھر سے تم ان کو نہیں دیکھتے۔

جس وقت حضرت آدم علیہ السلام وہاں سے نکال دیے گئے، انہیں ایک دائمی قانون کی طرف متوجہ کر دیا اور وہ دستور العمل یہ تھا کہ دنیا دار العمل ہے، کوئی شخص یہاں تعطل و بیکاری کی زندگی بسر کرنے کے لئے نہیں پیدا کیا گیا، بلکہ ہر ایک کو محنت و مشقت کرنی پڑیگی، اسی سے وہ کمالات و فضائل حاصل کریگا، اسی پر اس کی نشو و ترقی کا دارومدار ہوگا، جہاں اس نے عیش و آرام کا خیال کیا، تباہ و برباد ہو جائیگا، اور کبھی اسے کامیابی نصیب

نہ ہوگی، سورۂ بلد میں فرمایا: لقد خلقنا الانسان فی کبد (۹۰: ۴)

نزول الہام

(۳۷) فَتَلَقّٰٓی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّہٖ کَلِمٰتٍ	پھر سیکھ لیں آدم نے اپنے رب سے کئی باتیں،
فَتَابَ عَلَیْہِ ؕ اِنَّہٗ ھُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ۝	پھر متوجہ ہوا اس پر، بیشک وہی معاف کرنیوالا مہربان ہے۔

جنت سے نکلنے کے بعد آدم مدت ہائے دراز تک پریشان خاطر رہے، انہیں وہ رہ کے وہاں کی نعمتیں یاد آتی تھیں، ہر وقت مضطرب رہتے، اپنے عزم و استقلال کی حقیقت ان پر واضح ہوگئی تھی، حیران تھے کہ وہی اطمینان قلب پھر نصیب ہو، ویسے ہی عیش و طرب کی زندگی ہو، اور اسی آرام کے ساتھ دن کٹیں، مگر کوئی صورت سمجھ میں نہ آتی تھی تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی لطف و نوازش سے کام لیا، اور انہیں چند کلمات الہام کئے جو ان کے اطمینان و سرور کا باعث ہوئے وہ کلمات دوسری جگہ ذکر کئے گئے ہیں: ربنا ظلمنا انفسنا ۔۔ وان لم تغفرلنا وترحمنا لنکونن من الخسرین (۷: ۲۲)

(۳۸) قُلْنَا اھْبِطُوْا مِنْھَا جَمِیْعًا ج فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی فَمَنْ تَبِعَ ھُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (۳۹) وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَکَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ج ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ ۝	ہم نے کہا تم اترو یہاں سے سب، پھر کبھی پہنچے تمہارے پاس میری جانب سے ہدایت، تو جو کوئی چلا میری ہدایت پر نہ ڈر ہوگا اُن کو اور نہ غم، اور جو منکر ہوئے اور اُنہوں نے ہماری نشانیوں کی تکذیب کی، وہ ہیں دوزخ کے لوگ اسی میں رہیں گے۔

چونکہ آدم علیہ السلام کے اطمینان قلب کا باعث وہی کلمات تھے جو اللہ کی جانب سے الہام کئے گئے تھے اس لئے آیندہ کے لئے یہی قاعدہ کلیہ بنا دیا گیا کہ انسانوں کے عزم و ارادہ میں قوۃ و طاقت پیدا کرنے، فطرۃ اصلیہ کو خارجی اثرات ضلالت سے بچانے، اللہ کے حضور میں قلب سلیم کے ساتھ حاضر ہونے کے لئے اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء و رسل کو مبعوث

کیا کریگا، ان صحائف و اسفار آسمانی پر ایمان لانا ہر انسان کا فرض ہوگا جو ان پیغمبروں پر نازل ہونگے، اور جن الہامات کا مقصد ہی یہی ہوگا کہ اُس کے اندر جذبات صادقہ کی تولید ہو، دعا کو بہترین وسیلہ فلاح و کامرانی خیال کرے، اور خالق و مخلوق کے تعلقات و روابط میں کسی قسم کی کدورت نہ پیدا ہو۔ اسی موضوع پر دوسری جگہہ ان الفاظ میں روشنی ڈالی۔

یٰبنی اٰدم اما یاتینکم رسل منکم یقصون علیکم اٰیتی لا فمن اتقی و اصلح فلا خوف علیهم ولا هم یحزنون والذین کذبوا باٰیتنا واستکبروا عنها اولئك اصحٰب النار ج هم فیها خٰلدون (۷: ۳۳، ۳۴)	اے بنی آدم! جب کبھی تم ہی میں سے ہمارے پیغمبر تمہارے پاس پہنچیں، اور ہمارے احکام تمکو پڑھ کر سنائیں تو ان کا کہا مان لینا کیونکہ جو شخص اُن کے کہنے کے مطابق پرہیزگاری اختیار کریگا اور اپنی حالت کی اصلاح کریگا تو ان پر نہ تو خوف طاری ہوگا، اور نہ وہ آزردہ خاطر ہونگے، اور جو لوگ ہماری آیتوں کو جھٹلائیں گے، اور اُن سے اکڑ بیٹھیں گے، وہی دوزخی ہونگے کہ وہ دوزخ میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

پھر دوسرے موقعہ پر یوں ارشاد ہوا:۔

فاما یاتینکم منی هدی ۵ فمن اتبع هدای فلا یضل ولا یشقی ۵ ومن اعرض عن ذکری فان له معیشة ضنکا ونحشره یوم القیمة اعمی ۵ (۲۰: ۱۲۱ و ۱۲۲ و ۱۲۳)	پھر اگر تمہارے پاس ہماری طرف سے ہدایت آئے، تو جو ہماری ہدایت پر چلیگا، نہ راہ راست سے بھٹکیگا، اور نہ ہلاکت میں پڑیگا، اور جس نے ہماری یاد سے روگردانی کی تو اس کی زندگی ضیق میں گذریگی، اور قیامت کے دن بھی ہم اسکو اندھا کرکے اُٹھائیں گے۔

یہاں تک باب اوّل کی بحث ختم ہو جاتی ہے، اس میں یہ مسئلہ صاف کر دیا گیا کہ مذہب انسان کی فطرت میں داخل ہے، اور اس لئے وہ مجبور ہے کہ ناموس الٰہی کے آگے اپنی گردن جھکا دے، حضرت آدم علیہ السلام نے اس کو اور زیادہ وضاحت سے صاف کر دیا کہ وہ برابر پریشان و مضطرب پھرتے رہے تا آنکہ وحی الٰہی نے چند کلمات الہام کئے

جو ان کے اطمینان قلب اور ثلج صدر کا باعث بنے۔

پس قصۂ آدم نے اس دعویٰ پر مہر لگا دی کہ دنیا میں انسان کو سکینت و اطمینان صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو وحی الٰہی کا پابند بنائے، ورنہ اس کے بغیر اس کی زندگی بالکل بیکار ہو جائیگی۔
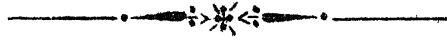
قرآن حکیم کی ضرورت

گزشتہ آیات میں مطلق وحی کی ضرورت پر بحث کی گئی ہے، اور یہ بتایا گیا ہے کہ انسانی زندگی کے بقا و قیام کے لئے الہام الٰہی کا نزول ایسا ہی ضروری ہے جیسے کھیتی کے لئے سورج کی روشنی، جسم کی حفظ و صیانت کے لئے طب و ڈاکٹری، اور حیات انفرادی کے لئے ہوا، پس جس طرح ان میں سے ہر ایک چیز اس درجہ ضروری اور لازمی ہے کہ ایک لمحہ کے لئے بھی انسان ان سے بے نیاز نہیں ہو سکتا، ایسے ہی روح کی تکمیل و تربیت، جذبات صادقہ کی نشئۃ و تولید، اور اخلاق فاضلہ کی تہذیب و شائستگی کے لئے الہام کی ضرورت ہے، مذہب، اس کا داعیہ فطرت ہے، پس اس کے لوازمات کی فراہمی بھی الزم اللوازم

الہام الٰہی نے ہر زمانہ میں اس کی ضروریات و مقتضیات کے اعتبار سے مختلف اشکال و صور اختیار کئے جزئیات میں گو اختلاف رہا ہو، لیکن اصول و کلیات میں ہمیشہ اتحاد رہا، تمام صحائف و اسفار آسمانی کے اوراق کو دیکھ جائیے اساس و بنیاد سب کی ایک ہی ہوگی، اور ایک ہی حقیقت کی طرف سب کی دعوت ہوگی، اس لئے کہ سچائی ہمیشہ سے ایک ہی ہے، اور ایک ہی رہیگی، آپ اپنی سہولت و آسانی کے لئے اس کے مختلف نام رکھ لیجئے

گر مسمی تو وہی ہے۔

عبارا تنا شتی وحسنک واحد
وکل الی ذاک الجمال یشیر

کبھی وحی الٰہی نے نوح کو اس وادی کا وہ نور دیا، اور کبھی اس نے حجاز کی وادیوں میں ابراہیم و اسمٰعیل کو نوازا، اسرائیل کے گھرانے پر نظر ڈالی، تو ایک آگ کی تلاش میں نکلنے والے کو اپنا والہ و شیفتہ بنالیا، اور کبھی ناصرہ کے ایک نوجوان کو اپنی آواز کے لئے چن لیا، تاآنکہ وادی بطحا کی قسمت جاگ اٹھی، غار حرا میں ایک یتیم سر بزانو معتکف تھا، رحمت کے محافظ فرشتے اس کے اردگرد صف بستہ تھے، تمام دنیا خواب غفلت میں تھی، مگر وہ بیدار اور سربسجود تھا کہ خداوند گویا ہوا، ایک انسان کے منہ میں اپنا کلام ڈالا، اور دنیا کے لئے امن و سلامتی کا پیغام نازل کیا "خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا، فاران کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا، اور اس کے داہنے ہاتھ ایک آتشیں شریعت ان کے لئے تھی، ہاں وہ اس قوم سے بڑی محبت رکھتا ہے، اس کے سارے مقدس تیرے ہاتھ میں ہیں، اور وہ تیرے قدموں کے نزدیک بیٹھے ہیں" (کتاب استثنار ۳۳ : ۲ و ۲)

اگرچہ الہام کی مختلف صورتیں رہیں مگر سب سے آخری اور مکمل ترین شکل ہیں جو وحی نازل ہوئی وہ قرآن ہی ہے، اور اب جبکہ یہ مسئلہ صاف کر دیا گیا کہ ہر انسان کو الہام الٰہی کا اتباع کرنا ضروری ہے تو یہ بات خود بخود معلوم ہو گئی کہ اس زمانہ میں چونکہ وہ الہام قرآن حکیم کے اوراق میں مسطور ہے، اس لئے اس کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنانا لازمی ہے، مگر اس کی وہ لوگ مخالفت کرتے ہیں جن کے پاس پہلی کتابیں موجود ہیں، اور اسلام کی راہ ترقی میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں، اس لئے قرآن مجبور ہے کہ ان اقوام و امم کی خرابیاں ذکر کرے تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ ان میں سے ایک قوم بھی اس مقدس فرض کے قابل نہیں ہے،

مذاہب تو بہت کثرت سے ہیں، مگر ان سب میں زیادہ قابل اعتناء یہودیت ہی،
جو اپنے آپ کو ابراہیم و اسمعیل کی طرف منسوب کرتی ہے، اور جس کے اتباع خیال کرتے
ہیں کہ جنت کے اجارہ دار یہی لوگ ہیں، اس لئے سورہ بقرہ میں سب سے پہلے اسی قوم
کو مخاطب کیا گیا کہ عیسائی دراصل انہیں کی ایک مہذب شاخ سے وابستہ ہیں جن کا ذکر
آل عمران میں آئیگا۔

قرآن کی ضرورت ثابت کرنے سے قبل یہودیوں کی انفرادی و اجتماعی خرابیوں پر
بحث کی جائیگی، پھر ان کے مختلف طبقات امۃ کے سوانح و حالات کی تنقیح ہوگی، ان کی
مذہبی کمزوریوں، اور اخلاقی فروگزاشتوں کو واضح کیا جائیگا، اور اس تمام بحث و مذاکرہ
کا اصلی مقصد یہ ہوگا کہ ان لوگوں نے اس درجہ اپنے قلب کو زنگ آلود کر لیا ہی، اور اس
قدر بد اخلاقیوں کا ارتکاب کیا ہے کہ اب ان کی ہدایت کی تمام راہیں بند ہوگئی ہیں، اللہ کی
رحمت سے بہت دور جا پڑے ہیں اور غضب الٰہی نے ان کی حیات قومی کے شیرازہ کو منتشر
کر دیا ہے، تبلیغ و دعوت کے فرض سے ان کا کوئی سروکار نہیں، اور نبوت اسرائیل کی خاندان
سے منتقل ہو کر اسمعیل کے گھرانہ میں آگئی ہے۔

اگلے رکوع میں یہودیوں کی خرابیوں پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائیگی، بعدازاں اسی
اجمال کی تفصیل ہوگی۔

علمی خرابی

(۴۰) يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْھَبُوْنِ ○	اے بنی اسرائیل! یاد کرو احسان میرا جو میں نے کیا تم پر، اور پورا کرو اقرار میرا میں پورا کروں گا اقرار تمہارا، اور میرا ہی ڈر رکھو۔

بنی اسرائیل، حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کو کہتے ہیں، کیونکہ ان کا دوسرا نام
اسرائیل (عبد اللہ) بھی ہے، قرآن حکیم ان کی خرابیاں ذکر کرنے سے قبل تذکیر بالاء اللہ

سکے ذریعہ سوا نکے اندر حس و بیداری پیدا کرنا چاہتا ہی، ایک شریف انسان کی تنبیہ کے لئے صرف اتنا ہی کہدینا کافی ہوتا ہے کہ تم شریف زادے ہو، چنانچہ اس آیت میں بھی انہیں بتایا گیا کہ تمہارے آبائے کرام وہ لوگ تھے جن پر ہر قسم کی نعمتیں نازل ہوئیں، اُن کو نبوت سے سرفراز کیا گیا، حکومت نوازش کی گئی، اور یہی سب سے بڑی نعمت ہی کہ کسی امت کو ایسے اعلیٰ ترین عقائد و اخلاق کی تعلیم دیجائے کہ ان کا لازمی اور قطعی نتیجہ حکومت جہانداری ہو، چنانچہ دوسرے موقعہ پر اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا: ۔

و اذ قال موسیٰ لقومه یٰقوم اذکروا نعمة الله علیکم اذ جعل فیکم انبیاء وجعلکم ملوکا واتٰکم ما لم یؤت احدا من العٰلمین ○ (۵ : ۲۳)	جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ بھائیو! اللہ نے جو تم پر احسانات کئے ہیں، اُن کو یاد کرو کہ اُس نے تم میں پیغمبر بنائے، اور تمکو بادشاہ بھی بنایا، اور تمکو وہ نعمتیں دیں جو دنیا جہان کی لوگوں میں کسی کو نہیں دیں ۔

گویا اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو روحانی اور جسمانی، دونوں بادشاہتیں نوازش کیں، پھر ایسے لوگوں کے لئے تو یہ کبھی بھی جائز نہیں ہو سکتا کہ وہ اللہ کی غلامی کو چھوڑ کر انسانوں کو اپنا رب بنالیں ۔

اس قدر تذکیر و موعظت کے بعد ان سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اس عہد کی پابندی کریں جو انہوں نے خدا کے ساتھ کیا تھا، اس ایفائے عہد کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ بھی اپنے وعدے کو پورا کریگا جو ان سے کیا تھا، گویا اس آیت میں دو عہدوں کا ذکر کیا گیا ہی، ایک عہد بنی اسرائیل کا اللہ تعالیٰ سے، اور دوسرا اللہ تعالیٰ کا ان سے، یہ دونوں کے دونوں عہد حسب ذیل ہیں : ۔

" تو نے آج کے دن اقرار کیا ہے کہ خداوند میرا خدا ہے، اور میں اس کی راہوں پر چلونگا، اور اس کے شرعوں اور اس کے حقوق، اور اس کے حکموں کی محافظت کروں گا،

اور اس کی آواز کا شنوا ہوگا، اور خداوند نے بھی آج کے دن تجھ سے اقرار فرمایا جیسا اس نے تجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تو اس کی خاص گروہ ہووے، اور تو اس کے سب احکام کی محافظت کرے، اور تجھے سارے گروہوں سے جنہیں اس نے پیدا کیا صفت، اور نام، اور عزت میں زیادہ بالا کرے، اور خداوند اپنے خدا کی مقدس گروہ ہووے جیسا اُس نے کہا۔" (کتاب استثنار، ۲۶ : ۱۷، ۱۸ اور ۱۹)

خداوند کی آواز کونسی ہے، یہی کتاب ان الفاظ میں اس پر روشنی ڈالتی ہے :-

"میں ان کے لئے، ان کے بھائیوں میں سے، تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا، اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا، اور جو کچھ میں اسے فرماؤنگا، وہ سب اُن سے کہیگا، اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو جنہیں وہ میرا نام لیکے کہیگا نہ سنیگا، تو میں اس کا حساب اس سے لونگا۔" (کتاب استثنار ۱۸ : ۱۸ اور ۱۹)

بنی اسرائیل سے اب بھی یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اگر وہ اپنے عہد کی پابندی کریں، خداوند کی آواز کے شنوا ہوں اور قرآن حکیم پر ایمان لے آویں تو پھر وہ ایسی قوم بنا دیے جائیں گے جو صفت، نام اور عزت میں زیادہ بالا ہوگی۔

جب مذہبی جماعت کی عزت و حرمت کا اصلی سبب اللہ تعالیٰ کا نام ہے، اور اسی لئے لوگ اس کو اکرام و احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں تو اس کے لئے کبھی یہ جائز نہیں ہو سکتا کہ وہ غیر اللہ سے بھی ڈرے، بلکہ اُسے فقط ایک ہی ذات کا خوف اپنے دل میں رکھنا چاہیے ایک دل میں دو ڈر کبھی جمع نہیں ہو سکتے، فاللہ احق ان تخشوہ ان کنتم مومنین (۹ : ۱۳) اس سے بڑھ کر اس جماعت کی اور کیا ذلت ہو سکتی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی دوسری قوت بھی اس کو اپنے فرائض ادا کرنے سے روک سکتی ہے۔

(۴۱) وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ص وَلَا	اور مانو جو کچھ میں نے اُتارا سچ بتاتا ہے اسکو جو تمہارے پاس ہے، اور تم اس کے پہلے منکر مت بنو، اور میری

تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا وَّ اِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ ○	آیتوں پر تھوڑا مول مت لو، اور مجھ ہی سے بچتے رہو۔

تصدیق کی ضرورت صرف پیشینگوئیوں کے لئے محسوس ہوا کرتی ہے، آپ کو معلوم ہے کہ باوجود تحریفات لفظی و معنوی کے پھر بھی کتب سابقہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے متعلق پیشینگوئیاں اب تک موجود ہیں، چنانچہ گزشتہ آیت میں ہم نے ایک پیشین گوئی کتاب استثناء سے نقل کی ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے موسیٰ جیسا ایک پیغمبر بھیجا جائیگا، موسیٰ علیہ السلام سے لیکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جتنے انبیاء و رسل مبعوث ہوئے کسی نے بھی مثیل موسیٰ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، اسلئے کہ وہ سب کے سب ملت اسرائیلی کی تجدید و احیا کے لئے بھیجے گئے تھے، بلکہ خود مسیح علیہ السلام بھی اسی انتظار میں چلے گئے، جب یوحنا بپتسمہ دینے والے کے پاس یروشلم سے کاہن اور لیوی آئے، اور انہوں نے آکر پوچھا کہ: ۔پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اس نے کہا، میں نہیں ہوں، کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں، (یوحنا، ۱: ۲۱)

جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، آپ نے اوّل ہی روز مثیل موسیٰ ہونے کا اعلان کردیا:۔

انا ارسلنا الیکم رسولاً شاھدا علیکم کما ارسلنا الیٰ فرعون رسولا ○ (۷۳ : ۱۵)	جس طرح ہم نے فرعون کی طرف موسیٰ کو پیغمبر بنا کر بھیجا تھا تمہاری طرف بھی محمد کو رسول بنا کر بھیجا ہے جو تمہارے مقابلے میں گواہی دینگے۔

اس لئے بنی اسرائیل سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اس قرآن پر ایمان لے آئیں کیونکہ اس کو مان لینے سے ان کی کتابوں کی صداقت پر مہر لگ جائیگی، اور تمام دنیا کو یقین ہو جائیگا کہ صحائف آسمانی کی پیشین گوئیاں درست ثابت ہوئیں، مخالفت کا بیج بونے والے تم نہ بن جاؤ کیونکہ تم مکا، وحی طلبۃ الہٰی کے قائل انبیاء و رسل کے سلسلہ سے واقف اور کتب

سابقہ کا علم رکھنے والے ہو، تعلیم یافتہ ہو کر تمہیں انکار کی گنجایش نہیں، ورنہ دوسرے لوگ بھی تمہارا ہی اتباع کرینگے، اور تمہارے ہی نامۂ اعمال میں ان کی غلط کاری بھی لکھی جائے گی۔

یہودی عالموں نے کبھی حق کی آواز کو لبیک نہ کہا بلکہ اپنے دنیاوی فائدوں کی خاطر برابر سچائی کو قربان کرتے رہے، حالانکہ انہیں خوب یقین تھا کہ آپ ہی وہ نبی ہیں، یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم (۲: ۱۴۱) قرآن حکیم نے بار بار اُن کی اس غلط کاری کو بیان کیا ہے کہ ایک عالم کے لئے اُس سے زیادہ بداخلاقی اور شیطنت کا تصوّر نہیں ہوسکتا، اعاذنا اللہ منہ۔

(۴۲) وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

اور صحیح میں غلط نہ ملاؤ، اور یہ کہ جان کر سچ کو چھپاؤ۔

ہر وہ چیز جو عین ضرورت کے وقت ملے، حق ہے، اور ہر غیر ضروری چیز باطل، پس یہ ارباب علم وفضل کی شان سے کس درجہ گری ہوئی بات ہے کہ قوم وملّت کو جن احکام کی ضرورت ہے ان کی طرف تو کوئی بھی توجہ نہ کرے، حالانکہ ان پر حیات قومی کا دار ومدار ہو، اور اُن امور پر زور دیا جائے جو فرعیات کا حکم رکھتے ہوں، اور پھر اسی پر قناعت نہ ہو بلکہ حق بات جاننے کے باوجود اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جائے، سچائی کو چھپانے کی کوشش ہمیشہ اس وقت کی جاتی ہے جب خود اس پر عمل نہ ہو، اس لئے لوگوں کو بھی اس سے بے خبر رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، کیونکہ اگر انہیں اس صداقت کا علم ہوگیا، اور اُنھوں نے اس پر عمل کرنا شروع کردیا تو یہ علما مورد طعن وتشنیع بنیں گے کہ باوجود جاننے کے اس پر عمل نہیں کرتے۔

عملی کمزوری

گزشتہ آیات میں ان کی علمی کمزوریوں کو واضح کیا گیا ہے، اب اُن کی عملی حالت کو

بیان کیا جاتا ہے۔

(۴۳) وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ	اور قائم کرو نماز، اور زکوٰۃ دیا کرو، اور نماز پڑھنے
وَارۡکَعُوۡا مَعَ الرّٰکِعِیۡنَ ۝	والوں کے ساتھ نماز پڑھو۔

بعض لوگوں کو جان عزیز ہوتی ہے، اور بعض کو مال، اس لئے ان سب کے جوش ایمان و ولولہ دینی کے امتحان کی خاطر نماز اور زکوٰۃ، دونوں کو لازم کر دیا گیا، اور یہ کہ سب کے ساتھ مل کر کام کرو۔

قوموں کے عروج و زوال کے جو اصولی اسباب و مراتب ہیں، ان میں بنیادی چیز یہی ہے کہ سب ایک ہو کر رہیں، اُن کی قوتوں میں اجتماع و انضمام ہو، جہاں انتشار و اختلاف ہوا، قوم برباد ہو جائیگی، اس لئے کہ علیحدہ ہونے کی صورت میں عوام الناس اور تعلیم یافتہ اشخاص میں بعد و ہجر کی خلیج حائل ہو جائیگی، تمام لوگ بغیر کسی سردار او رامیر کے رہ جائیں گے، اور اہل فضل و کمال کے پاس دماغ تو ہو گا مگر دست و بازو نہ ہونگے کیونکہ کام کرنیوالے عوام الناس ہی ہوا کرتے ہیں۔

جب کسی قوم میں تنزل و ادبار کی ابتدا ہوتی ہے تو بہترین دل و دماغ عوام سے علیحدگی اختیار کر لیتے ہیں، عام لوگوں کے ساتھ مل کر فرائض مذہبی ادا نہیں کرتے، عذر یہ پیش کرتے ہیں کہ ہم خلوت میں زیادہ اطمینان کے ساتھ ان کاموں کو انجام دے سکتے ہیں، عام لوگوں میں تہذیب نہیں ہوتی، تعلیم سے بے بہرہ ہوتے ہیں، آداب مجلس سے واقف نہیں ہوتے، اس لئے طبیعت کو سکون نصیب نہیں ہوتا آخر اس عزلت گزینی کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ ان امور کو بالکلیہ ترک کر دیتے ہیں، اور اُن کو غیر ضروری سمجھنے لگ جاتے ہیں۔

کفار قریش میں دستور تھا کہ ایام حج میں عوام الناس تو عرفات کے میدان سے واپس لوٹتے مگر یہ لوگ مزدلفہ ہی سے واپس آجاتے، اور اس طرح حدود حرم سے باہر جانے کی انہیں ضرورت محسوس نہ ہوتی، یہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی منتخب جماعت خیال

کرتے تھے، اس لئے عرفات میں جانا پسند خاطر نہ تھا، قرآن نے انہیں حکم دیا :۔

ثم افیضوا من حیث افاض الناس واستغفروا اللہ ط ان اللہ غفور رحیم ۝ (۲ : ۱۹۵)	پھر جس جگہ سے اور لوگ چلیں تم بھی وہیں سے چلو، اور اللہ سے مغفرت چاہو، اللہ بخشنے والا مہربان ہے ۔

استغفار اسی لئے کرنے کا حکم دیا کہ اس علیحدگی سے تمام قوم برباد ہوتی تھی، آیندہ اس غلطی کا ارتکاب نہ ہونے پائے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجتماعی زندگی پر سب سے زیادہ زور دیا، کہیں فرمایا: من فارق الجماعۃ، فمات فمیتہ میتۃ جاھلیۃ، جو شخص جماعت سے الگ ہوا، اور وہ اسی حالت میں مرگیا، تو اس کی یہ موت جاہلیت کی موت ہوئی، ایک جگہ فرمایا: علیکم بالجماعۃ فان الشیطان مع الفذ ۃ وھو من الاثنین ابعد، جماعت سے الگ نہ ہو، کیونکہ جب کوئی تنہا ہوا تو شیطان اس کا ساتھی ہوگیا، دو انسان بھی ملکر رہیں تو شیطان ان سے دور رہے ۔ علیکم بالسواد الاعظم، اور فانہ من شذ، شذ فی النار، اور ید اللہ علی الجماعۃ، اور لا تجتمع امتی علی الضلالۃ، مشہور احادیث، اور زباں زد خاص و عام ہیں، اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وایاکم والفرقۃ، فان الشاذ من الناس للشیطان، کما ان الشاذ من الغنم للذئب، علیحدگی سے بچو، اس لئے کہ جو الگ ہوا وہ شیطان کے قبضہ میں آگیا، جس طرح ایک بکری اگر ریوڑ سے الگ ہو جائے، تو وہ بھیڑیے کا مال ہوتی ہے ۔

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مثل المومنین فی توادھم و تعاطفھم کمثل الجسد الواحد، اذا اشتکی منہ عضو تداعی لہ سائر الجسد بالسھر بالحمی، مسلمانوں کی قومیت ایسی ہی جیسے ایک جسم اور اس کے مختلف اعضاء، ایک عضو میں درد ہو تو سارا جسم محسوس کرتا ہے، اور اس کی بے چینی اور تکلیف میں اسی طرح حصہ

لیتا ہے، جیسے خود اس کے اندر درد اٹھ رہا ہو۔ دوسری جگہ یوں ارشاد ہوا:
المسلم للمسلم کالبنیان، یشد بعضہ بعضا، ان کی مثال دیوار کی سی ہے، ہر اینٹ دوسری اینٹ سے سہارا پاتی اور سہارا دیتی ہے، ظاہر ہے کہ اینٹ کا کوئی مستقل وجود نہیں، اگر ہے تو اجتماعی، وہ دیوار کا ایک جز، اور ان اجزا کے ملنے سے مضبوط دیوار بنی ہے۔

نماز میں بھی صف بندی پر زور دیا کہ سر اور شانہ اور پاؤں ایک سیدھ میں رہیں، اور اس پر ان الفاظ میں تنبیہ کی لیسوّن صفوفکم اولیخالفن اللہ بین وجوھکم، ایک روایت میں فرمایا: سووا صفوفکم فان تسویۃ الصفوف من اقامۃ الصلوٰۃ۔ یہ تمام تصریحات صاف صاف بتا رہی ہیں کہ باہم مل جل کر رہنا اور اکٹھے ہو کر کام کرنا کس درجہ ضروری ہے، مگر افسوس مسلمان ان سب ارشادات کو فراموش کر چکے اور اب تصویر تشتت بنے ہوئے ہیں۔

انتظامی نقص

(۴۴) اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○	کیا لوگوں کو نیک کام کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھولتے ہو، اور تم کتاب پڑھتے ہو پھر نہیں سمجھتے۔

مذہب جب دعوت دیگا تو عمل کی، اس کے اوامر و احکام ایک ایسی امت پیدا کرنا چاہتے ہیں جو یکسر عمل ہو، اس لئے ہر وہ شخص جو اپنی قوت عملیہ کو فنا کر دے مذہب کے نزدیک مردود ہے، پھر ان لوگوں کی کیا حالت ہوگی جو دوسروں کو تو کام کرنے کی دعوت دیتے ہیں، مگر خود اس سے محروم محض رہتے ہیں، قرآن حکیم نے شاعروں کی ایک اصولی غلط کاری بیان کی ہے، اور وہی در اصل ان کے تمام امراض و مفاسد کی علت العلل اور بمنزلہ بنیادی پتھر کے ہے: وانھم یقولون ما لا یفعلون، (۲۶: ۲۲۶) اور ایسی باتیں کہا کرتے ہیں جو خود نہیں کیا کرتے، پھر سورۂ صف میں مسلمانوں کو تادیباً فرمایا: لم تقولون

(۳) انتظامی نقائص۔

(الف) مذہبی احکام واوامر، اور اخلاق وتہذیب کے باب میں بے انتہا کمزوری کا اظہار کرتے ہیں،

(ب) دوسروں سے جب مطالبہ کرینگے تو نہایت سختی سے۔

(ج) احتساب اعمال کا یقین نہیں، اس لئے نظم وترتیب امور کی پرواہ نہیں کرتے،

اجمال کی تفصیل

(۴۷) یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَ اَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ○

اے بنی اسرائیل! میرا احسان یاد کرو جو میں نے تم پر کیا، اور میں نے تم کو بڑا کیا جہان کے لوگوں سے،

جب بنی اسرائیل میں انبیاء ورسل کا سلسلہ برابر جاری تھا مخاطبہ ومکالمہ الٰہی کے لئے یہی لوگ مخصوص تھے، حکومت بھی ان کے پاس تھی، اس لئے اپنے زمانہ میں یہی سب سے زیادہ بزرگ وبرتر تھے۔ آبائے کرام کی اولاد میں ہونا خود ایک شرف ومجد ہے، اور یہ بہت کم خوش نصیبوں کو حاصل ہوتا ہے، مگر جس وقت انہوں نے اپنے فرائض تبلیغ ودعوت سے انحراف وتجاوز کیا، اُن پر ذلت ومسکنت طاری ہو گئی، اللہ کی رحمت بیکراں سے دور ہو گئے، اور اُن کی تمام فضیلت وبزرگی چھن گئی، ولئن کفرتم ان عذابی لشدید

تذکیر ما بعد الموت

(۴۸) وَ اتَّقُوۡا یَوۡمًا لَّا تَجۡزِیۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَیۡئًا وَّ لَا یُقۡبَلُ مِنۡہَا شَفَاعَۃٌ وَّ لَا یُؤۡخَذُ مِنۡہَا عَدۡلٌ وَّ لَا ہُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ ○

اور اس دن سے بچو کہ کوئی شخص دوسرے کی ایک ذرہ برابر بھی کام نہ آئیگا، اسکی طرف سے سفارش قبول نہوگی اور اسکے بدلہ میں کچھ نہ لینگے اور نہ انکو مدد پہنچیگی۔

چونکہ آگے چل کر بنی اسرائیل کی خرابیوں پر مفصل ومبسوط بحث ہوگی، اور اُن سے

دیانت کیا جائیگا کہ جس قوم کی تمام تر تاریخ ان سیاہ کاریوں اور بدعملیوں سے بھری ہوئی ہو، اس کے لئے اس کے سوا اور کیا فیصلہ ہو سکتا ہے کہ اُسے ہمیشہ کے لئے تخت سلطنت سے محروم کر دیا جائے، اور وہ غلاموں کی زندگی بسر کرے، اس آیت میں انہیں بتا دیا کہ حادثہ قیامت کو پیش نظر رکھیں، اور انصاف و دیانت سے جواب دیں۔

اگر ایک شخص کسی جرم کا مرتکب ہو، اور اُسے عدالت میں پیش کر دیا گیا ہو، تو سزا سے بچنے کی صرف یہی صورت ہو سکتی ہے کہ:۔

(الف) دوسرا شخص اپنے آپ کو پیش کرتا ہے کہ مجرم کو چھوڑ کر مجھ سے مواخذہ کرو،

(ب) سفارش ہو جائے اور یوں اس کی جان خلاصی پائے۔

(ج) جرمانہ اور معاوضہ ادا کر دے کہ یہ بھی نجات کی ایک شکل ہے۔

(د) یار و مددگار آ کر اپنی طاقت و قوت سے کام لیکر ملزم کو چھڑا لیں۔

مگر جن لوگوں نے حق پرستوں کی مخالفت کی، سچائی کے فنا کرنے کی فکر میں رہے، اور انکار و جحود میں زندگی بسر کی، ان کے لئے نجات کی کوئی صورت نہ ہوگی، انہیں اپنے اعمال کا آپ جواب دینا ہوگا، جس دن کی یہ کیفیت بیان کی گئی ہو کہ:۔

یوم یفر المرء من اخیہ ۝ وامہ وابیہ ۝ وصاحبتہ وبنیہ ۝ لکل امرئ منھم یومئذ شان یغنیہ ۝ (۸۱: ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷)	اس دن ایسی نفسی نفسی پڑیگی کہ آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں، اور اپنے باپ، اور اپنی جورو، اور اپنے بیٹوں سے بھاگیگا، اُن میں سے ہر شخص کو اپنی اپنی نجات کا غم ہوگا کہ وہ اسکو بس کرتا ہے۔

بھلا وہاں سوائے اعمال کے اور کون کام آسکتا ہے، دوسری جگہ فرمایا:۔

لن تنفعکم ارحامکم ولا اولادکم ۚ یوم القیٰمۃ ۚ یفصل بینکم ۚ واللہ بما تعملون بصیر ۝ (۶۰: ۳)	قیامت کے دن نہ تمہاری رشتہ داریاں ہی تمہارے کچھ کام آئینگی، اور نہ تمہاری اولاد، اس دن تم سب کو الگ الگ کر دیا جائیگا، اور جو کچھ بھی تم کر رہے ہو خدا اسے اچھی طرح دیکھ رہا ہے۔

پس جب حقیقت یہ ہو تو کسی کی خاطر جھوٹ کیوں بولا جائے۔

شفاعت

اس آیت میں شفاعت کا تذکرہ آیا ہے، اگر اس کے حسب ذیل مراتب پیش نظر ہوں، تو اس کی حقیقت خود بخود واضح ہو جائیگی۔

(الف) وجاہت، مجرم بادشاہ کے حضور میں پیش ہوتا ہے، قانوناً اُسے سزا ملنی چاہیے، مگر ایک بہت بڑا رکن سلطنت اس کی سفارش کرتا ہے، بادشاہ کو اندیشہ ہے کہ اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو سلطنت میں بہت سی خرابیوں کا موجب ہوگا، اس لیے رعب میں آکر مجرم کو چھوڑ دیتا ہے، اس کو شفاعت وجاہت کہتے ہیں، اگر کوئی شخص اللہ کی جناب میں اس قسم کا عقیدہ رکھے تو اُس کے کفرو شرک میں کس کو کلام ہو سکتا ہے، تعالی اللہ عما یقولون:

گر بہ محشر خطاب قہر کنند

انبیا را چہ جائے معذرت است؟

قیامت کو سب کی یہ کیفیت ہوگی:-

وخشعت الاصوات للرحمٰن فلا تسمع الا همسا (۲۰ : ۱۰۸)	اور مارے خوف کے خدائے رحمٰن کے آگے سب کی آوازیں بیٹھ جائیں گی، پس تو سوائے آہستہ آہستہ بات کرنے کے اور کچھ نہ سنیگا۔

لمن الملک الیوم للہ الواحد القھار (۴۰ : ۱۶) بھی اسی روز کے لئے آیا ہے، پھر کسکی وجاہت وہاں کام آسکتی ہے،

(ب) محبت، بادشاہ کا محبوب وعزیز سفارش کرتا ہے، اور وہ اس کے عشق و محبت کی بنا پر مجرم کو رہائی بخشتا ہے، کیونکہ تعمیل ارشاد نہ کرنے کی

صورت میں اسے اس کے رنجیدہ خاطر ہونے کا اندیشہ ہو،
ایسا خیال بھی جناب باری کی شان میں کفر باللہ سے کم نہیں،

وھم من خشیتہ مشفقون (۲۱ : ۲۹) | اور وہ اسکے جلال سے ہر وقت ڈرتے رہتے ہیں

(ج) اجازت، شامت اعمال سے ایک شخص نے جرم کیا، مگر اس پر نادم ہے،
بادشاہ ہی سے طالب مغفرت ہے، کسی امیر کی پناہ میں نہیں
آتا، ہر وقت اسی کی رحمت پر نظر ہے، بادشاہ اس کو معاف
کرنا چاہتا ہے مگر آئین سلطنت کے خلاف ہے، ایک امیر اسکی
مرضی پاکر سفارش کرکے اس کا قصور معاف کرا دیتا ہے، اس کو
شفاعت بالاذن کہتے ہیں، کتاب وسنت کی تصریحات اس کی
تائید میں ہیں، اور کسی کو انکار کی گنجایش نہیں،

من ذا الذی یشفع عندہ الا باذنہ میں اسی طرح اشارہ ہے، الا من
اذن لہ الرحمن وقال صوابا کا یہی مطلب ہے، اور اسی مضمون کی کثرت سے احادیث
ملیں گی، اس آیت میں جس شفاعت کا انکار کیا گیا ہے وہ اس کے لیے ہے جس کی
تمام عمر حق وصداقت کے استیصال میں گزری ہو، اور جسکی آواز ایک مرتبہ بھی سچائی کی حمایت
میں بلند نہ ہوئی ہو۔

تذکیر بالاء اللہ

(۴۹) وَإِذْ نَجَّيْنَٰكُم مِّنْ ءَالِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوٓءَ ٱلْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَآءَكُمْ ۚ وَفِى ذَٰلِكُم بَلَآءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ ○	اور ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے نجات دی، تم کو بڑی تکلیف دیتے، تمہارے بیٹے ذبح کرتے، اور زندہ رکھتے تھے تمہاری عورتیں، اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی آزمایش تھی۔
(۵۰) وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ ٱلْبَحْرَ فَأَنجَيْنَٰكُمْ	اور جب ہم نے تمہارے لیے دریا کو چیر دیا، پھر

وَاَغْرَقْنَا اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ○ | تمکو بچا دیا، اور فرعون کے لوگوں کو غرق کر دیا اور تم دیکھتے تھے۔

شاہان مصر کو فرعون کہا کرتے تھے، آل فرعون سے مراد اس کے اعوان و انصار، اتباع و مقلدین، اور اس کی قوم کے تمام افراد ہیں،

ان آیات میں فرعون کے مختلف مظالم بیان کئے گئے ہیں، ہم نے اپنی کتاب بصائر میں موسیٰ و فرعون کے واقعات پر نہایت ہی شرح و بسط سے بحث کی ہے، اور ان کے تمام اطراف و جوانب کو صاف کر دیا ہے، اس لئے یہاں اُن کے لکھنے کی ضرورت نہیں اگر تفصیل کی ضرورت ہو تو اس کو ملاحظہ کیجئے۔

بحیرہ قلزم کے شمالی کنارہ پر بنی اسرائیل کھڑے تھے، آگے سمندر تھا اور پیچھے فرعون کا لشکر، اس یاس و قنوط کے عالم میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو الہام کیا کہ وہ اپنی لاٹھی سمندر پر ماریں، عالم مثال کی قوتوں نے انہیں وقت پر مدد دی، پانی خشک ہو گیا، اور وہ لوگ اطمینان کے ساتھ پار ہو گئے، فرعون بھی اپنے لشکر سمیت سمندر میں گھس گیا، جب عین وسط میں پہنچا تو قوائے مثالیہ کے ذریعہ پھر سب طرف پانی ہی پانی دکھائی دینے لگا، اور چند لمحوں کے اندر وہ بدترین نوع انسانی اپنے اعوان و انصار کے ساتھ غرق ہو گیا۔ بنی اسرائیل دوسرے کنارہ پر کھڑے اس مسرت انگیز نظارہ کو دیکھ رہے تھے کہ وہ قوم جس نے آج تک ہم کو غلاموں کی طرح رکھا، آج بے بسی اور بے کسی کی چیخیں مار رہی ہے، مگر کوئی نہیں جو اس کی مدد کرے، فما بکت علیھم السماء والارض وما کانوا منظرین، (۴۴: ۲۸)

اس طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی تمام ان رکاوٹوں کو دور کر دیا جو انکی راہ ترقی میں مختلف اسباب کی بنا پر اس وقت پیدا ہو گئی تھیں، جبکہ فرعون کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کیلئے خود آگے بڑھنا چاہتے تھے۔

غلامی کے آثار باقیہ

(۵۱) وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓی اَرْبَعِیْنَ لَیْلَۃً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِہٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ (۵۲) ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْکُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِکَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ○	اور جب ہم نے موسیٰ سے چالیس رات کا وعدہ کیا، پھر تم نے اس کے پیچھے بچھڑا اپنا لیا، اور تم بے انصاف تھے، اس پر بھی ہم نے تم کو معاف کیا، شاید تم احسان مانو۔

جب بنی اسرائیل نجات پاکر آگے بڑھے تو اب وہ ایک آزاد قوم تھے، جن کے لئے قانون اور دستور العمل کی ضرورت تھی، ورنہ ضابطہ نہ ہونے کی وجہ سے اندیشہ تھا کہ اُن کے خیالات میں انتشار نہ پھیل جائے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ کوہ طور پر آکر چالیس روز تک اعتکاف کریں۔ سورۂ اعراف میں فرمایا:۔

وواعدنا موسی ثلثین لیلۃ و اتممنھا بعشر فتم میقات ربہ اربعین لیلۃ (۷ : ۱۳۸)	اور ہم نے موسیٰ سے تین رات کا وعدہ کیا، اور ہم نے دس راتیں اور بڑھا کر ان سے تیس کو پورا کر دیا، اور یوں پروردگار موسیٰ کا وعدہ چالیس رات کا پورا ہو گیا،

اللہ تعالیٰ کا قانون بھی یہی ہے کہ چالیس روز کے ذکر و فکر، اور استغراق کے بعد روحانی کمالات کا فتح باب ہوتا ہے، صوفیائے کرام بھی اسی لئے چلہ کشی کرتے ہیں کہ انسانی نجاستوں اور گندگیوں سے پاکیزگی اور طہارت حاصل کر کے عالم ملکوت کے فیوض و برکات حاصل کرنے کی قابلیت پیدا ہو جائے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس نصاب کو تیس روز میں پورا کر لیا، مگر آخری روز ان سے کچھ ایسی غلطی ہو گئی کہ اس کے کفارہ کے لئے دس روز اور اعتکاف کرنا پڑا، اس طرح اللہ تعالیٰ کا قانون چہل ایام برابر قایم رہا۔ اس میدان کے ہر راہ رو کے لئے اعتزال عن الناس اور علیحدگی ضروری ہوتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکالمہ الٰہی سے قبل کئی کئی روز تک غار حرا میں معتکف رہا کرتے کہ جبرئیل سے پوری مناسبت پیدا ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام تو وہاں مصروف ذکر اللہ تھے، اُن کی غیر حاضری میں بنی اسرائیل کی قوم نے سونے چاندی کا بچھڑا پوجنا شروع کردیا، اور اس کے مختلف اسباب تھے:-

(۱) یہ لوگ مصر میں قریباً چار سو سال سے مقیم تھے، مصری گائے کی پرستش کیا کرتے تھے، بنی اسرائیل نے انھیں دیکھا تو انہوں نے بھی اس کی پوجا شروع کردی، اور یہ انکی صحبت وہم نشینی کا اثر تھا۔

(۲) بنی اسرائیل مدت ہائے دراز سے مصریوں کے ماتحت زندگی بسر کر رہے تھے، فرعون نے تمام جلیل القدر عہدے اپنی قوم کے لئے مخصوص کر لئے تھے، اور ادنیٰ ترین کام اُن کے سپرد تھے، اُن کی آمدنی کے اسباب و ذرائع بند تھے، جس قدر ملتا تھا، اُن کی ضروریات کے لئے کافی نہ ہوتا تھا، اس لئے انہیں دولت کے ساتھ اُلفت و دلبستگی ہوگئی، اور یہ ہر غلام و محکوم قوم کے امتیازات میں سے ہے کہ اسے دولت سے محبت پیدا ہو، پھر یہ اُن کا امام و پیشوا ہوتا ہے، اور یہی اُن کا قبلہ معبود و کعبہ مسجود، انکی حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے:-

گر جاں طلبی مضائقہ نیست گر زر طلبی سخن دریں است

بنی اسرائیل آزاد ہو چکے ہیں، اب اُن پر کسی انسان کی حکومت نہیں، ایک اللہ کے غلام ہیں، آزاد سرزمین ہے، اور وہ ہیں، مگر غلامی کے اثرات اب تک اُن کے دل و دماغ پر حاوی ہیں، اور اُن کے رگ و پے میں جاری و ساری، جس وقت اُنھوں نے سونے چاندی کا بچھڑا دیکھا فوراً سجدہ میں گر پڑے کہ اسی کی بندگی ان کا مایہ حیات ہے، چنانچہ اُن کی آئندہ قومی زندگی میں اس قسم کے بکثرت واقعات پیش آئے جن سے یہ حقیقت بالکل واضح ہوگئی کہ اُن کا مقصد حیات صرف جمع مال و دولت تھا، ان اللہ فقیر ونحن اغنیاء اور اشتروا بایٰت اللہ ثمنا قلیلا، اسی کی موئد ہیں، صدیاں گزر گئیں مگر یہ خصوصیت

کبری اب تک یہودیوں میں علی وجہ الکمال دکھائی دیتی ہے، ان سے بڑھ کر اور کوئی قوم صاحب دولت و ثروت نظر نہیں آتی۔

(۳) جب ایک قوم ترقی کرنے لگتی ہے تو قانون نہ ہونے کی شکل میں اس سے دو قسم کی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔

(الف) افراط، روحانیت میں جائز حدود سے تجاوز کر جانا، نصاریٰ نے عبداللہ کو ابن اللہ بنا دیا،

(ب) تفریط، مادیت میں بہت دور نکل جانا، یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جو تاریخ مرتب کی ہے اس کی بہترین مثال ہے، یہی دونوں اصولی غلطیاں ہیں جن سے سورۂ فاتحہ میں پناہ مانگی گئی: غیر المغضوب علیہم ولا الضالین، یہودی تفریط کی وجہ سے ہلاک ہوتے ہیں، کیونکہ وہ سرے سے مسیح علیہ السلام کا انکار کرتے ہیں، اور عیسائی افراط میں مبتلا ہیں کہ ایک بشر کو خدا بناتے ہیں۔

یہ لوگ اس وقت دونوں غلطیوں کے مرتکب ہوتے ہیں، سونے کا بچھڑا پوجنا شروع کر دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ خداوند جو درا اوری تم درا اوری ہے اس میں حلول کر گیا ہے، بت پرست یہی خیال کرتے ہیں، پیر پرست اور قبروں کے پوجنے والے اس سے عبرت اندوز ہوں، افراط کی مثال آگے آئیگی جبکہ انہوں نے ارنا اللہ جھرۃ کہا۔

چونکہ ان کے پاس کوئی قانون نہ تھا، خود حضرت موسیٰ علیہ السلام اسی کی خاطر جبل طور پر سر بزانو معتکف تھے، اِس لئے ہم نے درگذر کیا کہ آیندہ اس کے مرتکب نہ ہوں، اور قانون ملنے پر اپنی قوتوں کو صحیح مواقع میں صرف کریں،

تورات کا نزول

(۵۳) وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ	اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور حجت دی کہ

لعلکم تھتدون (۵۳) واذ قال موسٰی لقومہ یقوم انکم ظلمتم انفسکم باتخاذکم العجل فتوبوا الی بارئکم فاقتلوا انفسکم ط ذٰلکم خیر لکم عند بارئکم ط فتاب علیکم ط انہ ھو التواب الرحیم ۰

شاید تم راہ پاؤ۔ اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا، اے قوم! تم نے بچھڑا بنا کر اپنا نقصان کیا، اب اپنے پیدا کرنے والے کے حضور میں توبہ کرو، اور اپنی جان مار ڈالو، تمہارے خالق کے نزدیک تمہارے حق میں یہی بہتر ہے، پھر وہ تمہاری جانب متوجہ ہوا، بیشک وہی معاف کرنے والا مہربان ہے۔

فرقان اس قوت کو کہتے ہیں جس سے حق و باطل، نیک و بد اور اسلام و کفر میں تمیز ہو، ہر کتاب الٰہی کے نزول سے قبل لوگوں میں ایک قوی احساس پیدا کر دیا جاتا ہے، وہ اپنے روزمرہ کے اعمال کو دیکھتے ہیں تو معلوم کرتے ہیں کہ ان میں بہت زیادہ اصلاح و تہذیب کی ضرورت ہے، اپنے آپ کو کسی مصلح اور ریفارمر کا محتاج سمجھتے ہیں، حق کے لئے اُن کے اندر تشنگی پیدا ہوتی ہے، اور اب وہ اس چشمۂ آب کی تلاش میں نکلتے ہیں جو اُن کی پیاس کو دور کر دے، اگر فرقان پہلے سے نہ پیدا کر دیا جائے تو کتاب بیکار ثابت ہوتی ہے، کیونکہ جب لوگ ضرورت اصلاح ہی محسوس نہیں کرتے تو انہیں اس کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، اگر پیاس نہ ہو تو کتنے ہی برف سے ٹھنڈے کئے ہوئے گلاس بھر بھر کر پیش کیجیے کسی کی نگاہ بھی نہ اُٹھے گی، جب بھوک نہیں تو کھانے کی ہر چیز بیکار ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

ان الامانۃ نزلت فی جذر قلوب الرجال فعلموا من الکتاب وعلموا من السنۃ

لوگوں کے سویدائے قلب میں امانت کا نزول ہوا، اس لئے اُنہوں نے کتاب و سنت کی تعلیم حاصل کی، اور اُن سے بہرہ اندوز ہوئے۔

اس میں امانت سے مراد یہی فرقان ہے جو ہر نبی کی بعثت سے قبل نازل ہوتا ہے، اور جس کی وجہ سے لوگ نبی کے لئے یکسر انتظار بن جاتے ہیں، رسول اللہ کی بعثت

سے قبل عرب میں اس قسم کے لوگ موجود تھے جو دین جاہلیت کو چھوڑ کر یہ خبریں دیا کرتے تھے کہ عنقریب ایک رسول ظاہر ہونے والا ہے جو ابلیس اور اُس کے لشکر پر غالب ہوگا، اُن اشخاص میں عثمان بن حریث، عبید، زید بن عمرو اور ورقہ بن نوفل کے نام خصوصیت سے مشہور ہیں، زید بن عمرو تو وہ بزرگ ہیں جنہوں نے رسول موعود کی تلاش میں دور دُور کے سفر کئے، اور آخر یہ معلوم کرکے کہ وہ مکہ میں پیدا ہونگے، اسی مبارک انتظار میں وہ کر انتقال کر گئے، یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے چچا تھے۔

بیان فرقان سے مراد وہی تشنگی ہے جو بنی اسرائیل میں قانون الٰہی کے لئے پیدا کردی گئی تھی، بعض لوگوں نے اس سے نجات موسیٰ اور تباہی فرعون بھی مراد لی ہے، مگر بعد کی آیت پہلے معنی کی زیادہ موید ہے، ہر نبی کے ساتھ دونوں چیزیں نازل کی جاتی ہیں، چنانچہ موسیٰ کو بھی نوازش کی گئیں تاکہ بنی اسرائیل راہ حق اپنے سامنے دیکھ لیں، اور آیندہ کسی غلط کاری کے مرتکب نہ ہوں۔

گزشتہ آیت میں بیان کیا گیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ غیبت میں ان لوگوں نے بچھڑا پوجنا شروع کر دیا مگر اللہ تعالےٰ نے ان سے عفو و درگزر کیا، مگر اس جگہ یہ نہیں بتایا تھا کہ معاف کرنے کی صورت کیا ہوئی، اس آیت نے اس اجمال سے پردہ اُٹھا دیا، اور بتایا کہ موسیٰ نے آکر انھیں ان لوگوں کے قتل کرنے کا حکم دیا جو سب سے زیادہ اس بدکرداری میں حصہ لینے والے تھے، چونکہ ان میں حق و باطل کی تمیز پیدا ہو چکی تھی، اور انہوں نے اس حقیقت کو معلوم کرلیا تھا کہ ہم نے بدترین غلطی کا ارتکاب کیا ہے، اس لئے وہ قتل کرنے پر آمادہ ہوگئے، حالانکہ وہ ان کے عزیز و قریب ہی تھے، یہ آمادگی فرقان کا نتیجہ تھی، ورنہ یاد رکھیے مشرک قومیں جن کے رگ و پے میں بت پرستی اثر کر چکی ہو، اور ان کی فطرۃ ثانیہ بن گئی ہو کبھی اپنے آپ کو فنا کرنے کے لئے تیار نہ ہونگی کیونکہ وہ اسی کو حق خیال کرتی ہیں، اور انہیں اصلاح کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔

جب اللہ تعالیٰ نے ان کی آمادگی کو دیکھ لیا، تو اُن کو لطف و نوازش سے معاف کردیا کہ شروع میں اس قسم کی غلطیاں ہوجانا بعید نہیں۔

افراط کا ارتکاب

(۵۵) وَإِذْ قُلْتُمْ يَٰمُوسَىٰ لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَى ٱللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ ٱلصَّٰعِقَةُ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ (۵۶) ثُمَّ بَعَثْنَٰكُم مِّنۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ	اور جب تم نے کہا اے موسیٰ! ہم تیرا یقین نہ کرینگے جب تک اللہ کو سامنے نہ دیکھیں، پھر بجلی نے تم کو آلیا، اور تم دیکھتے تھے، پھر تمہارے مرنے کے بعد ہمنے تمکو دوبارہ زندہ کردیا شاید تم شکرگزاری کرو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام توراۃ لینے کے لئے کوہ طور پر گئے تو اپنے ساتھ بنی اسرائیل میں سے بہترین دل ودماغ کا انتخاب کیا، اور ان میں سے ستّر اشخاص کو اپنے ساتھ لیتے گئے مگر انہوں نے صاف کہہ دیا کہ جب تک ہم ان آنکھوں سے کھلم کھلا خدا کو نہ دیکھ لیں گے تمہاری کبھی تصدیق نہ کرینگے، چونکہ انہوں نے بے انتہا گستاخی سے کام لیا، اور موسیٰ کی رسالت پر ایمان لانے سے انکار کردیا حالانکہ وہ بکثرت نشانات دیکھ چکے تھے، اس لئے صاعقہ حق نے ان کو آلیا، اور ان پر بیہوشی طاری ہوگئی۔

تمام محققین کا اتفاق ہے کہ صاعقہ سے موت نہیں ہوتی، اس سے انسان بیہوش ہوجاتا ہے البتہ اگر وقت پر خبر نہ لی جائے تو اس کی موت کا باعث ہوجائیگی، جب سب پر غشی طاری ہوگئی تو موسیٰ علیہ السلام سخت پریشان ہوئے، انہیں اس امر کا اندیشہ ہوا کہ اگر یہ لوگ مرگئے تو قوم بغیر کسی نگران کار و محافظ کے رہ جائیگی، جب کام کرنے والے دماغ نہ رہیں گے تو قوم خود بخود فنا ہوجائیگی، اس لئے انہوں نے والہانہ و مضطربانہ دعا کی۔

واختار موسی قومه سبعين رجلا لميقاتنا ج فلما اخذتهم الرجفة قال رب لو شئت اهلكتهم من قبل واياى ط اتهلكنا	اور موسیٰ نے ہمارے وعدے پر حاضر لانے کیلئے اپنی قوم میں سے ستر آدمی منتخب کئے، پھر جب ان کو زلزلہ نے آلیا تو موسیٰ نے عرض کیا کہ اے میرے

بما فعل السفہاء منا ج (۷: ۱۵۴)	پروردگار! اگر تو چاہتا تو مجھ سمیت ان لوگوں کو پہلے ہی سے ہلاک کر دیتا، ہم میں سے جو لوگ احمق ہیں وہ ایک حرکت کر بیٹھے کیا اس کی پاداش میں تو ہم کو ہلاک کئے دیتا ہے؟

قرآن کریم نے غشی اور بیہوشی کی حالت کو موت سے تعبیر کیا ہے، قرآن میں موت کا لفظ حسب ذیل معانی پر استعمال کیا گیا ہے :-

(۱) حقیقی موت، انک میت وانہم میتون، (۳۹ : ۳۱)

(۲) کفر وجمود اور فنائے حس وبیداری، انک لا تسمع الموتی ولا تسمع الصم الدعاء اذا ولوا مدبرین، (۲۷ : ۸۲)

(۳) زمین کی قوت نباتی کے مردہ ہونے پر، واللہ الذی ارسل الریح فتثیر سحابا فسقنہ الی بلد میت فاحیینا بہ الارض بعد موتہا کذلک النشور ۰ (۳۵ : ۱۰)

اس بیہوشی سے اللہ تعالیٰ نے ان کو نجات دی، اور دوبارہ ان کے اندر احساس پیدا ہو گیا، تا کہ پھر اس غلط کاری میں مبتلا نہ ہوں اور کام کریں۔

سپاہیانہ زندگی

(۵۷) وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى كُلُوا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۰	اور ہم نے تم پر ابر کا سایہ کیا، اور تم پر من و سلویٰ اُتارا، (ہم نے کہا) جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تم کو دی ہیں اُن کو کھاؤ، اور ہمارا کچھ نقصان نہ کیا بلکہ اپنا ہی نقصان کرتے رہے۔

افراط و تفریط کے بعد اب توراۃ نے بنی اسرائیل کے لئے راہ توسط و اعتدال قایم کر دی، اور ان کو ارض مقدس کی حکومت کے لئے تیار کرنا شروع کیا، ترقی کا اولین زینہ ہے سادہ اور سپاہیانہ زندگی، تمام قوم میں سپاہیانہ جذبات ہوں، روزمرہ کی

ضروریات بالکل مختصر اور معدودے چند ہوں، جنگ میں اسی پر کامیابی کا دار و مدار ہے،
اس لئے سب سے پہلے ان کو اسی زندگی کے لئے تیار کیا گیا، ان کی مثال ایک فوج کی تھی
جو جنگ کے لئے تیار ہو رہی ہو، اس لئے ان کی تمام ضروریات قدرت خود بخود پورا
کر دیتی تھی انھیں کسی قسم کی تکلیف برداشت نہ کرنی پڑتی تھی اور وہ ضرورتیں نہایت ہی
مختصر تھیں، جنگل میں دھوپ سے بچنے کے لئے سایہ اور کھانے کے واسطے گوشت،
چنانچہ ان کو سب کچھ میسر تھا، مگر ضرورت تھی ان کو قانون کا پابند بنانے کی، اس لئے یہ
دستور العمل بنا دیا گیا کہ جب ہر قسم کی ضرورت خود بخود پوری ہو جاتی ہے، اور اللہ تعالیٰ
نے اس کا ذمہ لے لیا ہے تو کل کے لئے ذخیرہ نہ رکھنا۔

غلامی سے ابھی ابھی نجات حاصل کی تھی، اس کے جراثیم دور نہیں ہوئے تھے،
اس لئے قانون کی پروا نہ کی، اور دوسرے روز کے لئے جمع کرنا شروع کر دیا، مگر اس
حرکت سے خدا کا تو کیا نقصان ہوتا خود اپنا ہی بگاڑا۔

شہر کا داخلہ

(۵۸) وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُولُوا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ ۚ وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ (۵۹) فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَنزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ	اور جب ہمنے کہا اس شہر میں داخل ہو، اور جہاں چاہو اس میں کھاتے پھرو بافراغت، اور دروازہ میں سجدہ کرکے داخل ہو، اور کہو گناہ بخش تاکہ ہم تمہاری تقصیریں بخش دیں، اور نیکی کرنیوالوں کو اور زیادہ دینگے، پھر بے انصافوں نے بات بدل لی، اسکے سوا جو کہی گئی تھی، پھر بے انصافوں پر ہمنے انکی نافرمانی پر آسمان سے عذاب اُتارا۔

اب تک یہ لوگ جنگلوں کی زندگی بسر کرتے تھے، جہاں ایک طرف تو ضروریات
حیات نہایت ہی قلیل اور مختصر تھیں، دوسری طرف نو حش و منہیات اور حرام کاری کے

سامان بھی نایاب تھے، ایک مدت تک جنگل میں رہنے کے بعد ان کے دل میں خود بخود شہری زندگی کی آرزو پیدا ہوئی، انہیں اجازت تو دی گئی، مگر ساتھ ہی ان سے کہہ دیا گیا کہ وہاں شہوت پرستی اور بدکاری کے دواعی بہت کثرت سے ملیں گے اس لئے بچتے رہنا، قانون کی خلاف ورزی نہ کرنا، اور گناہوں سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا کہ وہی ہر قسم کی آلائشوں اور ناپاکیوں سے پناہ میں رکھنے والا ہے، اس کی رسی ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ جب شہر میں داخل ہو تو کمال اطاعت و فرماں برداری کا خیال دل میں ہو۔ مگر داخل ہوتے ہی ان سے ضبط نہ ہو سکا، اور بدکاری شروع کر دی، زنا کے مرتکب ہوئے، چنانچہ اس کی پاداش میں ان پر عذاب نازل ہوا اور ہزاروں تباہ ہوئے[۱]۔

شہر میں داخل ہوتے وقت انہیں دو باتوں کا حکم دیا گیا تھا:۔

(۱) ادخلوا الباب سجدا، بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ تھا کہ سجدہ کرتے ہوئے شہر میں جاؤ، مگر ظاہر ہے کہ یہ معنی کسی طرح بھی درست نہیں معلوم ہوتے، ایک شخص کے لئے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ سجدہ بھی کرے اور آگے بھی بڑھتا جائے، اس سے بہتر صاحب مدارک کی رائے ہے وہ فرماتے ہیں:۔

امروا بالسجود عند الانتہاء	اللہ کا شکر ادا کرنے، اور تواضع و انکساری کے اظہار

---

[۱] یہ شہر سطیم معلوم ہوتا ہے۔ اس کے متعلق حسب ذیل آیات ملاحظہ ہوں:۔

"سو اسرائیل سطیم میں مقیم ہوئے، اور لوگوں نے موآبیوں کی بیٹیوں سے حرام کاری شروع کی، انہوں نے اپنے معبودوں کی قربانیوں پر لوگوں کی دعوت کی، سو لوگوں نے کھایا، اور ان کے معبودوں کو سجدہ کیا، اور اسرائیلی بعل فغور سے ملے، تب خداوند کا قہر بنی اسرائیل پر بھڑکا۔" (گنتی، ۲۵: ۱ و ۲ و ۳) یہ قہر کیا تھا؟ اس کی تفسیر اگلی آیتوں میں کی گئی ہے:۔

"اور اس مرد کے پیچھے خیمہ میں گھسا، اور ان دونوں کو اسرائیلی مرد اور اس عورت کے پیٹ کو چھیدا، تب بنی اسرائیل میں سے وبا جاتی رہی، وہ جو اس وبا میں مرے چوبیس ہزار تھے۔" (گنتی، ۲۵: ۸ و ۹)

الی الباب شکراللہ تعالیٰ و تواضعالہ | کے لئے انہیں حکم دیا گیا کہ دروازہ پر پہنچکر سجدہ کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ جب آپ سفر سے واپس تشریف لاتے تو شہر میں داخل ہونے سے قبل دو رکعت نماز پڑھ لیا کرتے۔ اگر اس روایت کو پیش نظر رکھ لیا جائے تو یہ معنی اقرب الی الفہم معلوم ہوتے ہیں،

لیکن جو معنی ہم نے اختیار کئے ہیں وہ بھی بالکل صاف ہیں، وہ گاؤں سے نکلکر شہر میں آرہے ہیں، جہاں شہوت پرستی کے اسباب کثرت سے ملتے ہیں، جنگل میں خواہشات نفسانی پورا کرنے کا انہیں کوئی موقع نہ تھا، اس لئے انہیں حکم دیا گیا کہ شہر سے باہر دو رکعت نماز پڑھ لینا، اور شہر میں داخل ہوتے وقت تمہارے سر اللہ کے حکم کے آگے جھکے رہیں، خلاف ورزی کا خیال بھی نہ آنے پائے، ورنہ برباد ہو جاؤ گے۔

(۲) قولوا حطۃ ای حط عنا خطایانا، ہماری خطاکاریاں معاف کر دی جائیں۔ یعنی انہیں استغفار کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔

بنی اسرائیل نے ان دونوں حکموں کی پروا نہ کی، زنا کے مرتکب ہوئے، پھر گناہوں میں مبتلا ہونے کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ شریعت کے احکام واوامر کی عزت انکے دلوں سے جاتی رہتی، اور وہ ان کو تمسخر واستہزا کی نگاہ سے دیکھتے، چنانچہ اُنہوں نے ایسا ہی کیا، اور شریعت کے حکموں پر تمسخرانہ انداز میں نکتہ چینی شروع کر دی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے تمسخر واستہزا کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے:۔

قیل بنی اسرائیل ادخلوا الباب سجدا و قولوا حطۃ فدخلوا یزحفون علی استاھھم فبدلوا و قالوا حطۃ حبۃ فی شعرۃ۔	بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا کہ شہر کے دروازہ میں جھک کر گھسو، اور زبان سے حطۃ کہتے جاؤ، اُنہوں نے کیا، سُرین کے بل گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے، اور حطۃ کے بدلے حبۃ فی شعرۃ (دانہ بالی کے اندر) کہنے لگے۔

یہ ان کے تمسخر کی انتہا تھی کہ شرعی احکام کی ذرہ برابر بھی عزت ان کے دلوں میں

نہیں ہے۔ جب انہوں نے شریعت کے ساتھ استخفاف کیا، اور گناہوں میں مبتلا ہوئے تو خدا کے غضب نے انہیں آلیا، اور خود دنیا میں انہیں دکھا دیا کہ نافرمانی کی یہ سزا ہوا کرتی ہے۔

پانی کی تلاش

(۶۰) وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِب بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۖ فَانفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۖ كُلُوا وَاشْرَبُوا مِن رِّزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی مانگا تو ہمنے کہا اپنے عصا کو پتھر پر مارو، پھر اس سے بارہ چشمے بہہ نکلے، ہر قوم نے اپنا اپنا گھاٹ پہچان لیا، ہمنے کہا اللہ کی روزی سے کھاؤ اور پیو، اور ملک میں فساد پھیلاتے نہ پھرو۔

شہر میں وبا پڑی، اور ہزاروں مر گئے، تو تنگ آکر پھر انہوں نے جنگل کی راہ لی، یہاں پانی کا نام ونشان نہ تھا، آخر سب نے ملکر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شکایت کی، چنانچہ انہوں نے دعا کی تو حکم ہوا کہ پتھر پر لکڑی مارو، لکڑی کا لگنا تھا کہ بارہ قبائل کے لئے بارہ چشمے بہہ گئے، انہیں اب بھی ہر چیز بغیر کسی زحمت کے مل جاتی تھی، اس لئے انہیں حکم دیا گیا کہ قانون کے پابند رہ کر ان چیزوں کو کام میں لائیں اور بے راہ روی اختیار نہ کریں۔

مگر وہ ایک مرتبہ شہری زندگی کو دیکھ چکے تھے، تمدن وعیش پرستی، اور آرام وآسائش کے جس قدر سامان شہروں میں میسر آسکتے تھے، دیہات میں ان کا عشر عشیر بھی ملنا ناممکنات سے تھا، اب وہ کس طرح اس سادہ زندگی پر قناعت کرتے، آخر ان سے نہ رہا گیا، آگئے اور موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی:۔

(۶۱) وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَىٰ لَن نَّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنبِتُ الْأَرْضُ مِن بَقْلِهَا وَقِثَّائِهَا وَفُومِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ۖ قَالَ

اور جب تم نے کہا اے موسیٰ! ہم ایک کھانے پر صبر نہ کرینگے، پس اپنے پروردگار سے ہمارے لئے دعا کرو وہ ہمارے لئے اس چیز کو نکالدے جو زمین میں اُگتا ہے، مثلاً ساگ اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز

أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَىٰ بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ ۚ اهْبِطُوا مِصْرًا فَإِنَّ لَكُمْ مَا سَأَلْتُمْ ۗ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ ۗ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ○

موسیٰ نے جواب دیا کہ کیا تم ایک بہتر چیز کے بدلے میں ادنیٰ چیز کو لینا چاہتے ہو، کسی شہر میں چلے جاؤ جو تم مانگتے ہو، وہ تم کو وہاں ملجائیگی، اور ان پر خواری و بینوائی ڈالدی، اور اللہ کا غصہ کما لائے، یہ اسلئے کہ وہ اللہ کا حکم نہ مانتے تھے، اور نبیوں کا ناحق خون کرتے تھے، یہ اسلئے کہ وہ بے حکم تھے اور حد میں نہ رہتے تھے

بنی اسرائیل کو ارض مقدس پر حملہ کرنے کے لیے تیار کیا جا رہا تھا، اس کے لیے ضرورت تھی سپاہیانہ زندگی کی، اب جو انہوں نے اپنے مطالبات پیش کیے تو موسیٰ علیہ السلام نے انہیں سمجھایا کہ تمہارے لیے یہی بہتر ہے، جن چیزوں کی تمہیں تلاش ہے ان سے تمہاری بدویانہ زندگی کو نقصان پہنچیگا، مگر جب وہ کسی طرح نہ مانے تو ان سے کہدیا گیا کہ یہ چیزیں شہر میں مل سکتی ہیں، وہاں جاکر کاشتکاری کرو، شہری زندگی کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ ان میں کاہلی اور سستی پیدا ہوتی، چنانچہ ان کے قوائے عملیہ آہستہ آہستہ بیکار ہوتے چلے گئے، اور آخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ ان پر ذلّت و مسکنت طاری کردی گئی۔

اس آیت میں چند باتیں بیان کی گئی ہیں جن میں سے ایک دوسری کے لیے علّت اور سبب بن رہی ہے، سب سے پہلے فرمایا کہ ان پر ذلت و مسکنت طاری کردی اور اللہ کے غضب میں آگئے، یہ مصائب اس لیے نازل ہوئے کہ وہ کفر بآیات اللہ اور قتل انبیاء کے مرتکب ہوتے تھے، ان امراض کے اسباب یہ تھے کہ ان کے اندر عصیان و عدوان کی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ اب ان میں سے ہر ایک کی تفصیل ملاحظہ ہو:۔

ذلت، قرآن نے خود دوسری جگہ اس کی تفسیر کردی ہے فرمایا:۔

ضربت علیهم الذلة این ما ثقفوا الا بحبل من الله وحبل من الناس، و

جہاں دیکھو ذلت ان کے سر پر سوار ہے مگر اللہ کے عہد و پیمان کے ذریعہ سے، نیز لوگوں کے عہد و پیمان

وباءو بغضب من اللہ وضربت علیھم المسکنۃ (۳ : ۱۰۸)	کے ذریعہ سے اور خدا کے غضب میں گرفتار اور محتاجی ہر کہ الگ ان کے سر پر پڑی ہے۔

یہاں ذلت کے معنی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتے کہ وہ دوسروں کے محکوم رہینگے، اور کبھی ان کو حکومت نہ ملیگی، خازن میں ہے الذلۃ الجزیۃ یعنی ذلت کا مفہوم یہ ہے کہ دوسروں کی حکومت میں رہیں اور ان کو جزیہ یعنی ٹیکس ادا کریں۔ آل عمران کی اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں :۔

ذلتھم انک لا تری فی الیھود ملکا قاھرا ولا رئیسا معتبرا بل ھم مستضعفون فی جمیع البلاد۔	ان کی ذلت یہ ہی کہ نہ تو ان میں کوئی زبردست صاحب تاج وتخت ہی، اور نہ صاحب اثر ونفوذ رئیس، بلکہ ہر جگہہ ضعیف وکمزور ہی رہتے ہیں۔

ان تمام تصریحات سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ ذلت، غلامی ومحکومی کے مرادف ہی۔ [illegible] کی رائے یہ ہے کہ اس سے بھی مراد جزیہ ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ یہودی [illegible] دوسرے لوگ نہ ہوں مگر وہ فقر وتنگدستی ہی کا اظہار کریگا، امام راغب اصفہانی کی رائے ہے کہ وہ کیسے ہی صاحب جاہ وثروت ہوں مگر رعب وہیبت ان سے کوسوں دور رہا گئی ہے۔

کفر بآیات اللہ، اللہ تعالے کے احکام کی نافرمانی، اس کی آیات کا انکار، اور اس کے [illegible] نادات کے ساتھ تمسخر واستہزاء۔

قتل انبیاء، نبیوں کو قتل کرتے تھے، یہ یہودیوں کی خصوصیت بیان کی گئی ہی، وہ [illegible] مرتکب کیوں ہوتے تھے ؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے سے قبل پہلے [illegible] ہے کہ نبی کی بعثت کس لئے ہوتی ہے، قرآن حکیم نے کہا :۔

ولقد ارسلنا موسی بآیتنا ان اخرج قومک من الظلمت الی النور (۱۴ : ۵)	اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دیکر بھیجا کہ اپنی قوم کو اندھیروں سے نکالکر نور میں لے آؤ۔

سورۂ اعراف میں مختلف پیغمبروں کا ذکر کیا اور ان کی دعوت کا مقصد اصلی بیان کیا: یقوم اعبدوا اللہ مالکم من الہ غیرہ ؕ (۷: ۱۰۷) کہ اللہ کے سوا تمام معبودان باطل کی غلامی سے انکار کرو، اگر ان تمام آیات کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو مستقل رسالہ بن جائے، بہرحال ان تصریحات سے واضح ہوجاتا ہے کہ ہر نبی کی زندگی کا مقصد وحید اپنی امت کی اصلاح و تجدید ہوتی ہے، وہ اپنے ساتھ ایک تحریک لیکر آتا ہے، اسکو کامیاب بنانے کے لئے اپنی تمام سعی و کوشش وقف کر دیتا ہے، اسے اپنی جان کی پروا نہیں ہوتی، مخالفین اگر اس کی زندگی کے درپے ہوتے ہیں تو اس لئے نہیں کہ انہیں اس کے خون اور گوشت کے ساتھ دشمنی ہوتی ہے بلکہ اس لئے کہ اس کے وجود سے وہ تحریک قایم ہے، اگر اس کو جان سے مار ڈالینگے تو ضرور وہ تحریک بھی فنا ہو جائیگی، یہودیوں نے جو اپنے انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا تو صرف اس لئے کہ وہ ان کی غلط کاریوں پر متنبہ کرتے تھے، اور ان کی اصلاح کے آرزو مند، یہ لوگ اس غلط گمان میں مبتلا تھے کہ اگر ہم نے ان کو مار ڈالا تو یہ سلسلہ اصلاح و تجدید بھی ان کے ساتھ ہی فنا ہو جائیگا۔

پس یہ حقیقت اب کسی دلیل کی محتاج نہ رہی کہ نبی کا جان سے مار ڈالنا اور اسکی تحریک کا فنا کر دینا، دونوں ایک ہی ہیں، اگر ایک شخص نبی کا نام تو عزت و تکریم سے لیتا ہے مگر اس کے طریق عمل کو مٹا رہا ہے تو یہ بھی قتل نبی کا مرتکب ہو رہا ہے، اور حدیث کی یہ وعید اس کے لئے تازیانہ عبرت کا کام دیتی ہے، امام احمد اپنی مسند میں عبداللہ بن مسعود سے روایت کرتے ہیں:۔

اشد الناس عذابا رجل قتلہ نبی او قتل نبیا، او امام ضلالۃ او ممثل من الممثلین	اشد شدید عذاب کا مستحق وہ شخص ہے جسکو نبی نے قتل کیا، یا اس نے نبی کو قتل کیا، یا جاہل اور گمراہ امام جسکی وجہ سے لاکھوں انسان گمراہ ہوں، یا وہ شخص جو جاندار کی تصویر کھینچتا ہو۔

نبی کی سنت کا زندہ کرنا خود اس رسول کو زندہ کرنا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:۔

من احیا سنتی فقد احیانی، و من احیانی کان معی فی الجنۃ	جس نے میری سنت کو زندہ کیا اُس نے مجھے زندہ کیا، اور جس نے مجھے زندہ کیا وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:۔

یا بنی وذلک من سنتی، ومن احب سنتی فقد احبنی، ومن احبنی کان معی فی الجنۃ	بیٹا! یہ میری سنت ہے، اور جس نے میرے طریق عمل سے دوستی رکھی وہ مجھے محبوب رکھتا ہے، اور مجھ سے دوستی رکھنے والا میرے ساتھ جنت میں ہوگا۔

بیہقی نے کتاب الزہد میں روایت کیا:۔

من تمسک بسنتی عند فساد امتی فلہ اجر مائۃ شہید	جب امت میں فتنہ وفساد ہوا اور ایک مسلمان میری سنت سے تمسک واعتصام کرے تو اس کو سو شہیدوں کا ثواب ملیگا۔

یہ تمام روایات ببانگ دہل اعلان کرتی ہیں کہ نبی کی سنت کا زندہ کرنا خود اس نبی کو زندہ کر دینا ہے۔

عصیان وعدوان، اس کے عام معنی تو نافرمانی ہی کے ہیں، مگر اس کا ایک اور مطلب بھی بیان کیا جاتا ہے، مذہب کے جس قدر احکام ہیں ان کی ایک تو صورت ہوتی ہے جس کی پابندی ہر شخص کو کرنی پڑتی ہے، مگر ایک روح اور حقیقت بھی ہوتی ہے جو اس صورت کی پابندی سے پیدا کی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہر مسلمان صاحب استطاعت عید اضحیٰ کے ایام میں قربانی کیا کرے پھر سورۂ حج میں اس کی حقیقت پر بھی روشنی ڈالدی کہ لن ینال اللہ لحومھا ولا دماءھا ولکن ینالہ التقوی منکم (۲۲: ۳۸) گوشت اور خون میں سے خدا کے پاس کوئی چیز نہیں جاتی بلکہ اس کا مقصد اصلی تو جذبہ ایثار و

فدویت کا پیدا کرنا ہے اور بس، حج سے فراغت کے بعد فرمایا کہ یہاں پر آکر لوگ دو
قسم کے ہو جاتے ہیں ایک وہ جنہیں صرف دنیا اور اس کی جاہ و منزلت مطلوب تھی اور
یہ لوگ ملک و ملت کے لئے بیکار ہوتے ہیں، دوسرے وہ ہیں جن کی نظر دنیا اور آخرت
دونوں پر ہوتی ہے، اصل میں کام کرنے والے یہی ہیں، فمن الناس من یقول ربنا
اتنا فی الدنیا وما له فی الاخرة من خلاق ○ ومنهم من یقول ربنا اتنا فی الدنیا
حسنة وفی الاخرة حسنة وقنا عذاب النار (۲: ۱۹۶و۱۹۷) ان آیتوں میں
وہی تقسیم بیان کی گئی ہے جس کا ہم نے تذکرہ کیا ہے۔

شریعت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ چند اخلاق فاضلہ قوم میں پیدا ہوں مگر اُن کے لئے
بعض اعمال کا پابند بننا ضروری ہوتا ہے ورنہ وہ حقیقت پیدا نہیں ہو سکتی،
جب کسی قوم میں تنزل شروع ہوتا ہی تو سب سے پہلے وہ اعمال کی روح
حقیقت کو کھو بیٹھتی ہے اور صرف ظاہری شکل و صورت پر زور دیتی ہے، اس کو عبادت
سمجھتے ہیں لیکن اس عدوان کا انتہائی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اعمال کو بھی غیر ضروری سمجھ
لیتے ہیں، جو باقی تھے، اس لئے کچھ مدت کے بعد احکام و اوامر کا ترک شروع ہو جاتا ہے اور
لوگ شریعت کی پابندی کا خیال نہیں کرتے، اس کا نام عصیان ہے۔

عصیان و عدوان کے امراض جب حد سے بڑھ جائیں اور اعمال مذہبی سے بعد
اپنے کمال پر پہنچ جائے تو ان لوگوں کی قدر و قیمت جاتی رہتی ہے جن کے
ذریعہ سے شریعت نوازش ہوتی تھی، اُن کے ساتھ تمسخر و استہزا کیا جاتا ہے، ان
کو حقیر و ذلیل خیال کرنے لگ جاتے ہیں، اور اگر ذرا انہوں نے حق و صداقت کے لئے آواز
بلند کی تو چونکہ وہ پہلے ہی سے ادنیٰ سمجھے جاتے تھے، ان کو قتل کیا جاتا ہے، اور
پھر اس کی آخری منزل اللہ کی آیتوں کا انکار کرنا ہے، جس کے بعد ذلت اور رسوائی
ہی اور غضب الٰہی۔

(حاشیہ صفحہ ۱۴۱ پر ملاحظہ ہو)

رفع اشتباہ

گزشتہ آیات سے معلوم ہو گیا کہ یہودیوں کی غلامی و محکومی کا دائمی فیصلہ ہو چکا ہے، اب یہ کبھی حکومت سے سرافراز نہ ہونگے، بلکہ ہمیشہ ماتحت ہی رہیں گے، اس سے یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ اگر ان میں بعض افراد اچھے ہوں تو پھر بھی حکومت انہیں کو ملنی چاہیئے، کیونکہ ذلت و مسکنت اجتماعی حیثیت سے نازل ہوئی ہے نہ کہ انفرادی اعتبار سے، اس کا جواب اس آیت میں دیا جاتا ہے کہ:-

(۶۲) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ	بیشک وہ لوگ جو مسلمان ہوئے، اور جو یہودی ہوئے،
هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ	اور نصاریٰ اور صابئین، جو کوئی ان میں سے اللہ پر
بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ	اور پچھلے دن پر یقین لایا، اور نیک کام کیا، تو انکی

(حاشیہ صفحہ ۱۴۰) ۵ اس آیت میں یہودیوں کی چند خرابیاں ذکر ہوئی ہیں (۱) عدوان (۲) عصیان (۳) قتل انبیاء (۴) کفر بآیات اللہ۔ مسلمان اس آیت کو سرسری نظر سے دیکھکر آگے نہ گزر جائیں بلکہ اپنے گریبان میں منہ ڈالکر دیکھیں کہ ان میں سے کونسی خرابی ہے جو ان پر صادق نہیں آئی، کیا عصیان و عدوان سے وہ اپنے آپ کو پاک سمجھتے ہیں، اکثر افراد ارکان مذہبی کو غیر ضروری خیال کرتے ہیں، جو پابند ہیں وہ روح و حقیقت سے بے خبر ہیں، صرف لکیر کے پیچھے چلے جا رہے ہیں، کس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو مردہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے گویا دوسرے الفاظ میں رسول اکرم کے قتل کے درپے ہیں، پھر کفر بآیات اللہ تو اس کا لازمی اور قطعی نتیجہ ہی جب نوبت یہاں تک آگئی تو یہودیوں کو ان حرکات کا جو صلہ ملا، مسلمان بھی اس سے محروم نہیں رہے یعنی ذلت و مسکنت اور اللہ کا غضب، ان کی حکومتیں چھن گئیں، غیروں نے ان پر قبضہ کر لیا، بلکہ خود ان کو مدد دی کہ ہمارے بھائیوں کو فنا کر دو اور ان کے ملکوں پر قبضہ کر لو، اب محکومی و غلامی ہے، ذلت و رسوائی ہے، اور خدا کے غضب میں مبتلا ہیں، فاعتبروا یا اولی الابصار۔

اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

مزدوری ان کے رب کے پاس ہے اور نہ ان کو ڈر ہے اور نہ وہ غم کھائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت اس قسم کے لوگ موجود تھے جو اپنے سچے دین پر قایم اور راہ راست پر گام زن تھے، مگر ان کے کان آپ کی دعوت سے نا آشنا رہے تا آنکہ مر گئے، آپ سے دریافت کیا گیا کہ ان کے حق میں کیا فیصلہ ہوگا، اس سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کر دی، چنانچہ حسب ذیل روایت اس کی تائید کرتی ہے :-

روی ابن جریر عن مجاهد فی قصة سلمان وهی طویلة جدا قال سأل سلمان رسول الله صلی الله علیه وسلم عن اولئك النصاری وما رای من اعمالهم فقال لم یموتوا علی الاسلام، قال سلمان فاظلمت علی الارض وذكرت اجتهادهم فنزلت هذه الآیة، ان الذین امنوا والذین هادوا فدعا سلمان فقال نزلت هذه الآیة فی اصحابك ثم قال من مات علی دین عیسیٰ قبل ان یسمع بی فهو علی خیر ومن سمع بی ولم یؤمن بی فقد هلك۔

ابن جریر نے مجاہد سے سلمان کا بہت بڑا قصہ نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سلمان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ان نصاریٰ کا کیا حال ہوگا، انہوں نے دیکھا تھا کہ وہ لوگ نہایت ہی زاہدانہ زندگی بسر کرتے تھے، آپ نے فرمایا ان کی موت کفر پر ہوئی، سلمان کہتے ہیں کہ یہ سنتے ہی مجھ پر دنیا تاریک ہو گئی میں نے ان کے ورع و تقویٰ کا ذکر کیا، پس یہ آیت ان الذین امنوا الخ نازل ہوئی آپ نے سلمان کو بلا کر کہا کہ تمہارے دوستوں کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی ہے پھر فرمایا کہ جو شخص دین عیسیٰ پر مر گیا اور میری اطلاع اسے نہیں ہوئی تو وہ حالت اسلام میں مرا اور جس کے پاس میری نبوت کی خبر پہنچ گئی اور پھر بھی وہ ایمان نہ لایا تو ہلاک ہو گیا۔

اس شان نزول نے خود بتا دیا کہ اس آیت کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو آپ کے وقت تک موجود تھے، اور حق و صداقت کو کھو نہیں بیٹھے تھے، قرآن حکیم کی دوسری

آیتیں اسی مطلب کی تائید کرتی ہیں، ایک جگہہ فرمایا :-

ولتجدن اقربہم مودۃ للذین اٰمنوا الذین قالوا انا نصٰری ط ذٰلک بان منہم قسیسین و رہبانا وانہم لا یستکبرون ۝ واذا سمعوا ما انزل الی الرسول تری اعینہم تفیض من الدمع مما عرفوا من الحق ج یقولون ربنا اٰمنا فاکتبنا مع الشٰہدین ۝ ومالنا لا نؤمن باللہ وما جاءنا من الحق لا ونطمع ان یدخلنا ربنا مع القوم الصّٰلحین ۝ (۵ : ۸۵و۸۶و۸۷)	اور مسلمانوں کے لئے تبلیغ و دعوت کے اعتبار سے سب لوگوں میں ان کو قریب تر پاؤگے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاری ہیں، یہ اسلئے کہ ان میں علما اور مشائخ ہیں، اور نیز یہ کہ یہ لوگ تکبر نہیں کرتے، اور جب قرآن کو سنتے ہیں جو اس رسول پر نازل ہوا ہے تو تو ان کی آنکھوں کو دیکھتا ہی کہ ان سے آنسو جاری ہیں اس لئے کہ انہوں نے حق بات کو پہچان لیا ہی کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار، ہم تو اس پر ایمان لے آئے ہیں تو تصدیق کرنے والوں کے ساتھ ہمکو بھی لکھ رکھ اور ہم کو کیا ہوگیا ہی کہ اللہ پر اور جو حق بات

ہمارے پاس آئی ہی اس پر تو ایمان لائیں نہیں، اور توقع یہ رکھیں کہ ہمارا پروردگار ہم کو نیک بندوں کے ساتھ بہشت میں لیجاکر داخل کریگا۔

پھر سورۂ آل عمران کے آخر میں یوں ارشاد ہوا :-

وان من اھل الکتاب لمن یومن باللہ وما انزل الیکم وما انزل الیھم خشعین للہ لا یشترون باٰیت اللہ ثمنا قلیلا، اولٰئک لھم اجرھم عند ربھم، (۳ : ۱۹۹)	اور اہل کتاب میں سے بیشک کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں، اور جو کتاب تم مسلمانوں پر اتری ہے، اور جو ان پر اتری ہی، ان سب پر ایمان رکھتے ہیں اور ہر وقت اللہ کے آگے جھکے رہتے ہیں، اور اللہ کی آیتوں کے عوض میں تھوڑے سے دام نہیں لیتے، یہی وہ لوگ ہیں جن کے اجر انکے پروردگار کے ہاں تیار موجود ہیں۔

پس معلوم ہو گیا کہ اس آیت میں وہی لوگ مراد ہیں جو آپ کی بعثت کے وقت موجود تھے، پھر جو ایمان لے آئے وہ دنیا و آخرت میں فائز المرام ہونگے، باقی رہا حکومت کا مسئلہ تو وہ بھی ضمناً سمجھ میں آگیا کہ بعض افراد تو ہر قوم میں اچھے ہوتے ہیں لیکن ان کی وجہ سے تمام قوم کو عزت کا مستحق نہیں قرار دیا جا سکتا، کیونکہ اس کا فیصلہ ہمیشہ اجتماعی حیثیت کو پیش نظر رکھ کر کیا جاتا ہے، غالباً یہ بات تو ہر ایک تسلیم کریگا کہ ہر مذہب میں کچھ نہ کچھ ارباب صلاح و تقویٰ ضرور ہوتے ہیں، اگر چند افراد کی اچھائی یہود کو حقدار حکومت بناتی ہے تو دوسرے مذاہب بھی اس کے دعویدار بن سکتے ہیں پس یہ مطالبہ ہی سرے سے غلط ہے، تم ذرا ان کی تاریخ کو اٹھا کر دیکھو ان لوگوں سے کیسی کیسی غلطیاں سرزد ہوئیں جن میں سے بعض کا ذکر آچکا ہے اور کچھ آگے آتی ہیں پھر بتاؤ کہ ایسی قوم کے متعلق محکمہ تحقیق کا کیا فیصلہ ہونا چاہیے؟

قانون سے نفرت

(۶۳) وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ ط خُذُوا مَا آتَيْنَاكُم بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (۶۴) ثُمَّ تَوَلَّيْتُم مِّن بَعْدِ ذَٰلِكَ ج فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنتُم مِّنَ الْخَاسِرِينَ ○

اور جب ہم نے تم سے اقرار لیا اور تم پر پہاڑ اونچا کیا، ہم نے کہا جو ہم نے تمکو دیا اس کو زور سے پکڑو اور جو اس میں ہے اسے یاد کرتے رہنا شاید تم پناہ میں آجاؤ۔ پھر اسکے بعد تمنے روگردانی کی، پس اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم زیاں کاروں میں ہوتے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معرفت اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ وہ توراۃ کے پابند رہیں گے، وہ دامن کوہ میں کھڑے تھے، اور اپنے سامنے پہاڑ کو دیکھ رہے تھے، انہیں خیال ہوا کہ وہ ان پر گر رہا ہے، اس کے گرتے ہی تمام لوگ فنا ہو جائینگے اور ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہیگا، اللہ تعالیٰ انہیں یہ بتانا چاہتا تھا کہ جو قانون

تم کو دیا گیا ہے وہی تمہارے لئے زندگی بخش ہے، اگر تم اس کو ترک کر دو گے تو مٹ جاؤ گے،
اس حقیقت کو اس مثال سے اور زیادہ واضح کر دیا کہ یہ پہاڑ تمہارے سامنے رفیع و بلند
دکھائی دے رہا ہے، جب تک یہ اپنی جگہہ پر قایم ہے تم زندہ ہو جہاں تمہارے اوپر گرا
اور تم پس گئے، پس اسی طرح یقین کر لو کہ توراۃ کی پابندی میں زندگی ہے اور ترک میں
ذلت و رسوائی۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ پہاڑ ان کے سر پر بلند کر دیا گیا تھا، بلکہ اپنے سامنے اس کو
دیکھ رہے تھے، حدیث میں آتا ہے فرفعت لنا صخرۃ جس کے معنی صاحب بحار الانوار نے
یہ کئے ہیں کہ ظہرت لابصارنا یعنی چٹان ہمیں نظر آنے لگے۔ پس یہاں بھی یہی معنی
مراد ہیں کہ وہ اپنے سامنے پہاڑ کو دیکھ رہے تھے۔

باوجود اس قدر پکے عہد کے ان لوگوں نے نفرت کا اظہار کیا اور کہا سمعنا و
عصینا (۲: ۸۷)، ایک جگہہ ان کا یہ قول نقل کیا: وقالوا قلوبنا غلف (۲: ۸۲) اور
کہتے ہیں ہمارے دل غلافوں میں ہیں، ہم اس نبی کی تعلیم قبول نہیں کرتے، اس عصیان
اور نفرت کا نتیجہ تو یہی تھا کہ تم کو اسی وقت فنا کر دیا جاتا مگر چونکہ اس وقت کوئی دوسری
قوم تبلیغ و دعوت کا فرض ادا کرنے، اور دنیا میں قیام عدل کے لئے تیار نہ تھی، اس
لئے ہم نے تم پر اپنا فضل کیا، تم میں برابر مجددین انبیا بھیجے رہے، جو تمہاری غلط کاریوں
کی اصلاح کرتے، اور پھر تمہیں راہ راست پر لے آتے، انبیائے مجددین کے بھیجنے کو اس
آیت میں فضل و رحمت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہاں تک ان کے مرض تولی اور نفرت کا ذکر کیا، اگلی آیتوں میں اس کی دو صورتیں
بیان کی جاتی ہیں کہ انہوں نے کس کس طرح قانون الٰہی سے نفرت کی:۔

حیلہ سازی

(۶۵) وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِیْنَ اعْتَدَوْا	اور جن لوگوں نے تم میں سے ہفتہ کے دن زیادتی

مِنكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ (۶۶) فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ○	کی ان کو تم جان چکے ہو، تو ہم نے کہا ہو جاؤ بندر ذلیل، پھر ہم نے اس قصّہ کو عبرت بنایا ان لوگوں کے لئے جو اس وقت شہر میں تھے، اور بعد میں آنے والوں کے لئے، اور پرہیزگاروں کے لئے پند و نصیحت تھی۔

اس واقعہ کی شرح دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے :-

وسئلهم عن القرية التى كانت حاضرة البحر اذ يعدون فى السبت اذ تاتيهم حيتانهم يوم سبتهم شرعا ويوم لا يسبتون لا تاتيهم كذالك نبلوهم بما كانوا يفسقون ○ (۷ : ۱۶۳)	ان سے اس گاؤں کا حال دریافت کرو جو دریا کنارے واقع تھا، جب ان کے بڑے سبت کا دن بہت سی زیادتیاں کرنے کہ جب ان کے سبت کا دن ہوتا تو مچھلیاں سینہ سپر ہو کر ان کے سامنے آ تیرتی ہوتیں، اور جب ان کا سبت کا دن نہ ہوتا تو مچھلیاں ان کے پاس بھی آ کر نہ پھٹکتیں، چونکہ یہ لوگ نافرمان تھے ہم بھی اسی طرح ان کو بتلائے آزمائش رکھتے

بنی اسرائیل کے لئے شنبہ کا روز عبادت کے لئے مخصوص تھا، لیکن شرط یہ تھی کہ اس دن کوئی کام نہ کیا جائے جیسے اب بھی مسلمانوں کو حکم ہے کہ جب جمعہ کی اذان سنیں تو تمام کاروبار دنیوی ترک کر کے فوراً مسجد میں آجائیں، اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الیٰ ذکر اللہ وذروا البیع (۶۲ : ۹) قانون کا تقاضا یہ تھا کہ یوم السبت کو مچھلی کا شکار بھی نہ کریں، مگر مصیبت یہ تھی کہ صرف شنبہ کے روز تو مچھلی بکثرت آتی اور باقی ایام میں ایک بھی نہ ملتی، دریا کے کنارہ پر رہتے تھے، ان کے لئے اس سے بہتر دوسری غذا نہ تھی، حیران تھے آخر علمائے سو نے انہیں یہ حیلہ سکھا دیا کہ شنبہ کے روز دریا سے فاصلہ پر گہرے گڑھے کھود لیں

تاکہ پانی آسکے، مچھلی بھی خود بخود آجائیگی، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، دن بھر مچھلی گڑھوں میں آتی رہتی اور شام کو جاکر شکار کر لیتے، اس میں بظاہر قانون کی صورت بھی قایم رہی، اور ان کی غرض بھی حاصل ہو گئی۔

یہ ارباب حیل کی فریب کاری تھی، جب اس مرض کی انتہا ہو گئی، اور باوجود تنبیہ و تادیب وہ لوگ باز نہ آئے، تو اُن پر عذاب نازل ہوا، ان لوگوں کے تین گروہ تھے، ایک وہ جو عوام الناس کو ان حیلوں کی تعلیم دیتا، دوسرا ان کی اس مکاری پر خاموش رہتا، اور تبلیغ و دعوۃ کا فرض ادا نہ کرتا، یہ دونوں گروہ عذاب الہٰی میں گرفتار ہوئے، تیسرا فرقہ بچ گیا جو ان کے اصرار و تمرد کے باوجود وعظ و ارشاد میں برابر مصروف رہا، چنانچہ اس کی تفصیل دوسری جگہہ آئی ہے:۔

واذ قالت امۃ منھم لم تعظون قوما ن الله مھلکھم او معذبھم عذابا شدیدا ط قالوا معذرۃ الی ربکم ولعلھم یتقون ○ فلما نسوا ما ذکروا بہ انجینا الذین ینھون عن السوء واخذنا الذین ظلموا بعذاب بئیس بما کانوا یفسقون ○ (۷ : ۱۶۴و۱۶۵)	اور جب ان میں سے بعض لوگوں نے دوسروں سے جو سبت کے دن شکار کرنے سے منع کرتے تھے کہا کہ جن لوگوں کو خدا ہلاک کرنا یا ان کو سخت عذاب میں مبتلا کرنا چاہتا ہے بھلا ان کو تم بیفائدہ کیوں نصیحت کرتے ہو، اُنہوں نے جواب دیا کہ ہم تو تمہارے پروردگار کی جناب میں اپنے اوپر سے الزام اُتارنے کی غرض سے نصیحت کرتے ہیں، اور یہ بھی خیال ہے کہ شاید یہ لوگ باز آجائیں، تو جب

ان لوگوں نے وہ نصیحتیں جو اُن کو کی گئی تھیں بھلا دیں تو جو لوگ بُرے کام سے منع کرتے تھے ان کو تو ہم نے بچا لیا، اور جو لوگ شرارت پر اصرار کرتے رہے اُن کی نافرمانیوں کی پاداش میں ہم نے ان کو عذاب سخت میں مبتلا کیا۔

جب قوم کا بیشتر حصہ اس مرض خبیث کا شکار ہو گیا تو ان کی اخلاقی حالت بھی

مسخ ہوتی چلی گئی، ان کے اخلاق جانوروں کی طرح ہو گئے، وہ اگرچہ انسانوں کی صورت میں تھے، مگر اب ان میں اور حیوانوں میں کوئی چیز مابہ الاشتراق نہ رہی تھی، اب وہ خیر البریہ کی بجائے شر البریہ، الاعمیٰ اور الذین لا یعلمون تھے، انجام کار قوم کی قوم زنا کی عادی بن گئی، اور جس کی آخری کڑی یہ تھی کہ وہ بندر اور سور بنا دیے گئے، کیونکہ بعض امراض اس قسم کے ہوتے ہیں کہ انسان کی صورت مسخ ہو جاتی ہے، اور وہ بالکل جانوروں کے مشابہ ہو جاتا ہے۔

جب تک انسان کی صحت عمدہ ہے، کوئی خارجی مضر چیز اس پر اپنا اثر نہیں ڈال سکتی، جہاں اس کی صحت نے جواب دیا کہ چاروں طرف سے امراض کا حملہ شروع ہو جاتا ہے، اور طبیعت ان کو فوراً قبول کر لیتی ہے، یہی حال روحانی صحت و تندرستی کا ہے، جب ایک قوم بری عادتیں قبول کرنا شروع کر دیتی ہے تو سب سے پہلے اس کے اخلاق پر ان کا اثر نمودار ہوتا ہے، اور یہ بالکل ممکن ہے کہ جن حیوانوں کے اخلاق اس نے ابتدا میں قبول کئے تھے، انہیں کا برا اثر عالم مثال تک پہنچنے پر ان کی صورتیں اخذ کر لیں، اور انجام کار ان کی صورتیں بھی ویسی ہی ہو جائیں، انسان اگر تنزل کے گہرے گڑھے میں گرنا شروع ہوا اور اس سے انسانیت چھین لی جائے تو سب سے پہلے وہ بندر بنتا ہے، اس لئے کہ حیوانات میں سے انسانوں کے قریب ترین یہی بندر ہے۔

سورۂ نساء میں اہل کتاب کو دھمکی دی گئی ہے کہ اگر تم اس کتاب پر ایمان نہ لائے تو تمہارا بھی وہی حال ہوگا جو اہل سبت کا ہوا، چنانچہ فرمایا:-

یاایہا الذین اوتوا الکتب امنوبما نزلنا مصدقا لما معکم من قبل ان نطمس وجوھا فنردھا علی ادبارھا	اے اہل کتاب! قرآن پر ایمان لے آؤ جو ہم نے نازل فرمایا ہے اور وہ اس کتاب کی تصدیق کرتا ہے جو تمہارے پاس ہے قبل اس بات کے کہ ان کے چہرے بگاڑ کر ان کی

او نلعنہم کما لعنا اصحٰب السبت ط و کان امر اللہ مفعولا ۝ (۴: ۵۰)	پشت کی طرف کر دیں، اور اب وہ تنزل کو ترقی خیال کرنے لگ جائیں، یا جس طرح ہمنے اصحٰب السبت

کو پھٹکار دیا تھا ان کو بھی پھٹکار دیں، اور جو خدا کو منظور ہی وہ ہو کر رہیگا۔

قانون ترک کرنے کی ایک صورت تو یہ تھی کہ حیلہ جوئی سے کام لیا، اس کی ظاہری شکل بھی قائم رہی، دیکھنے والا اعتراض بھی نہیں کر سکتا اور اپنا مطلب بھی نکل آیا، اب اس کے چھوڑنے کی دوسری صورت بیان کی جاتی ہی۔

باریک بینی

جب قانون پر عمل کرنا منظور نہ ہو تو اس میں فلسفیانہ موشگافیوں سے کام لیا جاتا ہی، بال کی کھال نکالی جاتی ہے، اور مقصد یہی ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس سے نجات مل جائے، سوالات کثرت سے کئے جاتے ہیں، باتیں بہت سی پوچھی جاتی ہیں، فرضی صورتیں پیش کرتے ہیں، اور ان تمام کا ماحصل ترک قانون کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، ملاحظہ ہو۔

(۶۷) وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ط قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ط قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (۶۸) قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ط قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ط عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ط فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ (۶۹) قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ط قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ	اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اللہ تمکو ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہی، وہ بولے کیا تو ہم سے استہزا کرتا ہی، اُنھوں نے کہا اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ نادانوں میں سے ہو جاؤں، بولے اپنے رب کو ہمارے لئے پکار کہ ہمیں بتادے وہ گائے کیسی ہی، کہا وہ فرماتا ہی کہ وہ ایک گائے ہی نہ بوڑھی اور نہ بن بیاہی، اُن کے درمیان ہی، پس جو حکم تمکو ملا ہی اس کو کرو، بولے اپنے رب کو ہمارے واسطے پکار، ہمیں بتادے کہ اس کا رنگ کیسا ہی، کہا وہ فرماتا ہی کہ وہ زرد رنگ

فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ (٦٩) قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ۭ وَاِنَّآ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ (٧٠) قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ۭ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۭ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝

والی گائے ہے، دیکھنے والوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے، بولے ہمارے لئے اپنے رب کو پکار کہ وہ بتادے کہ وہ کس قسم کی ہے کیونکہ ہم کو گایوں میں شبہ پڑگیا ہے، اور اللہ نے چاہا تو ہم راہ پائینگے، کہا وہ فرماتا ہے وہ محنت والی گائے نہیں کہ اس کو زمین میں جوتتے ہو، یا کھیت کو پانی دیتے ہو، بدن ٹھیک ہے، اس میں داغ وغیرہ کچھ نہیں، بولے اب ٹھیک بات بیان کی پھر اسکو ذبح کیا، اور کوئی صورت نہ تھی کہ ذبح کرتے،

اگر وہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حکم سنتے ہی گائے ذبح کر دیتے تو انہیں اتنی تکالیف برداشت کرنے کی نوبت ہی نہ آتی، مگر ان کی نیت نہ تھی، اس لئے کثرت سوال سے موسیٰ کو تنگ کر دیا، پس خود تنگی میں مبتلا ہو گئے، قاعدہ ہے کہ قانون اپنی ابتدائی شکل میں بہت سادہ اور سہل ہوتا ہے مگر جوں جوں آپ سوالات کرتے جائیں گے قیود اور پابندیاں بڑھتی جائینگی اور اس کا دائرہ تنگ ہوتا جائیگا، حضرت موسیٰ انہیں باربار کہتے ہیں اعوذ باللہ ان اکون من الجٰھلین میرا حکم بغیر کسی مصلحت کے نہیں، بلکہ اس میں بہت بڑی حکمت پوشیدہ ہے، مگر وہ اپنی کٹ حجتی سے کیوں باز آنے لگے، اس لئے نتیجہ بھی دیکھ لیا۔

(٧٢) وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ۭ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۚ (٧٣) فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ۭ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝

اور جب تم نے ایک شخص کو مار ڈالا پھر اسکے دوسرے پر قتل کا الزام لگانے لگے، اور جو تم چھپاتے تھے اللہ کو اس کا باہر نکالنا تھا، پھر ہم نے کہا اس مردے کو اس گائے کا ایک ٹکڑا مارو، اسی طرح زندہ کریگا اللہ مردوں کو، اور تمکو اپنے نمونے دکھاتا ہے شاید تم عقل کرو۔

جب ان لوگوں نے گائے ذبح کرلی تو اتفاق سے وہاں ایک قتل ہوگیا، اور باوجود سخت کوشش کے قاتل کا پتہ نہ لگا، اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کو حکم دیا کہ گائے کا ایک ٹکڑا مقتول کی لاش پر مارو، چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا مردہ زندہ ہوگیا اور اس نے قاتل کا پتہ بتادیا، اب اس پر اللہ تعالیٰ انہیں متنبہ کرتا ہے کہ جس حکم کی تمہیں مصلحت معلوم نہ تھی وہ کس طرح تمہارے لئے زندگی بخش ثابت ہوا، آیندہ تمہیں چاہیئے کہ نبی کا ہر حکم ماننے کے لئے تیار ہوجاؤ یہ یقین کرلو کہ نبی کے ہر حکم میں ضرور کوئی نہ کوئی مصلحت و حکمت ہوگی، مگر یہ ضروری نہیں کہ تمہیں بھی اس کا علم ہوجائے، دیکھو گائے ذبح کرنا تم بے سود خیال کرتے تھے مگر موسیٰ کو خبر تھی کہ اس پر عمل کرنے سے تمہیں کس قدر فائدے حاصل ہونگے پس پھر کبھی یہ حرکت نہ کرنا۔

اللہ تعالیٰ انہیں گائے ذبح کرنے سے یہ بتانا چاہتا تھا کہ :۔

(الف) نبی کی اطاعت قوم کے لئے ضروری ہے کہ اس سے قوم زندہ ہوجاتی ہے۔

(ب) نبی کے ہر حکم میں حکمتوں اور دانائیوں کے خزانے مخفی ہوتے ہیں۔

(ج) حیات قومی کے لئے قربانی الزم اللوازم ہے۔

بعض مفسرین نے قتل کے واقعہ کو پہلے فرض کیا ہے اور گائے کے ذبح کرنے کو اس کے بعد حالانکہ قرآن حکیم کی آیات اس کی تائید نہیں کرتیں بلکہ ان سے وہی اقرب الی الصواب معلوم ہوتا ہے جس کو ہم نے اختیار کیا ہے کہ گائے ذبح کرنے کا حکم پہلے ہوا ہے بعد ازاں اتفاقی طور پر دوسرا واقعہ پیش آگیا۔[1]

---

[1] آیات ماسبق میں علمائے یہود کی تین اصولی خرابیاں ذکر کی ہیں :۔

(الف) قانون الٰہی سے نفرت (ب) حیلہ سازی، (ج) تعمق اور ریا کاری۔

اگر صادق و مصدوق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے کہ:

لیاتین علی امتی ما اتی علی بنی اسرائیل حذو | جو کچھ بنی اسرائیل کے ساتھ ہوا وہی میری اُمت

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۵۲ پر)

حیات قومی کے لیے تین قسم کے لوگوں کی ضرورت

(۷۴) ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ۭ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاۗءُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○

پھر اس کے بعد تمہارے دل پتھر کی مانند بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت ہو گئے، حالانکہ بعض وہ پتھر ہوتے ہیں جن سے نہریں بہہ نکلتی ہیں، وہ بھی ہیں جو پھٹتے ہیں اور ان سے پانی نکلتا ہے، اور ان میں وہ بھی ہیں جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں، اور اللہ تمہارے کام سے بے خبر نہیں۔

(بقیہ حاشیہ سلسلہ صفحہ ۱۵۱)

النعل بالنعل | کے ساتھ ہوگا۔

تو یقین کیجیے کہ علماے یہود کی یہ خرابیاں آج امت مسلمہ کے علماے سوء میں موجود ہیں، ہم پہلے حیلہ سازی کو لیتے ہیں پھر بار یک بینی پر بحث کریں گے مگر صرف اشارات پر اکتفا کیا جائیگا، رسول علیہ السلام نے حیلوں کا سدّباب یہاں تک کیا کہ قاضیوں کو ہدایا قبول کرنے سے روک دیا کہ رشوت ستانی کا ایک حیلہ بن سکتا ہے، آپ نے فرمایا ہدایا الولاۃ غلول، ابوداؤد میں ہے: استعملناہ علی عمل ورزقناہ رزقا، فما اخذہ بعد ذلک فھو غلول، ہم نے اُسے کام پر لگایا، اور تنخواہ معین کر دی، اس کے علاوہ وہ جو کچھ لوگوں سے لیگا وہ غلول ہے، ایک روایت میں فرمایا: اخذ الامیر الھدایۃ سحت، امیر کا ہدیہ قبول کرنا مال حرام کا لینا ہے، اسی طرح مقروض سے ہدیہ اور تحفہ کا لینا ناجائز قرار دیا کہ سود کے لیے حیلہ بن سکتا ہے، اذا اقرض احدکم قرضاً فاھدی الیہ اوحملہ علی الدابۃ، فلا یرکبھا ولا یقبلہ الا ان یکون جری بینہ وبینہ قبل ذلک، اگر تمہارا مقروض تمہیں ہدیہ دے یا سواری کے لئے جانور پیش کرے تو اس پر سوار نہ ہونا اور ہدیہ قبول نہ کرنا، ہاں اگر پہلے ہی سے یہ سلسلہ ہو تو کوئی حرج نہیں، اسی بنا پر اجلہ صحابہ نے ہدیہ مقترض

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۳ پر ملاحظہ ہو)

اس قسم کے واقعات تمہارے سامنے ہوتے رہے، اگر دیدۂ عبرت وا ہوتا تو ہدایت و سعادت انسانی کے صدہا مراتب تھے جن کا ان سے پتہ لگ سکتا تھا، مگر تمہارے دلوں پر ان کا کچھ بھی اثر نہ ہوا، اور سختی میں پتھروں سے بھی آگے نکل گئے، حالانکہ پتھروں کی مختلف قسمیں تمہارے سامنے ہیں، اور ان کے حالات تم سے جدا گانہ۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۲) کی نسبت فتویٰ دیا کردہ ربوا میں داخل ہے۔

باوجود کتاب و سنت کی تصریحات کے ارباب دجل و فریب اور اہل جدل و مکابرہ نے وہ وہ حیلہ سازیاں کی ہیں کہ:

وائے گر در پس امروز بود فردائے!

دوسری صدی کے شروع ہی میں بعض علماء سوء اور فقہاء دنیا نے حیلہ تراشیاں شروع کر دی تھیں، اور تیسری صدی میں کتاب الحیل کی باقاعدہ تدوین و ترتیب عمل میں آ گئی تھی، اس میں انہوں نے اپنے پیش رو یہودیوں کو بھی مات کر دیا، خدا کا حکم تھا کہ ہر مالدار زکوٰۃ دے، انہوں نے سال کے آخر میں تمام مال بیوی کے نام ہبہ کر دیا کہ خدا دھوکے میں آ کر ہم کو مفلس و نادار سمجھ لیگا، وما یخدعون الا انفسہم وما یشعرون۔

اجیرہ زانیہ کے اجر مثل کا جزئیہ کس سے مخفی ہے، اس نے صاف صاف زانیہ کی اجرت کو جائز قرار دیا، اور توسیع کاروبار زنا بن گیا، اس کے حلال و طیب ہونے کی صورت ملاحظہ ہو:

ان یستاجرھا لکنس بیتہ او لطی ثیابہ او طبخ طعامہ او لنقل متاع من مکان الی مکان ویشترط بھا الزنا ثم یزنی، کسی شخص نے گھر کا کام کاج کرنے کے لئے یا کھانا پکانے کے لئے یا کسی اور فعل مباح کے لئے ایک عورت سے عقد اجارہ کیا کہ اتنی مزدوری پر میرا کام کر دینا، اور ساتھ ہی یہ شرط بھی ٹھیرا لی کہ تجھ سے زنا بھی کرونگا، تو چونکہ یہ مشروع باصلہ و غیر مشروع بوصفہ ہے اس لئے اجارہ فاسد ہوا لیکن اجرت حلال ٹھیری، نتیجہ یہ نکلا کہ اگر کسی فقیہ حیل نے ذرا شم و ابرو دیکھکر کسی اچھی سی ماما کو کام کاج کے لئے مزدوری پر رکھ لیا اور

اس آیت میں درصل اللہ تعالیٰ نے پتھروں کی مثال دیکر ایک حقیقت کبریٰ کی طرف ہماری راہ نمائی کی ہے اور وہ یہ ہے کہ قوموں کے نشو وارتقا کے لئے تین قسم کے ارباب علم وفضل کی ضرورت ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۳) ساتھ ہی یہ شرط بھی ٹھیرائی کہ گاہ گاہ کچھ اور شغلہ بھی جاری رہیگا تو ایسی اجرت اس ماما کے لئے جائز اور حلال وطیب ہے، تعالیٰ اللہ عما یقولون علوا کبیرا۔
مسئلہ نفاذ قضاء قاضی ظاہرا وباطنا بھی اسی قبیل سے ہے، عدالت میں قاضی کے روبرو بات بنائیے پھر جب عدالت نے فیصلہ دیدیا تو وہ حلال وطیب ہے اگرچہ صدہا حیلوں اور مکاریوں کے بعد یہ فیصلہ صادر ہوا ہو، گویا شریعت کے تمام اوامر ونواہی کا دار ومدار اور مواخذۂ آخرت کی بنا صرف دنیا کے احکام وظواہر ہیں، روح وحقیقت اعمال اور محاسن و فضائل اخلاق سے کوئی تعلق نہیں۔

درازدستی این کوتہ آستیناں بیں!

تعمق اور باریک بینی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ھلك المتعمقون، باریک بینی کرنے والے ہلاک ہونگے، مگر مسلمانوں نے اس کی پروا نہ کی اور اب تو ان کے مذہب کی ہر شاخ میں اس طرح تعمق جاری و ساری ہوگیا ہے کہ حق کو باطل سے الگ کرنا قریب قریب ناممکن ہوگیا ہے، اس لئے کہ اس نے مذہب کی شکل اختیار کرلی ہے۔

پانی کتنا پاک ہوتا ہے، ہر شخص اس حقیقت سے واقف ہے اس لئے کہ پیدا ہوتے ہی اسے پاک وناپاک پانی میں تمیز کرنی پڑتی ہے، اصل شریعت نے ہر انسان کی طبیعت اور سلامت ذوق پر چھوڑ دیا تھا، مگر ارباب فقاہت نے تو اس میں اتنی پابندیاں عائد کردیں کہ مشکل پڑگئی، اس میں فقہاء خراسان وبخارا کی تفریعات دیکھنے کے قابل ہیں، ان کے نزدیک اس کنوئیں کا پانی ناپاک ہے جس میں سے چرسا اور رہٹ کے ذریعہ پانی نکالا جاتا ہو کیونکہ ممکن ہے کہ اس میں گوبر وغیرہ گر جاتا ہو۔ یہی حال مسئلہ خلق قرآن، اور امکان کذب باری کا ہے،

(الف) وہ اہل علم و معرفت جن کے قلوب میں فیوض و برکات الہیہ کے دریا موجزن ہوں، جو اپنے حکیمانہ مواعظ اور کتاب وسنت کے درس و افتا سے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو مستفید کریں، چاروں طرف ان کے علم و فضل کی نہریں جاری ہوں، اور ہر جانب کے تشنہ لب وہاں آکر اپنی پیاس کو دور کریں، ہزاروں دلوں کی زندگی کا باعث ہوں، اور ان سابقین اولین کی فیض صحبت سے کوئی بھی محروم نہ رہے۔

(ب) ایسے صاحبان دانش و حکمت جو اپنے گرد و پیش کے لوگوں کی راہ نمائی کر سکیں، ان کی آس پاس کی آبادی ان سے مستفید ہو، اور اپنے ارد گرد رہنے والوں کی اصلاح کرنے کے قابل ہوں۔

(ج) وہ ارباب ورع و تقوی جن کے قلوب اپنے خالق کے ساتھ وابستہ ہوں، اور اللہ کا خوف ان کے رگ و پے میں جاری و ساری ہو، جب انہیں کوئی صحیح بات بتا دی جائے، ان کی گردنیں فوراً اس کے آگے جھک جائیں، وہ یکسر اطاعت و انقیاد ہوں، اور اس کے سوا اور کچھ جانتے ہی نہ ہوں۔

جب تک کسی قوم میں مذکورۃ الصدر تین قسم کے لوگ موجود رہیں گے قوم زندہ رہےگی، اور ان کا فقدان اس کی تباہی و بربادی کا باعث ہوگا، بنی اسرائیل سے یہی کہا جاتا ہے کہ گزشتہ تین اصولی غلطیوں کے ارتکاب کے بعد تمہارے دل پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہو گئے اور تمہاری طبیعتیں اس درجہ کند ہو گئیں کہ اب وہ کسی صحیح تعلیم کو قبول کرنے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتیں، اس لئے تم پتھر سے بھی گئے گزرے ہو، پھر خلافت و حکومت تمہیں کیسے دی جا سکتی ہے۔

دست و بازو نہیں بن سکتے

گزشتہ آیات میں اس مضمون کو صاف کر دیا ہے کہ بنی اسرائیل، مسلمانوں پر حکومت کرنے کے قابل نہیں ہیں، ان پر ہمیشہ کے لئے ذلت و مسکنت لازم کر دی ہے، اور اب انہیں حکومت نصیب نہ ہوگی، اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ وہ اس وجہ اپنے قوائے عملیہ کو برباد کر چکے ہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر اور ان کے دست و بازو بن کر بھی تبلیغ و اشاعت مذہب کی قابلیت ان میں باقی نہیں، اور ان کے ساتھ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی مساوی نہیں

(۷۵) أَفَتَطْمَعُونَ أَن يُؤْمِنُوا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِن بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ○

اب کیا تم مسلمانوں توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بات مان لینگے، اور ایک گروہ تھا ان میں جو اللہ کا کلام سنتا تھا، پھر سمجھنے کے بعد اس کو بدل ڈالتا تھا، اور وہ جانتے تھے۔

علما کی شان یہ ہے کہ جس قدر صحیح تعلیم ان کے پاس ہے بغیر رد و بدل اور حک و اضافہ لوگوں کے سامنے پیش کر دیں، یہودیوں کے عالم اس بات سے واقف تھے کہ سرزمین حجاز میں نبی آخر الزماں کی بعثت ہوگی، انہیں اوس و خزرج کے مقابلہ میں جب کبھی شکست ہوتی تو ہمیشہ انہیں ڈراتے کہ وہ وقت بہت قریب ہی جب ہم اس نبی کے ساتھ مل کر تمہیں فنا کر دیں گے، چنانچہ یہی تادیبی کلمات اوس و خزرج کے اسلام کا باعث بنے، لیکن جس وقت آپ کی بعثت ہوئی تو چونکہ آپ بنی اسرائیل میں نہیں پیدا ہوئے تھے انکار کر بیٹھے، اور جس قدر پیشین گوئیاں حضور اقدس کے ظہور کے متعلق انکی کتابوں میں تھیں ان کو لفظاً و معناً بدلنا شروع کر دیا۔

قرآن حکیم نے تحریف کا لفظ استعمال کیا ہے اور یہ لفظ و معنی دونوں پر مشتمل ہے، کتاب مقدس میں تحریف لفظی اور معنوی کا ہونا اس درجہ مسلّم اور متفق علیہ امر ہے کہ اب اس پر کسی بحث کی ضرورت ہی نہیں ہے، خود عیسائی محققین تسلیم کرتے ہیں کہ لفظی اور معنوی

دونوں تحریفیں عمل میں آئی ہیں۔ دوسری جگہ اہل کتاب کی اس خرابی کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

یحرفون الکلم عن مواضعہ ونسوا حظا مما ذکروا بہ ج ولا تزال تطلع علی خائنۃ منھم (۵ : ۱۶)	لفظوں کو ان کی جگہ سے پھیرتے ہیں اور ان کو جو نصیحت کی گئی تھی اس میں سے ایک حصہ بھلا بیٹھے، اور ان میں سے چند لوگوں کے سوا سب کی چوری

کی اطلاع تم کو ہوتی ہی رہتی ہے۔

یعنی اللہ کے غضب اور اس کی لعنت کا اثر یہ ہوا کہ ایک حصہ کتاب کا بالکل چھوڑ بیٹھے، اور جس پر عمل کرنے کا ارادہ ہوا اس میں اپنی مطلب پرستی کے لئے بیجا تاویلات شروع کر دیں، اور اس طرح تمام کتاب بیکار ہو گئی[۱]

پھر ایسے خائن اور بد دین، مسلمانوں کے ساتھ ملکر کیا کرینگے، یہاں بھی ان ناپاک حرکات سے باز نہ آئینگے بلکہ مسلمانوں کو ان کا خوگر بنانے کی کوشش کرینگے، ولن ترضی عنك الیھود ولا النصٰری حتی تتبع ملتھم (۲ : ۱۲۰) حدیث میں آتا ہے لا ایمان لمن لا امانۃ لہ ولا دین لمن لا عھد لہ۔

---

[۱] قرآن حکیم تحریف لفظی سے تو محفوظ رہا مگر معنوی تحریف سے نہ بچ سکا، قرآن پڑھنے کا قاعدہ یہ ہی کہ ایک شخص خالی الذہن ہو کر اس میں درس و فکر کرے، اور شارع علیہ السلام کے اسوۂ حسنہ کو پیش نظر رکھے، پھر دیکھے قرآن کن عقائد و یقینیات کی تعلیم دیتا ہی اور کن اخلاق و اعمال پر زیادہ زور دیتا ہی، مگر اب حالت یہ ہی کہ عقائد پہلے سے معین کر لئے جاتے ہیں پھر ان کی تائید کتاب سے تلاش کی جاتی ہی اور اپنی رکیک تاویلات کا اسکو نشانہ بنایا جاتا ہی، اسی کو تحریف معنوی کہتے ہیں جسکا ذکر یحرفون الکلم عن مواضعہ میں ہوا، ایک حنفی اٹھتا ہی اور تمام قرآن کو فقہ حنفی کے مطابق کر دکھاتا ہی، ایک شافعی کہتا ہی کہ قرآن کی ایک ایک آیت مذہب شافعی کی تائید کرتی ہی، یہی حال مالکیوں اور حنبلیوں کا ہی، اور ارباب بدع و احداث کا کیا کہنا گویا قرآن صرف انہیں امور کے لئے نازل ہوا ہی، نعوذ باللہ!

کتمان حق

(۷۶) وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۷۷) اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ○

اور جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم مسلمان ہوئے اور جب ایک دوسرے کے پاس اکیلے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کیوں انکو خبر دیتے ہو اسکی جو اللہ نے تم پر کھولا ہی تاکہ اسکی وجہ سے تمہارے رب کے آگے تمکو جھوٹا ثابت کریں، کیا تمکو عقل نہیں، کیا اتنا بھی نہیں جانتے کہ اللہ کو معلوم ہی جو چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں

منافقین یہود کی حالت یہ تھی کہ مسلمانوں پر اپنا اخلاص و ایمان ظاہر کرنے کے لئے کبھی ان پیشین گوئیوں کو بیان کر دیا کرتے تھے جن میں حضور علیہ السلام کا ذکر ہوتا، مگر جس وقت انہیں علماء و احبار کی خدمت میں حاضر ہونا پڑتا تو ان کو تنبیہ کی جاتی کہ ان امور کی اطلاع مسلمانوں کو کس لیے دیتے ہو، یہی چیزیں قیامت کے دن ہمارے لیے الزام کا باعث بن جائینگی اور ہم خدا کے روبرو ملزم قرار دیے جائینگے، مگر ان کے چھپانے سے ہوتا کیا ہے، اللہ تعالیٰ تو سب کچھ جانتا ہے وہ وحی و الہام کے ذریعہ آپ کو ان پیشین گوئیوں کی اطلاع دیدیگا، چنانچہ ابھی آپ مکہ ہی میں تھے کہ ناموس الٰہی نے آپ کو مثیل موسیٰ قرار دیا: انا ارسلنا الیکم رسولاً شاھدا علیکم کما ارسلنا الی فرعون رسولاً (۷۳ : ۱۵) (صفحہ ۱۵۹ کے آخر میں ملاحظہ ہو)

جہلائے یہود کی حالت

ان آیتوں میں یہودی عالموں کی چند کمزوریاں بیان کی ہیں، مسلمانوں کو خیال ہو سکتا تھا کہ اگر عالم ہمارا ساتھ نہ دینگے تو شاید جاہل اس طرف رُخ کریں، اور تکثیر سواد ہی کا فائدہ حاصل ہو، اگلی آیت میں ان جاہلوں کے خیالات کا تذکرہ ہے، پس جن لوگوں کے افکار و خیالات اس قسم کے ہوں ان سے کسی قسم کی توقع رکھنا فضول ہے۔

(۷۸) وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ	اور ایک انمیں جاہل ہیں، جو کتاب کی تو خبر نہیں رکھتے مگر آرزو پنا رکھی ہیں، اور اسکے سوا اور کچھ نہیں کہ گمان کرتے ہیں۔

امانی امینۃ کی جمع ہے جس کے معنی تلاوت کے ہیں، ایک شاعر کہتا ہے :۔

تمنی کتاب اللہ اول لیلۃ

تمنی داؤد الزبور علی رسل

یعنی جاہل توراۃ پڑھتے ہیں، مگر مفہوم و مطلب سے کوئی غرض نہیں، صرف الفاظ پر قناعت کرتے ہیں اور طوطے کی طرح رٹ لیتے ہیں، باوجود اس کے یقین رکھتے ہیں کہ جنت میں داخل ہونگے، معنی سمجھے بغیر کتاب الٰہی کس کام آسکتی ہے،

بعض لوگوں نے اس کے معنی آرزو اور خواہش کے لئے ہیں، روح المعانی میں ہے:۔

امانی جمع امینۃ واصلہا امنویۃ افعولۃ وھو فی الاصل ما یقدر الانسان فی نفسہ من منی اذا قدر ولذلک تطلق علی الکذب وعلی ما یتمنی۔

گویا لکھنا پڑھنا جانتے نہیں مگر خواہشات بڑی بڑی ہیں، اپنے علماء سے جو کچھ سن لیا ہے اسی کو مایۂ ناز و سرمایۂ آخرت تصور کرتے ہیں، ان کی آرزوہائے باطلہ ملاحظہ ہوں کہ جنت میں یہودی اور نصرانی کے سوا دوسرا کوئی شخص نہیں جاسکتا : لن یدخل الجنۃ الا من کان ھودا او نصاری (۲ : ۱۱۱) اگر بہ فرض محال یہودی جہنم میں گئے بھی تو صرف چند روز کے لئے : وقالوا لن تمسنا النار الا ایاما معدودۃ (۲ : ۸۰)

اس قسم کے خیالات فاسدہ ہیں جو ان کو خوش رکھتے ہیں حالانکہ جنت میں جانے کا قاعدہ یہ ہے کہ صرف ایک اللہ کی غلامی کی جائے اور قلب سلیم لیکر اس کے حضور میں حاضر ہو : الا من اتی اللہ بقلب سلیم (۲۶ : ۸۹) نیز فرمایا : بلیٰ من اسلم وجہہ

سلہ مسلمانوں کے علماء سو نے مسائل جہاد کو حکومت سے ڈر کر مخفی رکھا اور یہودیوں کے نقش قدم پر چلے۔

لله وھو محسن فلہ اجرہ عند ربہ ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون[۱] (۲: ۱۱۲)

(۷۹) فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتٰبَ بِأَيْدِيهِمْ ۙ ثُمَّ يَقُولُونَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا يَكْسِبُونَ

پس ان لوگوں کے لئے خرابی ہے جو اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں یہ اللہ کے پاس سے ہے تاکہ اسکے عوض میں تھوڑی سی قیمت لیں پس خرابی ہے انکے لئے کہ انکے ہاتھوں نے لکھا، اور خرابی ہے انکے لئے کہ اسکو پیشہ بنالیا۔

اس زمانہ میں دستور یہ تھا کہ کتاب الٰہی کی آیات کے ساتھ اہل علم اپنے تفسیری نوٹ اور حواشی بھی لکھ لیا کرتے تھے، آیت میں اور ان جملوں میں کسی قسم کا فرق و امتیاز نہ رکھتے تھے، اور اس لئے دوسرا شخص دونوں میں تمیز نہ کرسکتا تھا، جب عوام ان سے کوئی مسئلہ پوچھتے تو یہ ان حواشی کو دیکھکر جواب دیدیتے اور کہتے کہ یہی خدا کا حکم ہے، حالانکہ وہ ان کی اپنی خواہشات اور ابلیسی الہامات کا آئینہ ہوتا تھا، اور یہ شیطنت صرف اس لئے کی جاتی تھی کہ رؤسائے قوم کے یہاں ان کو قدر و منزلت نصیب ہو، دولت ہاتھ آئے، اور ہر جگہ آؤ بھگت ہو، قل متاع الدنیا قلیل، اگر دنیا کے تمام خزائن بھی ایک شخص کے قبضہ میں آجائیں یہ بھی اس کی خواہشات کو پورا نہ کرسکیں گے،

[۱] دونوں امراض مسلمانوں میں موجود ہیں، عام دستور ہے کہ فجر کی نماز کے بعد مفہوم سمجھے بغیر ایک دو جزو پڑھ لینگے اور اس پر اپنے آپ کو ثواب کا مستحق خیال کرینگے، تفسیر کے ابتدائی اوراق میں تم پڑھ آئے ہو کہ صحابہ کا طرز عمل قرآن کے متعلق کیا تھا، حضرت عمرؓ نے آٹھ سال میں بقرہ ختم کی، خود صاحب وحی والہام رات رات بھر ایک آیت میں صرف کردیتے:

فاین الثریا واین الثری   واین معاویۃ من علی

یہی حال مسلمانوں کے عقائد کا ہے، اعمال صالحہ سے اجتناب، اخلاق فاضلہ سے پرہیز، بدعات و محدثات میں مبتلا، اور جنت کے ٹھیکیدار:

وسوف تری اذا انکشف الغبار   افرس تحت رجلك ام حمار

کیونکہ آرزوں کا سلسلہ دراز تر ہوتا جائیگا۔[۱]

ویل کا لفظ قرآن حکیم میں تین معانی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

(الف) اگر گناہوں کی حالت ابتدائی ہے تو ویل کے معنی افسوس کے ہونگے ایک شریف انسان کے لئے اتنا بھی بہت ہوتا ہے۔

(ب) درمیانی حالت میں اس کا مفہوم تباہی و بربادی ہوگا۔

(ج) اور آخری حالت میں اس سے دوزخ مراد لی جائیگی۔

نجات کا قانون

(۸۰) وَقَالُوا لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً ۚ قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِندَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَن يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ ۖ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ○	اور کہتے ہیں کہ ہم کو سوائے گنتی کے چند روز کے آگ نہ لگیگی، ان سے پوچھو کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لیا ہے کہ اللہ اپنے قول کے خلاف نہ کریگا، یا جاننے کے بغیر اللہ پر جھوٹ بولتے ہو۔

کہتے ہیں کہ یہودی خواہ کتنا ہی گنہگار کیوں نہ ہو کبھی جہنم میں داخل نہ ہوگا، البتہ مجرموں کے لئے چند روز کا عذاب ضروری ہے، تعداد ایّام کے متعلق روایات مختلف ہیں، بعض سات روز کہتے ہیں بعض کا عقیدہ چالیس ایّام کا ہے، اور گیارہ ماہ یا ایک سال سے زیادہ تو کسی کا بھی عقیدہ نہیں۔

عیسائی کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف اس لئے سولی پر چڑھے کہ تمام بدکاروں کے لئے کفارہ بن جائیں، اب جو شخص بھی ان پر ایمان لے آئیگا اس کی

---

[۱] آج کل عربی مدرسوں میں تمام تر قوت تفسیروں اور ان کے حواشی میں صرف کی جاتی ہے، حالانکہ قرآن میں غور و فکر کرنا اور ہے اور تفسیروں میں بحث و نظر اور، جب لوگ علماء سے مسائل دریافت کرتے ہیں تو فقہ کی چند کتابوں کے حوالے لکھکر جواب دیا جاتا ہے کہ خدا کا یہی حکم ہے، کتاب و سنت پر اصحاب الرائے کے اقوال کو ترجیح دی جاتی ہے۔

دوزخ کی آگ حرام ہوگی۔[1]

اللہ تعالیٰ کے حضور میں کوئی چیز کام نہ آئیگی اس کے دربار میں مجازات عمل کا

[1] یہی عقیدہ اب مسلمانوں میں راسخ ہوتا جاتا ہے جس نے امام حسین علیہ السلام کے عشق میں دو آنسو بہادیئے، جو شیخ عبدالقادر رضی اللہ عنہ کے سلسلہ میں داخل ہوگیا وہ کبھی دوزخ میں نہ جائیگا، یہ خیالات فاسدہ یہودیوں اور عیسائیوں سے مسلمانوں میں آئے اور اب مسلمان اس پر اپنا دعویٰ جمائے بیٹھے ہیں۔

قرآن حکیم نے اگر ایک طرف کفارہ کا ابطال کیا لا تزر وازرۃ وزر اخری، تو دوسری جانب یہ بھی بتادیا کہ کسی بزرگ کی اولاد میں سے ہونا، یا کسی ولی کی طرف منسوب ہونا نجات کا باعث نہیں ہوسکتا، نجات دنیوی واخروی کے لئے عمل صالح اور ایمان باللہ کی ضرورت ہے، تمہیں معلوم ہے کہ نوح جیسے جلیل القدر پیغمبر نے اپنے بیٹے کی نجات کے لئے اللہ تعالیٰ سے التجا کی تو وہاں سے جواب ملا، انه ليس من اهلك ج انه عمل غير صالح (۱۱ : ۴۶) تمہیں یہ بھی یاد ہوگا کہ نوح و لوط کی بیویوں کو صرف اس لئے جہنم میں بھیجدیا گیا کہ انہوں نے عمل صالح کو اپنے پاؤں سے ٹھکرا دیا، اور پیغمبروں کی رشتہ داری کے گھمنڈ میں مغرور ہوگئیں: ضرب الله مثلا للذين كفروا امرات نوح وامرات لوط ط كانتا تحت عبدين من عبادنا صالحين فخانتهما فلم يغنيا عنهما من الله شيئا وقيل ادخلا النار مع الداخلين (۶۶ : ۱۰) تم اس کو بھی نہیں بھولو گے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہ صفا پر تمام قبائل مکہ کو بلا کر ان کے سامنے دعوت حق پیش کی تو اس خطبہ کے آخری الفاظ کیا تھے: یا فاطمة بنت محمد انقذی نفسك من النار فانی لا املك لك ضرا ولا نفعا، اے فاطمہ، محمد کی بیٹی، اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچالے، اس لئے کہ میں تیرے نفع و ضرر کا ذرہ برابر بھی مالک نہیں ہوں، پھر یہ کس درجہ جہل و نادانی ہے کہ بزرگوں کے نام لیوا ہونے کی بنا پر نجات کے دعویدار بنتے ہیں اور دل ایمان سے خالی ہیں۔

قانون یہ ہے :-

(۸۱) بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (۸۲) وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

کیوں نہیں، جس نے گناہ کمایا، اور اس کو اس کے گناہ نے گھیر لیا، یہی لوگ دوزخ کے ہیں، اسی میں ہمیشہ رہیں گے، اور جو ایمان لائے اور نیک کام کئے، وہی جنت کے لوگ ہیں، اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

جب ایک شخص بدی کا مرتکب ہو، اور اس سے بچنے کی کوشش نہ کرے، بلکہ اور زیادہ لذت وحظ نفس محسوس کرے، تا آنکہ ہدایت و رشد کے تمام راستے بند ہو جائیں، تو یہ شخص بداخلاقی کی آگ سے کبھی بھی محفوظ نہیں رہ سکتا، اور بڑی سے بڑی طاقت بھی اس کی نجات کا ذمہ نہیں لے سکتی، صرف اعمال صالحہ ہی سعادت اخروی کی کفالت کرتے ہیں، فمن يعمل مثقال ذرة خيرا يره ۝ ومن يعمل مثقال ذرة شرا يره (۹۹ : ۷ و ۸) اور فیصلہ یہ ہوگا : فاما من ثقلت موازينه ۝ فهو في عيشة راضية ۝ واما من خفت موازينه ۝ فامه هاوية ۝ وما ادراك ماهيه ۝ نار حامية ۝ (۱۰۱ : ۶ و ۷ و ۸ و ۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : انما هي اعمالكم ترد عليكم فمن وجد خيرا فليحمد الله ومن وجد غير ذلك فلا يلومن الا نفسه، یہ تمہارے اپنے اعمال ہیں جن کا احتساب تم سے کیا جا رہا ہے، اگر حسن ثواب ملا تو خدا کا شکر ادا کرو، ورنہ تم خود ملامت کے قابل ہو۔

عہود و مواثیق

اب تک یہودیوں کی غلط کاریاں ذکر کیں، علما کے امراض پر اصولی بحث کی، اور

ان کے عقائدِ باطلہ کی تردید کی، آئندہ بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معرفت خداوند قدوس سے جو عہد و پیمان کیا تھا، اس کا کیا حشر ہوا۔

(۸۳) وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا ٱللَّهَ وَبِٱلْوَٰلِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي ٱلْقُرْبَىٰ وَٱلْيَتَٰمَىٰ وَٱلْمَسَٰكِينِ وَقُولُواْ لِلنَّاسِ حُسْنًا وَأَقِيمُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتُواْ ٱلزَّكَوٰةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنكُمْ وَأَنتُم مُّعْرِضُونَ ○	اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرنا، ماں باپ، اور رشتہ دار اور یتیم اور مسکین سے نیک سلوک کرنا، اور لوگوں کو نیک بات کہنا اور نماز پڑھنا اور زکوٰۃ دینا، پھر تم میں سے تھوڑے سے آدمیوں کے سوا باقی سب پھر بیٹھے اور تم کو دھیان نہیں۔

بنی اسرائیل سے حسب ذیل باتوں کا عہد لیا گیا تھا:۔

(۱) اللہ کے سوا کسی دوسرے کی غلامی نہ کریں، اپنی ضروریات زندگی میں اسی سے طالب اعانت ہوں، اور سب سے باغی بن کر اس ایک کی اطاعت کا جوا اپنی گردن میں ڈال لیں تا سب کے سامنے سربلند ہوں، : میرے حضور تیرے لئے دوسرا خدا نہ ہووے، تو اپنے لئے کوئی صورت یا کسی چیز کی صورت جو اوپر آسمان پر یا نیچے زمین پر یا پانی میں زمین کے نیچے ہے مت بنا، تو اُن کے آگے اپنے تئیں مت جھکا اور نہ ان کی عبادت کر، کیونکہ میں خداوند تیرا خدا غیور خدا ہوں، (خروج ، ۲۰ : ۳ ، ۵)

(۲) چونکہ اللہ تعالےٰ کے بعد شان ربوبیت میں والدین ہی ہوتے ہیں، عاصی و نافرمانبردار اولاد پر احسان کرنے سے جی نہیں چراتے، اور اپنی اولاد کے لئے ہر کمال کے آرزومند رہتے ہیں، اس لئے اُن کے ساتھ بر و احسان کا حکم دیا، تو اپنے ماں باپ کو عزت دے تاکہ تیری عمر اس زمین پر جو خداوند تیرا خدا تجھے دیتا ہے دراز ہووے، (خروج ، ۲۰ : ۱۲) قرآن حکیم نے اس پر اور زیادہ زور دیا، ایک جگہ فرمایا:

وقضیٰ ربك الا تعبدوا الا ایاہ و بالوالدین احسانا ط اما یبلغن عندك الکبر

احدھما او کلھما فلا تقل لھما اف ولا تنھرھما وقل لھما قولا کریما ہ

واخفض لھما جناح الذل من الرحمۃ وقل رب ارحمھما کما ربینی صغیرا ہ

(۱۷: ۲۴ و ۲۵) اور تمہارے پروردگار نے حکم قطعی دیدیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا، اور والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا، اگر والدین میں کا ایک یا دونوں تیرے سامنے بڑھاپے کو پہونچیں تو ان کے آگے ہوں بھی نہ کرنا، اور نہ انکو جھڑکنا، اور ان سے کہنا تو ادب سے کہنا، اور محبت سے خاکساری کا پہلو ان کے آگے جھکائے رکھنا، اور دعا کرتے رہنا کہ اے میرے پروردگار! جس طرح انہوں نے مجھے چھوٹے سے کو پالا ہے، اسی طرح تو بھی ان پر رحم کیجیو۔

(۳) عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا یہ بھی دراصل ماں باپ کی محبت کا ایک جزو ہوتا ہے اور وہ صلہ رحمی کو دیکھکر خوش ہوتے ہیں: اور

ان میں سے جو میرے دوست ہیں اور میرے حکموں کو یاد رکھتے ہیں ہزاروں پر رحم کرتا ہوں (استثنار، ۵: ۲۰)

(۴) یتامی اور مساکین کی نصرت و اعانت: اور لاوی اس لئے کہ اس کا کوئی

حصہ اور میراث تیرے ساتھ نہیں اور مسافر اور یتیم اور بیوہ جو تیرے پھاٹکوں کے اندر ہیں آویں اور کھاویں، اور سیر ہو ویں (استثنار، ۱۴: ۲۹)

(۵) ان پر یہ بھی لازم کردیا گیا کہ لوگوں سے ہمیشہ اچھی بات کہیں اور نماز و زکوٰۃ کی پابندی کریں۔ مگر تم ان میں پورے نہ اترے۔

(۸۴) وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ	جب ہم نے تم سے قول لیا کہ آپس میں خون نہ کرنا، اور نہ اپنے لوگوں کو اپنے شہروں سے جلا وطن کرنا، پھر تم نے اقرار کیا، اور تم اقرار کرتے ہو، پھر وہی تم ہو
(۸۵) ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ	کہ اپنوں کو قتل کرتے ہو، اور نیز اپنوں میں سے کچھ

وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ز تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ط وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ط اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ج فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ج وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ط وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۸۶) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ز فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ○

لوگوں کے مقابلہ میں ناحق اور زبردستی ایک دوسرے کے مددگار بن کر ان کو ان کے شہروں سے جلاوطن کرتے ہو، اور اگر وہی لوگ قید ہو کر تمہارے پاس آویں تو فدیہ دیکر ان کو چھوڑا لیتے ہو حالانکہ ان کا نکال دینا ہی تم پر حرام تھا، تو کیا تھوڑی سی کتاب مانتے ہو اور تھوڑی سی کا انکار کرتے ہو، پھر جو کوئی تم میں سے یہ کام کرے اسکی اسکے سوا اور کچھ سزا نہیں کہ دنیا کی زندگی میں رسوا ہو، اور قیامت کے دن سخت سے سخت عذاب کیطرف لوٹائے جائیں، اور تمہارے کاموں سے اللہ بیخبر نہیں، یہی ہیں جنہوں نے آخرت دیکر دنیا کی زندگی خریدی، سو نہ تو انکے لئے عذاب ہی ہلکا کیا جائیگا اور نہ انکو مدد ہی پہونچیگی۔

علاوہ ان عہود و مواثیق کے جن کا ذکر گزشتہ آیت میں گذر چکا ہے ان سے تین اور باتوں کا بھی اقرار لیا گیا تھا:-

(الف) خانہ جنگی کر کے باہم خوں ریزی نہ کرنا کہ اس سے تمہاری اجتماعی قوت کو نقصان پہنچیگا اور حیات قومی فنا ہو جائیگی۔

(ب) اپنے عزیزوں کو ترک وطن پر مجبور نہ کرنا کہ ادھر تو تمہاری جماعت روز بروز کم ہوتی جائیگی اور اس طرف وہ جلاوطنی کی مصیبتوں اور تکلیفوں سے تنگ آ کر تمہارے دشمنوں کے ساتھ سازش کر لینگے، اور اس طرح غیروں کو تم پر حملہ کرنے اور تمہیں غلام بنانے میں آسانیاں پیدا کر دینگے۔

(ج) اپنی قوم میں سے کسی کو گرفتار ہوتا دیکھو تو فدیہ ادا کر کے اُسے چھڑا لینا

ان لوگوں نے پہلے دو حکموں کی تو پروا نہ کی مگر تیسرے کے لئے خوب اہتمام کرتے۔ واقعہ یہ ہے کہ مدینہ میں اوس اور خزرج کی دو قومیں بستی تھیں جن کی ہمیشہ آپس میں جنگ رہتی، شہر کے اطراف میں یہودیوں کے بھی دو قبیلے آباد تھے، بنو نضیر اور بنو قریظہ، ان میں سے اوس اور بنو قریظہ باہم ایک دوسرے کے حلیف تھے، ایسے ہی خزرج اور بنو نضیر آپس میں معاہد تھے، جب کبھی اوس و خزرج میں جنگ ہوتی ان قبائل کو بھی بوجہ دوستی اور حلافت کے ان کی مدد کرنی پڑتی، پھر جنگ کے نتائج میں جہاں اوس و خزرج بے خانماں برباد ہوتے، بنو قریظہ اور بنو نضیر بھی اس مصیبت سے محفوظ نہ رہ سکتے، اور یہ بالکل ظاہر بات ہے کہ بنو نضیر کے اخراج میں بنو قریظہ کا دخل ہوتا تھا اور بنو قریظہ کی جلاوطنی میں بنو نضیر حصہ دار ہوتے تھے، البتہ اتنا ضرور تھا کہ جب ایک جماعت میں سے کوئی اسیر ہو جاتا تو ہر جماعت اپنے دوستوں کو مال سے راضی کر کے قیدی کو رہا کرا دیتی، اگر کوئی ان کی اس حرکت پر اعتراض کرتا تو کہتے کہ اسیر کا رہا کرانا ہمارا مذہبی فرض ہے، اور جب لوگ یہ کہتے کہ قتل و اخراج میں تم نے کیوں دشمنوں کی مدد کی تو ان کا جواب یہ ہوتا کہ دوستوں کا ساتھ نہ دینا عار اور ننگ کی بات ہے۔

اس بیہودہ حرکت پر انہیں کہا گیا کہ مرض بھی برابر پیدا کرتے رہیں اور علاج بھی جاری رکھیں، یہ کہاں کی دانشمندی ہے، اس طرح کبھی مرض نہیں زائل ہوا کرتا، پس ایسے لوگوں کی سزا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے دنیا میں ذلیل کر دیے جائیں اور کبھی انہیں عزت نصیب نہ ہو۔ چنانچہ بنو نضیر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملک شام کیطرف جلاوطن کر دیا، بنو قریظہ کے مردوں کو قتل کیا اور عورتوں بچوں کو لونڈی غلام بنا لیا۔ سچ ہے ایسے لوگوں کی سزا میں نہ تو کسی قسم کی تخفیف ہو سکتی ہے اور نہ کوئی ان کی طرفداری کر سکتا ہے۔

ہمیشہ سے عادت ہی

(۸۷) وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ وَاٰتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُولٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ ○

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور ان کے بعد پے درپے رسول بھیجے، اور مریم کے بیٹے عیسیٰ کو صریح معجزے دیئے اور پاک روح سے ان کی امداد کی، تو کیا جب تمہارے پاس کوئی رسول تمہاری خواہش کے خلاف کوئی حکم لیکر آیا، تم تکبر کرنے لگے، پھر ایک جماعت کو جھٹلایا، اور ایک جماعت کو قتل کرتے۔

اگر ایک قوم سے احیاناً غلطی ہو تو درگذر کیا جا سکتا ہے مگر جس کی صدیوں سے یہی کیفیت ہو، اس کے لیے بہترین فیصلہ یہی ہے کہ اس کے ہاتھ سے ہمیشہ کے لیے تلوار چھین لی جائے، اور نوع انسانی کا ہر فرزند اس بدبخت قوم سے نفرت کرے۔

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ نوع انسانی پر معاش و معاد کے اعتبار سے کوئی بہت بڑی مصیبت نازل ہونے والی ہوتی ہے، اگر پہلے سے اس کا سدباب نہ کیا گیا تو نسل انسانی فنا ہو جائیگی، اس وقت حظیرۃ القدس میں ملاء اعلیٰ کے تمام فرشتوں کا اجتماع ہوتا ہے آپس میں مشورہ کرتے ہیں کہ بنی آدم کو اس داہیۂ کبریٰ سے کسی نہ کسی طرح بچانا ضروری ہے، اس بحث و مشاورہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نوع انسانی میں جو شخص ہر اعتبار سے بہترین ہو، اس کا انتخاب عمل میں آتا ہے، اور تمام ہمت اس کی تعلیم و تربیت میں صرف کی جاتی ہے، اس کے احکام و اوامر نافذ کرنے کے لئے مختلف صورتیں اختیار کی جاتی ہیں، ارباب فہم و فراست کے قلوب میں الہام کیا جاتا ہے کہ اس کے لئے یکسر اطاعت و انقیاد بن جائیں، اور اس طرح یہ پاک اور عزیز گروہ امۃ اخرجت للناس کی مصداق ہو۔

ازکی خلق اللہ کا قلب اب ملائکۃ الرحمٰن کے وحی و الہام کا مورد بن جاتا ہے،

اس کے دل میں ایسے خیالات وافکار پیدا کئے جاتے ہیں جو اس ملت کی رشد وہدایت اور فلاح وکامرانی کا باعث ہوں، کبھی تو وحی والہام سے اس کی اعانت ہوتی ہے، کبھی رویائے صادقہ مدد کا باعث بن جاتے ہیں، اور بعض اوقات ہاتفِ غیبی سے نصرت ویاوری ہوتی ہے، ایسا بھی ہوا ہے کہ فرشتوں نے آکر اس سے بالمشافہ گفتگو کی ہے،

فرشتوں کی یہ جماعت اس ازکیٰ خلق اللہ کے دوستوں اور مددگاروں کی امداد واعانت کو اپنا فرض اولین خیال کرتی ہے، ہر خیر وبرکت سے انہیں حصہ دیا جاتا ہے مگر جو لوگ اس کے مخالف ہوں، ان کو رحمت سے دور کر دیا جاتا ہے، ہر تکلیف و مصیبت ان پر طاری کی جاتی ہے کہ ان کی ہمتیں پست ہوں، اور دنیا وآخرت میں انہیں ذلت ورسوائی نصیب ہو۔

نبوت کے اصول وکلیات تو بہت کثرت سے ہیں، مگر ملاءِ اعلیٰ کا اجماع بھی ان میں سے ایک اصل ہے، اسی اجماع کا نام شریعت کی اصطلاح میں تائید روح القدس ہے، جب اس کی خیر وبرکت کسی نفس ذکی کے شامل حال ہو تو اس سے اس قدر عجیب وغریب برکات کا اظہار ہوتا ہے کہ عادۃً ان کا تصور بھی نہیں ہو سکتا، انھیں برکات کو معجزات سے تعبیر کرتے ہیں۔

یہی وہ تائید روح القدس ہے جس کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے، اسی لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے معجزات بکثرت ظہور میں آئے۔

ماتحت نہیں رہ سکتے

بنی اسرائیل کے متعلق اب تک دو باتوں کا فیصلہ ہوا ہے :۔

(۱) ان میں حکومت کرنے کی قابلیت نہیں، اور تلوار ان سے ہمیشہ کے لیے چھین لی گئی ہے۔

(۲) مسلمانوں کے ساتھ مل کر، اور ان کے دست وبازو بن کر دعوت وارشاد کا

فرض ادا نہیں کرسکتے۔

آئندہ بتایا جائیگا کہ ان لوگوں کو اپنے ماتحت رکھنا یا ان کے ساتھ کس قسم کے تعلقات قائم کرنا بھی جائز نہیں، ان کی تمام قومی زندگی دغابازی اور حیلہ سازی کی تاریخ ہے اسلئے مسلمانوں کی نگرانی میں رہ کربھی چین سے نہ بیٹھیں گے، بلکہ اوّل تو ان کی کوشش ہی یہی ہوگی کہ یہی امراض ومفاسد مسلمانوں میں پیدا ہوں، اور اگر اس میں ناکام رہے تو ان کے ساتھ دھوکا کرینگے، اور عین وقت پر نقصان پہنچائیں گے، اس لیے آگے چلکر یہ تعلیم دی جائیگی کہ ان سے ترک موالات کے بغیر چارہ ہی نہیں، اور ان کے ساتھ ہر قسم کے تعلقات وروابط رکھنا ممنوع وناجائز ہے۔

تقلید اعمیٰ

(۸۸) وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝	اور کہتے ہیں ہمارے دلوں پر غلاف ہے یہ نہیں بلکہ ان کے کفر کی بنا پر اللہ نے ان پر لعنت کی، پس بہت کم ایمان لاتے ہیں۔

ان لوگوں نے امانت کے ادا کرنے میں ہمیشہ خیانت سے کام لیا، وہ سر سے لیکر پاؤں تک گندگیوں اور نجاستوں سے بھرے ہوئے ہیں، غلف، اغلف کی جمع ہے، اس سے مراد وہ چیز لی جاتی ہے جو پردہ کے اندر ہو، اس عتبار سے آیت کے معنی یہ ہونگے کہ وہ لوگ اپنے آپ کو قرآن حکیم کی تعلیم سے بے نیاز خیال کرتے ہیں، اور غرور وتکبر کی بنا پر اس سے روگردانی اختیار کرتے ہیں سمجھتے ہیں کہ قرآن کی آیات بینات ان کے قلوب واذہان پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتیں۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ غلف، بضم اللام، غلاف کی جمع ہے، یہودی کہتے ہیں کہ ہمارے دل خزینہ دار علم وحکمت ہیں، ہمیں آپ کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کی ضرورت نہیں: فلما جاء تھم رسلھم بالبینٰت فرحوا بما عندھم من العلم (۴۰: ۸۳) اور جب

ان کے رسول ان کے پاس کھُلی ہوئی دلیلیں لیکر آئے تو یہ لوگ اپنی لیاقت علمی پر بڑے نازاں ہوئے۔

جن لوگوں کا یہ دعویٰ ہو کہ وہ مذہبی امام و پیشوا ہیں، ان کے پاس اللہ کی کتاب ہے، اور بغیر حساب و کتاب کے جنت میں داخل ہو سکتے، ان کا اوّلین فرض یہ ہونا چاہیے کہ حق بات کو ماننے کے لئے تیار رہیں، اور اس کو اس طرح لبیک کہیں جیسے بھوکا کھانے کو، اور پیاسا پانی کو پینے کے لئے لپکتا ہے، مگر ان بدبختوں کی حالت یہ ہے کہ ایسی تعلیم صحیح کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں جو دنیا و آخرت کی ترقی کا ذمہ لیتی ہے، اور تمسخر و استہزا کے طور پر کہتے ہیں کہ ہم لوگوں کو ان مضامین سے کیا تعلق، گویا دوسرے الفاظ میں ان کا فیصلہ یہ ہے کہ جس جگہ آج ہیں اس سے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھیں گے، پھر جس قوم نے خود ہی ترقی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہو، اپنے پاؤں میں اندھی تقلید کی بوجھل زنجیریں ڈال لی ہوں، ان سے اب کیا توقع ہو سکتی ہے،

وہ تنزل و انحطاط کو پسند کرتے ہیں، پس اس جمود و استبداد کی بنا پر جس کا سبب وحید وہ کفر و عصیان ہے جس کا انہوں نے پہلے ارتکاب کیا ان پر اللہ کی لعنت نازل ہو چکی ہے، ان کے دل حق بات قبول کرنے کے لئے تیار نہیں، اور اس کی رحمت ان سے روٹھ گئی ہے[۱]۔

(۸۹) وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ	اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ کتاب

[۱] مسلمان بھی اس کورانہ تقلید کا شکار ہو گئے، تحقیق و اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا، کتاب و سنت سے بعد و ہجر اختیار کیا، فقہ کی چند کتابوں میں مذہب کو مقید کر کے اصلی سرچشمہ حیات سے دور جا پڑے، اس کو غیر ضروری خیال کرنے لگ گئے، اور اس طرح فنبذوہ وراء ظهورهم کے مرتکب ہوئے، اسی الحاد فی العمل کا نتیجہ ہے کہ غیروں کے محکوم بن گئے ہیں، اور لعنتی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝

پہنچی جو اس کتاب کی تصدیق کرتی تھی جو اُن کے پاس ہے' اور اس سے پہلے کافروں پر فتح مانگا کرتے تھے، پھر جبکو اُنہوں نے پہچان رکھا تھا ان کے پاس آگیا' تو انکار کر بیٹھے: پس منکروں پر اللہ کی لعنت ہو۔

بنی اسرائیل کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ جس مثیل موسیٰ کی خبر کتاب استثنار کے اٹھارویں باب کی ۱۵ تا ۱۹ آیات میں دی گئی ہے[1]' ابھی تک دنیا میں ظاہر نہیں ہوا' وہ جانتے تھے کہ اس ذات مقدس کا ظہور مکہ مبارکہ میں ہوگا' اور اس کا مقام ہجرت مدینہ منورہ قرار پائیگا، اسی لئے انہوں نے بنو نضیر، بنو قریظہ' اور بنو قینقاع کو اطراف مدینہ میں آباد کر دیا تھا' ان کی اوس و خزرج سے ہمیشہ جنگ رہا کرتی' ان کی کوشش یہ رہتی کہ جس طرح ممکن ہو ان کا نام و نشان مٹا دیں، جب کبھی انھیں شکست ہوتی تو والہانہ و مضطربانہ دعا کرتے کہ خداوندا! نبی آخر الزماں کو بھیج کہ ہماری مصیبتوں اور تکلیفوں کے دن ختم ہوں' اور کفار پر غلبہ حاصل کریں، چنانچہ یہی باتیں انصار کے مسلمان ہونے کا باعث بنیں، گویا یہودی اپنی تمام کامیابیوں

---

[1] (پیشین گوئی کے الفاظ یہ ہیں) "خداوند تیرا خدا، تیرے لئے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کریگا' تم اس کی طرف کان دھریو' اس سب کی مانند جو تو نے خداوند اپنے خدا سے حورب میں مجمع کے دن مانگا' اور کہا کہ ایسا نہ ہو کہ میں خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سنوں' اور ایسی شدت کی آگ میں پھر دیکھوں' تاکہ میں مر نہ جاؤں' اور خداوند نے مجھسے کہا کہ انہوں نے جو کچھ کہا سو اچھا کہا' میں ان کے لئے اُن کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کرونگا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا' اور جو کچھ میں اُسے فرماؤنگا وہ سب اُن سے کہیگا" (کتاب استثنار ۱۵ تا ۱۹)

اور کامرانیوں کو اس وجود اقدس کے ساتھ وابستہ یقین کرتے تھے، کیونکہ انہیں وعدہ دیا گیا تھا کہ:۔

اگر تو کوشش کر کے خداوند اپنے خدا کی آواز سنے۔ ۔ ۔ تو خداوند تیرا تجھے زمین کی قوموں کی بہ نسبت سرفراز کریگا یہ ساری برکتیں تجھ پر آوینگی، اور تجھے پہنچینگی، (کتاب استثنار ۲۸ : ۱ و ۲)

آگے چل کر فرمایا:۔

اگر تو خداوند اپنے خدا کے حکموں کو حفظ کریگا اور اس کی راہوں پر چلیگا، تو خداوند تجھکو اپنے لئے پاک قوم بنائیگا، جیسا کہ اس نے تجھ سے قسم کی ہے، اور زمین کے سارے فرقے دیکھیں گے کہ تو خداوند کے نام سے کہلایا، سو وہ تجھ سے ڈرتے رہینگے (کتاب استثنار ۲۸ : ۹ و ۱۰)

اسی لئے قرآن حکیم ان سے بار بار مطالبہ کرتا ہے کہ اس رسول پر ایمان لے آؤ کہ تمہاری پیشین گوئیوں کی تصدیق ہو، مگر کورانہ تقلید، قومی روایات، اور تعصب وہٹ دھرمی کی بنا پر صاف انکار کر بیٹھے، حالانکہ جس طرح انہیں اپنی اولاد کے شناخت کرنے میں کبھی دھوکا نہیں ہوا، ایسے ہی وہ آپ کو بھی پہچانتے تھے، یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ:۔

(الف) موسیٰ علیہ السلام سے لیکر عیسیٰ علیہ السلام تک کسی نبی نے کتاب استثنار کی پیشین گوئی کے مطابق مثیل موسیٰ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، حالانکہ اس دوران میں ان کے پاس برابر نبی آتے رہے۔

(ب) عیسیٰ علیہ السلام کے بعد چھ سو برس تک بنی اسرائیل میں ایک بھی نبی نہ آیا۔

(ج) وہ مانتے ہیں کہ موسیٰ کی مانند جس نبی کی بعثت کا وعدہ دیا گیا ہے وہ بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیل میں سے ہوگا۔

(د) ضمناً اس حقیقت سے وہ آگاہ تھے کہ اب نبوت ہمارے خاندان سے منتقل ہوکر اسمٰعیل کے گھرانے میں چلی جائیگی۔

پس جب باوجود ان تمام حقائق ثابتہ کے وہ نہیں مانتے تو اُن پر خدا کی لعنت ہو، اور اس کی خیر و برکت سے دور ہوں۔

انکار کا سبب

(۹۰) بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ

اپنی جان کو اُنہوں نے برے مول خریدا کہ اللہ کے اتارے ہوئے کلام سے منکر ہوگئے، اس ضد پر کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اپنا فضل اتارے سو غصہ پر غصہ کما لائے، اور منکروں کے لئے ذلت کا عذاب ہے۔

ان لوگوں کی توقعات یہ تھیں کہ وہ نبی ان کی قوم میں سے ہوگا، ان کے غلط عقائد اور بیجا توہمات کی تائید کریگا، اور اس کا مذہب ان کی خواہشات و مالوفات کے مطابق ہوگا، مگر جب دیکھا کہ وہ نبی اسمٰعیل کے خاندان میں پیدا ہوا ہے، ان کے تمام عقائد باطلہ اور حریت فاسقہ کی مخالفت کرتا ہے، تو ان کے بغض و حسد کی کوئی حد نہ رہی۔

گویا باوجود شناخت کرنے کے ان کے انکار کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انہیں چھوڑ کر دوسری قوم کو اپنے فضل و اکرام کے لئے کیوں مخصوص کر لیا گیا، پس دوہرے غضب کے مستحق ہوئے ایک عیسیٰ علیہ السلام کے انکار کی بنا پر، اور دوسرے آپؐ کے نہ ماننے کی وجہ سے، ایسے کافروں کو اسی دنیا میں محکومی کی ذلیل زندگی بسر کرنی پڑے گی[1]۔

---

[1] یہی حال آج کل کے علمائے سوء اور ارباب عمائم کا ہے کتاب و سنت کی تصریحات کا انکار صرف اس بنا پر کر دیتے ہیں کہ ان کی مزعومہ تفاسیر جلالین، بیضاوی، ابن کثیر، فتح البیان، خازن، کشاف اور مدارک میں نہیں ہیں، جمود و استبداد نے ان کے دل و دماغ کو معطل کر دیا ہے، تقلید اعمیٰ نے ان کی سوچنے اور غور کرنے کی قوت کو سلب کر لیا ہے، کسی عربی مدرسہ میں (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۵ پر ملاحظہ ہو)

پابندی توراۃ کا دعویٰ غلط ہے

(۹۱) وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا وَ یَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ وَ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِیَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝

اور جب ان سے کہا جاتا ہی کہ اللہ کے اتارے ہوئے کلام پر ایمان لاؤ تو کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں جو ہم پر نازل کیا گیا ہی، اور جو اس سے پیچھے آیا ہی اسکو نہیں مانتے، حالانکہ وہ حق ہی جو انکے پاس ہی اسکو سچ بتاتا ہی، ان سے کہو کہ اگر تم مومن تھے تو اس سے پہلے خدا کے پیغمبروں کو کیوں قتل کرتے تھے۔

علمائے یہود نے اعتراض کیا تھا کہ قرآن ہم پر کیوں نہیں نازل کیا گیا اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن ان تمام پیشین گوئیوں کی تصدیق کرتا ہے جو توراۃ میں موجود ہیں، پھر انکار کی کوئی وجہ نہیں،

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم صرف توراۃ کو مانینگے، اور کسی کتاب کو اپنا دستور العمل بنانے کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۴) قرآن کی تعلیم نہیں ہوتی، جلالین و بیضاوی اور بعض جگہہ مدارک کا درس ضرور ہوتا ہے، مگر قرآن پڑھنا اور چیز ہے، اور زید و بکر کے اقاویل میں غور و فکر کرنا اور، ہم حنفیوں کی یہ کیفیت ہے کہ قرآن کی علمی تفسیر، حدیث سے بہت دور ہیں، اکثر مواقع میں ہمیں شوافع اور حنابلہ کے مقابلہ میں ضعیف و کمزور احادیث سے تمسک و اعتصام کرنا پڑتا ہے، ہدایہ کو اٹھا کر دیکھ لیجئے، ہماری سب سے زیادہ قابل اعتماد اور مستند فقہ کی کتاب ہے، اس کی نسبت علامہ زیلعی بار بار اپنی تخریج میں لکھتے ہیں کہ صاحب ہدایہ متعدد جگہہ موضوع احادیث سے اپنے مذہب کو ثابت کرتے ہیں، بہرحال علمائے سو اور اصحاب الرائے نے کتاب و سنت سے بعد و ہجر اختیار کیا، اس لئے غضب بالائے غضب کے مستحق ہوئے اور حکومت و سرفرازی کے لئے دوسروں کو چن لیا گیا: قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓی اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ (۶: ۶۵) کہو کہ وہی اس پر قادر ہے کہ تمہارے اوپر سے کوئی عذاب تمہارے لئے نکال کھڑا کرے۔

لئے تیار نہیں، اس پر ان سے کہا جاتا ہے کہ اگر یہ حقیقت میں ایسا ہی ہے جیسا تم کہتے ہو تو ان انبیاؑ کو کیوں قتل کیا جو صرف توراۃ کی دعوت دیتے تھے۔ پس معلوم ہوا کہ پابندی توراۃ کا دعوی کرنا سرے سے غلط ہے، تم ہمیشہ سے کتاب الہی کے منکر رہے ہو۔

(۹۲) وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ (۹۳) وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاُشْرِبُوْا فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

اور تمہارے پاس موسیٰ صریح معجزے لیکر آئے پھر تم نے اس کے پیچھے بچھڑا بنالیا، اور تم ظالم تھے، اور جب ہم نے تم سے عہد لیا، اور طور کو تم پر بلند کیا، ہم نے کہا جو ہم نے تم کو دیا اس کو قوت کے ساتھ پکڑو اور سنو، انہوں نے جواب دیا، ہم نے سنا اور مانا نہیں، اور ان کے کافر ہونے کی وجہ سے گوسالہ کی دوستی انکے دلوں میں رچ گئی، تم کہو اگر تم ایمان والے ہو تو تمہارا ایمان بری چیز کا حکم کرتا ہے۔

توراۃ کے تم پابند نہ بنے، اور انبیا مجددین کو برابر قتل کرتے رہے، تم نے موسیٰ سے پابندی توراۃ کا عہد کیا مگر اعمال حیات سے ثابت کر دیا کہ اس کتاب کو اپنی زندگی کا دستور العمل نہ بناؤ گے، اس انکار و جحود کا اصلی سبب یہ تھا کہ کفر و باطل پرستی نے تمہارے دلوں میں روپیہ کی محبت پیدا کر دی تھی، تم نے مال و دولت کو اپنا قبلہ بنا لیا تھا، اور تمہارے دلوں نے کفر کو اس طرح قبول کر لیا تھا، جیسے کپڑا رنگ کو جذب کر لیتا ہے۔

اگر ایمان کے یہی کارنامے ہیں، اور وہ ایسی ہی غلط کاریوں اور بیہودہ حرکتوں کا حکم دیتا ہی تو کیا پھر اس سے بدترین کوئی اور ایمان بھی ہو سکتا ہے ضمیر فروشی کرو، دولت کو اپنا امام بنالو، اور روپیہ کے آگے سربسجود ہوجاؤ اس پر بھی مومن رہو، کیا خوب!

آخرت کے متعلق خیالات

یہاں تک ان کی دنیاوی زندگی، ان کے روزمرہ کے کارناموں، اور ان کی عقائد و

اخلاق پر بحث ہوئی ہے، اب بیان ہوتا ہے کہ باوجود ان ناشائستہ حرکتوں کے اپنی نجات کے متعلق انہوں نے کیا کیا منصوبے باندھ رکھے ہیں۔

(۹۴) قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ

تم کہہ دو، اگر اللہ کے ہاں لوگوں کے سوا آخرت کا گھر تمہیں ملنا ہے، اگر سچے ہو تو مرنے کی آرزو کرو،

(۹۵) وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ

اور جو کچھ ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے اس کی وجہ سے کبھی یہ آرزو نہ کرینگے، اور اللہ گنہگاروں کو خوب جانتا ہے،

(۹۶) وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ○

اور تو ان کو سب لوگوں سے زیادہ زندہ رہنے کے لئے حریص پائیگا، بلکہ مشرکین سے بھی بڑھ کر حریص، ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ کاش اس کی عمر ہزار ہزار سال کی ہو، اور اتنا جینا عذاب سے اس کو بچا نہ دیگا، اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ اُسے دیکھ رہا ہے۔

دولت کو امام بنانا، توراۃ کی دعوت پر سمعنا وعصینا کہنا، اور انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنا، پھر اس پر کہنا کہ لن یدخل الجنۃ الا من کان ھوداً او نصریٰ، (۲ : ۱۰۹) اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہی اللہ کے محبوب اور برگزیدہ ہیں پس اگر وہ اپنے دعوائے محبت میں سچے ہیں تو اللہ کے نام پر مرنے کے لئے تیار رہوں، اس کے قانون کی نشر و اشاعت میں لگ جائیں، اور اس کے لئے ہر قسم کی تکلیف برداشت کریں، جو شخص صحیح تعلیم کی خاطر اپنی ہر متاع حیات قربان کرنے کو تیار نہیں، اسے کوئی حق حاصل نہیں کہ اپنے آپ کو محبوب الٰہی کے نام سے مشہور کرے، اور اس شخص پر ہرگز اعتماد نہیں ہو سکتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نصاریٰ نجران کو اس امر کی دعوت دی: تعالوا ندع ابناءنا وابناءکم ونساءنا ونساءکم وانفسنا وانفسکم ثم نبتھل فنجعل

لعنت اللہ علی الکذبین (۳ : ۵۴) کہ ہم دونوں اپنی اپنی تعلیم پر قربان ہونے کو تیار ہوں، مگر جھوٹوں سے یہ توقع کہاں، یہی حال ان یہودیوں کا ہے، یہ لوگ اپنی جانوں کو زیادہ عزیز سمجھتے ہیں، اور خوب جانتے ہیں کہ مرنے کے بعد ہی ہمارے اعمال فاسقہ کا احتساب شروع ہو جائیگا، اس لئے موت کی آرزو کرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کو ان ظالموں کی حقیقت کا پہلے ہی سے علم تھا، مگر عام لوگوں میں اپنی محبت الٰہی کا راگ الاپتے تھے، اب اس مطالبہ کی بنا پر ان کی قلعی کھل گئی، اور کسی شخص کو ان کے ظاہری تقدس سے دہوکا نہ ہوگا۔

مشرکین کی حالت یہ ہے کہ قوم اور وطن کے لئے اپنی جانیں تک لڑا دیتے ہیں، عزت و ناموس، اور شہرت و ناموری کی خاطر ہر چیز قربان کر دیتے ہیں، مگر یہ لوگ اہل علم ہونے کے باوجود اتنی تکلیف بھی گوارا نہیں کر سکتے، اور مدت ہائے دراز تک دنیا میں رہنا پسند کرتے ہیں، ایک جاہل آدمی اگر ایسا کرے، تو اس کو معذور قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن ایک تعلیم یافتہ کا سب سے بڑا جرم یہی ہے کہ وہ تعلیمات صادقہ پر اپنے آپ کو قربان نہ کر سکے۔

جو لوگ مذہبی جذبات کو پاؤں تلے روند کر دنیا میں رہنا چاہتے ہوں، وہ ہرگز عزت کے قابل نہیں، اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو نہایت ہی باریک بین نظر سے دیکھ رہا ہے، ان کو ضرور ذلیل کر کے غیروں کا محکوم بنا دیگا۔[۱]

---

[۱] گزشتہ آیات میں علمائے یہود کی حسب ذیل خرابیاں ذکر کی گئی ہیں:-

(الف) اپنی کتاب پر عمل کرنے کے دعویدار ہیں، مگر ان کا یہ دعوی بھی غلط ہے۔

(ب) ان کا نصب العین اور مقصد حیات جمع مال و دولت ہے۔

(ج) خدا کے ساتھ محبت کا اظہار کرتے ہیں مگر اس کے لئے قربانی نہیں کر سکتے۔

(د) مذہبی جذبات کو پامال کر کے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۹ پر ملاحظہ ہو)

قابل نفرت ہیں

(۹۷) قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ	کہدو جو جبرئیل کا دشمن ہوگا سو اس نے تو اللہ کے
فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللهِ مُصَدِّقًا	حکم سے تیرے دل پر یہ کلام اتارا ہے، جو کلام اسکے
لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ	سامنے ہے اسکو سچ بتاتا ہے اور مومنین کے لئے
(۹۸) مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ	ہدایت وخوش خبری ہے، جو کوئی اللہ کا، اور اسکے
وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَإِنَّ اللهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ	فرشتوں کا، اور رسولوں کا، اور جبریل کا، اور میکائیل
(۹۹) وَلَقَدْ أَنْزَلْنَآ إِلَيْكَ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ ج وَمَا	کا دشمن ہوگا، تو اللہ ان کافروں کا دشمن ہے اور ہم نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۸) اسی ترتیب سے اگر آپ امت مسلمہ کے علمائے سوء کے حالات کی تفتیش کریں تو یہ تمام خرابیاں ان میں نظر آئینگی۔

(۱) دعوی تو فقہ کی پابندی کا ہوتا ہے مگر عملاً وہ اپنے بزرگوں اور پیروں کے غیر مستند اقوال کو مذہب بنائے بیٹھے ہوتے ہیں، ایک شخص کی تمام زندگی گناہوں میں بسر ہوتی ہے، مرتے وقت اس کے وارث ایک قرآن بخش دیتے ہیں اور یہ بدبخت عالم کہتے ہیں کہ اسکے تمام گناہ معاف ہوگئے، ایک آدمی سال بھر نماز نہیں پڑھتا، جمعۃ الوداع کے روز وہ دو رکعت قضائے عمری کی نماز پڑھ لیتا ہے، اور اس کی تمام نمازیں معاف ہوجاتی ہیں۔

(۲) شادی اور موت کے وقت جن رسوم کو جائز قرار دیا جاتا ہے، وہ سب کی سب مسلمانوں نے عجم سے مستعار لیں، اور صرف روپیہ کمانے کی خاطر ان کو مذہبی رنگ دیدیا۔

(۳) اگر خدا سے محبت ہوتی تو اپنی زندگیاں اشاعت اسلام اور اعلائے کلمۃ الحق کے لئے وقف کر دیتے۔

(۴) غیروں کے ساتھ مل کر، غلط فتاوی شایع کرکے، اور مسلمانوں کو دھوکا دے کر زندہ رہنا چاہتے ہیں، آج ترکوں پر جس قدر مصیبتیں اور تکلیفیں نازل ہورہی ہیں، یہ ہندوستان کے علمائے سوء اور فقہائے دنیا کے فتاوے کے دردناک نتائج ہیں۔

يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ○ | تیری طرف واضح آیتیں اتاری ہیں، اور بدکار ہی انسے منکر ہونگے،

یہودی کفر و ضلالت کے انتہائی مراتب پر پہنچ چکے ہیں، ان کی ایک ایک غلطی واضح کردی گئی ہے، آخر میں انہوں نے پابندی توراۃ کا دعوی کیا مگر جھوٹے ثابت ہوئے، اور انہیں تسلیم کرنا پڑا کہ بغیر کسی جدید وحی والہام کے ان کی اصلاح نہ ہوگی، اس لئے انہوں نے یہ دریافت کرنا شروع کیا کہ آپ کے پاس وحی کون لاتا ہے، آپ نے فرمایا، جبرئیل، انہوں نے جواب دیا کہ وہ تو ہمارا قومی دشمن ہے، جب کبھی ہم پر کوئی بلا نازل ہوئی اسی کے ذریعہ سے ہوئی، اگر کوئی دوسرا فرشتہ وحی لاتا تو ہم آپ کو نبی تسلیم کرلیتے، اس کے جواب میں ان سے کہا گیا کہ وہ اللہ کے حکم سے نازل ہوتا ہے، اس تعلیم سے تمہاری کتابوں کی تصدیق ہوتی ہے، اور ارباب ایمان واخلاص کے لئے ہدایت وبشارت ہے۔

تمہیں جبرئیل سے عداوت اس لئے ہے کہ اس نے تمہیں منصب نبوت سے محروم کردیا، اور بنی اسمٰعیل کو مکالمہ الٰہی کے لئے منتخب کیا، اسی لئے تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنی کا اظہار کررہے ہو، مگر یاد رہے کہ جو آپ کا دشمن ہے وہ اللہ، اس کے ملائکہ، اور تمام رسولوں کی دشمنی اپنے سر لیتا ہے، اس آیت میں میکائیل کا نام خاص طور سے ذکر کیا گیا کیونکہ وہ لوگ اس کو اپنا دوست خیال کرتے تھے: اور اس وقت میکائیل وہ بڑا سردار جو تیری قوم کے فرزندوں کی حمایت کے لئے کھڑا ہے (دانی ایل ۱۲: ۱) اب اس سے بھی دوستی کی توقع نہ رکھو کیونکہ وہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دے گا۔

تعلیم کے اصول کو دیکھئے اس کے نتائج پر نظر ڈالئے، سچائی معلوم کرنے کا صحیح طریق یہی ہے، اس تعلیم پر عمل کرکے دیکھو، اس کے نتائج تمہیں معلوم ہوجائینگے، البتہ بداخلاق تو سوائے انکار کے اور کچھ نہیں جانتے۔

(۱۰۰) اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ

(۱۰۱) وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

آیا کیا، جب یہ عہد باندھیں گے تو ان میں سے ایک جماعت اسکو پھینک دیگی، بلکہ ان میں سے اکثر یقین نہیں کرتے، اور جب اللہ کی طرف سے ان کے پاس رسول پہنچا جو اس کتاب کی تصدیق کرتا ہے جو انکے پاس ہے تو کتاب پانیوالوں میں سے ایک جماعت نے اللہ کی کتاب کو اپنی پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا، گویا جانتے ہی نہیں۔

کتاب پر عمل کرنا تمہارا مقصد نہیں، تمہاری قومی خصوصیت ہی عہد کرنا اور توڑنا، تمہارے پاس مختلف اوقات میں توراۃ کی تصدیق کرنے والے رسول آتے رہے مگر تم نے ان کی کوئی پروا نہ کی، اب بھی مسلمانوں پر الزام رکھنے کے لئے تم نے یہ دریافت کیا کہ وحی لانے والا کون ہے، ورنہ یہ مقصد ہرگز نہ تھا کہ صداقت ظاہر ہونے کے بعد اس کو مان بھی لوگے۔

قاعدہ یہ ہے کہ جب ایک قوم اپنی تمام دنیاوی عزتوں کو کھو بیٹھتی ہے تو اس وقت یہ کہنا شروع کر دیتی ہے کہ مذہب کو دنیا سے کوئی تعلق نہیں، وہ صرف روحانیت کی تعلیم دیتا ہے، اور آخرت کی کامیابی کا ذمہ لیتا ہے، مذہبی لوگ دنیا کی حکومت و سرفرازی اور عزت و رفعت سے محروم رہتے ہیں، اس لئے تزکیہ نفس کی ضرورت ہے کہ یہی جہاد اکبر ہے، اور اسی پر نجات کا دار و مدار۔

کسی نبی کی تعلیم روحانیات تک محدود نہیں ہوتی، بلکہ وہ دین اور دنیا، مذہب اور سیاست، روحانیت و مادیت، دونوں کی جامع ہوتی ہے[لہ]۔

لہ آج کل مسلمان بھی اس مرض میں مبتلا ہیں، حالانکہ کتاب و سنت کی تصریحات پکار پکار کے کہہ رہی ہیں کہ سیاست اور مذہب ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں، اس ذیل میں ہمارے سامنے سب سے پہلے سورہ نور کی یہ آیت آتی ہے:۔ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۲ پر ملاحظہ ہو)

(۱۰۲) وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ج وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ | اور اس علم کے پیچھے پڑ گئے جسکو شیطان، سلیمان کی سلطنت میں پڑھتے تھے، اور سلیمان نے کفر نہیں کیا،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۱) وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصّٰلحٰت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ص ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا (۲۴ : ۵۴) | تم میں سے جو لوگ ایمان لائے، اور نیک عمل کرتے ہیں، ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ انکو ملک کی خلافت ضرور نوازش کریگا، جیسے ان لوگوں کو حکومت نوازش کی تھی جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں، اور جس دین کو اس نے انکے لئے پسند کیا ہے، اسکو انکے لئے جما کر رہیگا، اور خوف خطر جو ان کو لاحق ہے اس کے بعد ان کو اس کے بدلے میں امن دیگا،

اس آیت میں مسلمانوں کو خلافت ارضی، دین کے جماؤ، اور امن بعد از خوف کا وعدہ دیا ہے، اور یہ وعدہ پورا ہو کر رہا۔ دوسری جگہہ فرمایا: لا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین (۳ :   ) اور ہمت نہ ہارو، اور آزردہ خاطر نہ ہو، اور اگر تم سچے مسلمان ہو تو آخر کار تمہارا ہی بول بالا ہے، سورہ صف میں آیا: ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دیکر بھیجا کہ تمام ادیان عالم پر اس کو غلبہ و اقتدار نوازش کرے، اس کے ہم معنی سورہ بقرہ میں فرمایا: وکذالک جعلنٰکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا، شہید کے معنی ہی یہی ہیں کہ لوگوں کا نگران کار د محافظ ہو، اور تمام قومیں اس کی سرپرستی میں کام کریں، موسیٰ کو جب فرعون کے پاس بھیجا گیا تو ان کا صرف ایک ہی مطالبہ تھا: ان ادوا الی عباد اللہ اور فارسل معنا بنی اسرائیل، یہی سیاست کا نچوڑ اور مغز تھا، جو موسیٰ کی نبوت کا مقصد تھا، ان کے علاوہ قرآن حکیم کی اور آیات بھی پیش کی جا سکتی ہیں، مگر طوالت کے خوف سے ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

احادیث بھی اس موضوع پر اس کثرت سے ہیں کہ ان کا استقصا اور احاطہ بہت مشکل ہے، صرف ایک حدیث پر ہم اکتفا کرتے ہیں۔ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۳ پر ملاحظہ ہو)

كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَآ أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ	بلکہ شیطانوں نے کفر کیا، لوگوں کو جادو سکھاتے اور اس علم کی پیروی کی جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۲) شکونا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو متوسد بردۃ لہ فی ظل الکعبۃ، قلنا الا تدعو اللہ لنا؟ قال: کان الرجل فی من قبلکم یحفر لہ فی الارض فیجعل فیہ فیجاء بالمنشار فیوضع علی راسہ فیشق وما یصدہ ذلک عن دینہ و یمشط بامشاط الحدید ما دون لحمہ من عظم وعصب، وما یصدہ ذلک عن دینہ، واللہ لیتمن ھذا الامر حتی یسیر الراکب من صنعاء الی حضرموت لا یخاف الا اللہ و لکنکم تستعجلون، ہجرت سے پیشتر بعض صحابہ نے عرض کیا کہ اعدائے حق کے ظلم وجور کی حد ہوگئی، آپ ہمارے لئے دعا نہیں کرتے؟ فرمایا تم سے پہلے بھی ایسے لوگ گزر چکے ہیں کہ ظالموں نے ان کو گڑھوں میں کھڑا کرکے آرہ سے چیر دیا مگر اس پر بھی انہوں نے حق سے منہ نہ موڑا، اور ایسا ہوا کہ حق پرستوں کی کھالوں پر لوہے کی کنگھیاں پھرائی گئیں جو گوشت کو ہڈی اور پٹھے سے جدا کر دیتی تھیں لیکن اس کو بھی انہوں نے برداشت کرلیا، اور حق سے انحراف نہ کیا، خدا کی قسم! دعوت حق کا جو کام شروع ہوا ہے وہ پورا ہو کر رہیگا، یہاں تک کہ وہ وقت قریب ہی جب یمن سے حضرموت تک ایک سوار چلا جائیگا اور اس کے دل میں اللہ کے سوا اور کسی کا خوف نہ ہوگا، یعنی راہ میں ہر جگہ صرف مسلمان ہی ہونگے، کوئی غیر نہ ہوگا جو حملہ کرے یا لوٹے، یہ ہونے والا ہے مگر تم جلدی کرتے ہو۔

ایک اور حدیث میں عدی بن حاتم سے بخاری روایت کرتے ہیں، لترین الظعینۃ تحمل من الحیرۃ حتی تطوف بالکعبۃ ولتفتحن کنوز کسری، آپ نے فرمایا: عدی، اگر تم جیتے رہے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے کہ حیرہ سے ایک پردہ نشین عورت تن تنہا سفر کرکے آئیگی اور کعبہ کا طواف کریگی، اور اس تمام سفر میں اللہ کے سوا کوئی چیز اس کے لئے موجب خوف نہ ہوگی، اور قریب ہے کہ مسلمانوں کے لئے کسریٰ کے خزانے کھول دیے جائیں۔ عدی کہتے ہیں کہ میں زندہ رہا اور دونوں باتیں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں، وکنت فی من افتتح کنوز کسری! (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۴ پر ملاحظہ ہو)

وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَاۤ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ	وماروت پر اترا، اور وہ کسی کو نہ سکھاتے جب تک نہ کہتے کہ ہم آزمائش ہیں، پس تم کافر مت بنو، پھر ان سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۳) کتاب وسنت کے یہ چند اشارات صاحب فہم کے لئے کافی ہیں، کس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشین گوئی مسلمانوں کے حق میں ثابت ہو رہی ہے کہ لتتبعن سنن من کان قبلکم حتیٰ کہ لو دخلوا جحر ضب لدخلتموہ بھی پورا ہو گیا، اب انتظار کرنے والوں کے لئے بجز انتظار غفلت کے اور کچھ باقی نہ رہا، اس لئے کہ یہودیوں کی مغضوبیت، نصاریٰ کی ضلالت، مشرکین کی بت پرستی، اقتدار بغیر سنت ان میں سے ہر ایک نحوست مسلمانوں پر چھا گئی، اور اب بطن الارض خیر من ظھرھا کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا، زمین کے کیڑوں کے لئے زندگی میں عیش ہے، اور جنگل کے درندوں کے لئے جینے میں راحت، مگر ایک مسلمان کے لئے اب زمین کی پیٹھ پر کوئی خوشی باقی نہیں رہی مگر یہ کہ غلامانہ اور محکومانہ زندگی بسر کرے اور اپنی ذلتوں کا بوجھ اٹھائے اس کے نیچے چلا جائے!

نہ گلم، نہ برگ سبزم، نہ درخت سایہ دارم
ہمہ حیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت ما را؟

امت مسلمہ کے علماء سوء کی کس قدر بدبختی ہے اور کس طرح یہودیوں کے نقش قدم پر چلے جا رہے ہیں کہ اجنبی حکومت کی خاطر مسلمانوں کو نقصان پہنچاتے ہیں، جہاد فی سبیل اللہ، اور قتال فی سبیل الحق والحریت سے روکتے ہیں۔ ترکوں کے خلاف فتاوے شائع کرتے ہیں، مسلمانوں کو کافر بنانے کی انہیں بہت مشق ہے، خانہ کعبہ کی بے حرمتی ہوتی ہے، اور ٹس سے مس نہیں ہوتے، خلیفۃ المسلمین سے جو بدبخت بغاوت کرتا ہے، اس کو مبارکباد دینے کے لئے ہندوستان سے سفر کرتے ہیں، ان تمام حرکات کو تعلیم قرآن کے مطابق خیال کرتے ہیں، اور اگر کسی شخص نے قرآن کی طرف پشت کر دی تو فوراً فنبذوہ وراء ظھورھم کی تلاوت کر کے اس پر کفر اور ارتداد عن الاسلام کا فتویٰ صادر کر دیتے ہیں۔ پس وقت آ گیا ہے کہ آج ایک نئی صف ماتم بچھائی جائے اور ان ارباب عمائم کی بدکرداریوں پر سینہ کوبی کی جائے۔

بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ؕ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۱۰۳) وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝

سیکھتے وہ چیز جس سے مرد اور اس کی عورت میں جدائی ڈالتے، اور اللہ کی اجازت کے بغیر وہ اس جادو سے کسی کو نقصان نہ پہنچا سکتے، اور وہ چیز سیکھتے ہیں جس سے ان کو نقصان ہو اور فائدہ نہیں، اور وہ جانتے ہیں کہ جو کوئی جادو کا خریدار ہوا اسکے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں، اور وہ بہت بری چیز ہے جس پر انہوں نے اپنی جانوں کو بیچا ہے کاش انہیں سمجھ ہوتی، اور اگر وہ یقین لاتے اور پرہیز کرتے، تو اللہ کے پاس بہتر بدلہ تھا، کاش انہیں سمجھ ہوتی۔

مذہبی لوگوں کی عزت و حرمت کا اصلی سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ کتاب الٰہی کے محافظ، اور اوس کی تعلیمات کے ناشر ہوتے ہیں، لیکن جس وقت اس فرض جلیل کو ترک کر دیتے ہیں تو اُن کی عزّت بھی جاتی رہتی ہے، اور وہ شرالبریہ بن جاتے ہیں، ان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ باوجود اس بدعملی و بدکرداری کے لوگ ان کا احترام کریں، نذریں اور ہدیے انکے سامنے پیش ہوں، اور عوام الناس انہیں اپنا امام و پیشوا تسلیم کریں، چونکہ ان کے پاس صحیح تعلیم نہیں ہوتی، اور اخلاق فاضلہ سے دور رہتے ہیں، اس لئے خدع و فریب، اور حیلہ سازی سے کام لیکر اپنی عزّت برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، ان آیات میں اس قسم کی شرارتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

سورۂ نمل میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے معجزات بیان کئے گئے ہیں، مگر بنی اسرائیل نے ان کی ذات اقدس کی طرف صدہا مزخرفات اور مافوق الفطرت عجائب و غرائب منسوب کئے جیسے مسلمانوں میں امیر حمزہ، ایک فرضی ہیرو کی نسبت حیرت انگیز واقعات بیان کئے جاتے ہیں، سلاطین کی پہلی کتاب میں سلیمان کی طرف کفر، اور معبودان باطل کی پرستش بھی منسوب کی گئی ہے:

"اس کی سات سو جورویں و بیگمات تھیں، اور تین سو حرمیں، اور اس کی جورووں نے اس کے دل کو پھیرا، کیونکہ ایسا ہوا کہ جب سلیمان بوڑھا ہوا تو اس کی جورووں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کیا، اور اس کا دل خداوند اپنے خدا کی طرف کامل نہ تھا جیسا اس کے باپ داؤد کا دل تھا ...... اور سلیمان نے خداوند کی نظر میں بدی کی، اور اس نے خداوند کی پوری پیروی اپنے باپ داؤد کی طرح نہ کی ...... سو از بسکہ اس کا دل خداوند اسرائیل کے خدا سے جو اسے دوبارہ دکھائی دیا برگشتہ ہوا، اسلئے خداوند سلیمان پر غضبناک ہوا" (۱- سلاطین، ۱۱: ۳ و ۴ و ۶ و ۹)

یہودیوں نے فسق و فجور کی راہ اختیار کی، حضرت سلیمان کی حکومت میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑکاتے، اور ان تمام باتوں کو سلیمان کی طرف منسوب کرتے، قرآن نے ایک جلیل القدر پیغمبر کی معصومیت اور طہارت کا اعلان کیا، اور بتادیا کہ خدا کا پیغمبر کبھی کفر و مشرکانہ رسوم کا مرتکب نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ تمام تر شرارت یہودیوں کی ہے جو ایک پیکر قدوسیت اور مجسمہ پاکبازی کو کافر بناتے ہیں، اور اس طرح اعلان کرتے ہیں کہ عہد عتیق میں لفظی و معنوی تحریف ہوئی ہے، صحائف آسمانی میں سے قرآن صرف ان امور کی تصدیق کرتا ہے جو حقیقت میں ایسے ہی ہیں اور جہاں غلطی ہوتی ہے، فوراً اس سے علیحدگی اختیار کرتا ہے، اور سچائی کا اعلان کر دیتا ہے۔

بابل، عہد قدیم کا نہایت ہی بارونق اور شاندار شہر تھا، کسی زمانہ میں وہ تہذیب و شائستگی کا مرکز تھا، اس کی جائے وقوع دریائے فرات کے کنارے تھی عراق عرب کا دارالسلطنت ہونا اس کی شہرت و عظمت کا اور زیادہ باعث بن گیا، اس کے کھنڈرات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عظیم الشان شہر تمدن و حضارت کا گھر تھا، کہتے ہیں کہ اس کی فصیل ۵۵ میل لمبی، ۳۴۰ فٹ بلند اور ۸۵ فٹ چوڑی تھی، جس وقت بخت نصر نے یہودیوں کو تباہ کیا ہے یہ شہر اپنے انتہائی عروج پر تھا۔

یہودی قید ہو کر بابل میں آباد ہو گئے، اب ان کے لئے حکومت کی جگہ غلامی، عزت کی بجائے ذلت، اور تخت سلطنت کی جگہ گرد مذلت و نکبت تھی، خدا کا وعدہ ان کے حق میں پورا ہو کر رہا۔ وقضینا الی بنی اسرائیل فی الکتب لتفسدن فی الارض مرتین ولتعلن علوا کبیرا o فاذا جاء وعد اولٰهما بعثنا علیکم عبادا لنا اولی باس شدید فجاسوا خلٰل الدیار وکان وعدا مفعولا o (۱۷: ۴ و ۵) اور ہم نے بنی اسرائیل سے کتاب میں صاف کہہ دیا تھا کہ تم ضرور ملک میں دو دفعہ فساد کرو گے، اور بڑی زیادتیاں بھی کرو گے، تو جب ان میں پہلے فساد کا وقت آیا تو ہم نے تمہارے مقابلہ میں اپنے ایسے بندے اٹھا کھڑے کئے جو بڑے سخت گیر تھے، وہ تمہارے شہروں کے اندر پھیل گئے، اور خدا کا وعدہ پورا ہونا ہی تھا۔

ان لوگوں نے بابل میں دیکھا کہ وہاں کے رہنے والے دو فرشتہ خصلت بزرگوں ہاروت و ماروت کو بہت زیادہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، بعض مفسرین نے لفظ ملک سے دھوکا کھا کر ان کو حقیقی فرشتہ قرار دیا ہے، اور پھر ان تمام غلط اور دور از کار روایات کا انبار جمع کر دیا ہے جن کو کوئی سلیم الفطرت انسان قبول کرنے کو تیار نہیں، قرآن حکیم نے حضرت یوسف کی نسبت کہا۔ ان هذا الا ملك كريم (۱۲: ۳۱) ایسے ہی یہاں بھی ان کو ملک کہا گیا۔ انہیں اپنی عزت رفتہ یاد آگئی، اور اس کوشش میں لگ گئے کہ کس طرح اس گزشتہ عروج کو حاصل کریں، ہاروت و ماروت نے اذکار و اوراد، اور اسمائے حسنیٰ کے ذریعہ سے اپنی بزرگی اور تقدس کو قائم کیا تھا، بنی اسرائیل کا حال تو پہلے ہی سے تھے، مفت کی روٹیاں کھا کر کام کرنے کی قوت سلب کر چکے تھے، اور چاہتے یہ تھے کہ بغیر کام کئے لوگ ان کی تعریف و توصیف کریں، ویحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا، فوراً ان کی جانب متوجہ ہو گئے، اور درخواست کی کہ انہیں بھی ان اشغال و وظائف کی تعلیم دی جائے۔

دونوں بزرگوں کا یہ دستور تھا کہ تعلیم دینے سے قبل لوگوں سے عہد اس کو سمجھا دیا کرتے تھے کہ ان دعاؤں کو ناجائز اور غیر مشروع مواقع پر استعمال نکرنا، ہمارا وجود اور ہماری تعلیم تم لوگوں کے لئے ایک قسم کی امتحان گاہ ہے، اس سے تمہارے ایمان و اسلام کی حقیقت کھل جائیگی، اس قسم کی باتیں کر کے دونوں بزرگ اپنے دامن کو آلودہ عصیاں ہونے سے بچا لیتے، اس کے بعد ان کی تعلیم شروع ہوتی، یہودی اب دو چیزوں کے مالک تھے ایک وہ علوم جو کتاب مقدس میں موجود تھے، جن کی تبلیغ و دعوت کے لئے انہیں مامور کیا گیا تھا، دوسرے وہ شیطانی باتیں جو انہوں نے بابل میں رہ کر حاصل کیں، مفسرین نے فیتعلمون منہما میں منہما کی ضمیر کو ہاروت و ماروت کی طرف راجع کیا ہے، لیکن ابن کثیر نے یہی معنی اختیار کئے ہیں جن کو ہم نے اوپر درج کیا ہے، اور ان تمام روایات کو غلط ثابت کیا ہے جن سے ہاروت و ماروت کی طرف ارجاع ضمیر معلوم ہوتا ہے،

باوجود اس قدر تنبیہ و تادیب کے یہودی ان کی نصیحت پر عمل نہ کرتے، اور ان وظائف و اوراد کو ایسی جگہہ استعمال میں لاتے جہاں شر و فساد پیدا ہونے کا اندیشہ ہو، خاوند اور بیوی میں ناچاقی پیدا ہو، اور ایک آباد و بارونق گھر کھنڈرات کا ڈھیر دکھائی دے، ان بدبختوں کو اتنی تمیز نہ تھی کہ ہوتا وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے، ان کی کوششوں کو کسی کے نفع و نقصان میں کیا دخل، اور جو کچھہ ان کے پاس اوراد و اذکار تھے وہ ان کے لئے یکسر نقصان و زیاں کا باعث تھے، انھیں ذرہ برابر بھی فائدہ حاصل نہ ہوتا تھا، کیونکہ جب یہ لوگ دیکھتے تھے کہ چاروں طرف سے روپیہ بکثرت آرہا ہے، لوگ ان کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور ہر جگہہ ان کی آؤ بھگت ہوتی ہے، اپنے نفس کی اصلاح اور اخلاق کی تہذیب کو بھول جاتے تھے، حالانکہ اصل چیز اعمال و اخلاق کی درستی ہے، مرنے کے بعد صرف قلب سلیم اور فطرہ صالحہ ہی سے فائدہ ہو سکتا ہے، دولت کسی کام نہیں آتی، کاش تعلیم صحیح اور عمل صالح اختیار کرتے، تو دنیا میں بھی سرفراز رہتے اور آخرت میں بھی عزّت کی زندگی بسر

کرتے۔[1]

علیحدگی کا حکم

انصار مدینہ کے رہنے والے تھے، اور زراعت پیشہ ہونے کی بنا پر یہودیوں کے ساتھ ان کے تعلقات تھے، یہودیوں نے اطراف شہر میں اپنے مدرسے قایم کر رکھے تھے جن کو بیت المدارس کہتے تھے اور جن میں انصار کی اولاد تعلیم حاصل کیا کرتی تھی، اس لئے صحبت وہم نشینی کی بنا پر ان میں کچھ نہ کچھ عادتیں یہودیوں کی آگئی تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جدید امت پیدا کرنا چاہتے تھے جو تمام جغرافیائی حدود اور قومی پابندیوں سے آزاد ہو اور وہ شہداء علی الناس کے مرتبہ کبریٰ پر فائز ہو، ضرورت تھی کہ انصار کو ان سے الگ کر دیا جائے مگر مدت ہائے دراز کے تعلقات کو یک قلم توڑ دینا ایک حکیم اجتماعی کی نظر میں ناموزوں تھا، اس لئے ان اوراق میں تفصیل کے ساتھ ان کی غلط کاریوں کو بیان کیا، ان کے علمی وعملی نقائص کو واضح کیا، اور ان کی انفرادی واجتماعی خرابیوں پر روشنی ڈالی تاکہ مسلمانوں کو یقین ہو جائے کہ بنی اسرائیل میں حکومت کرنے، مسلمانوں کے ساتھ ملکر کام کرنے، اور ان میں عمدہ رعایا بننے کی مطلق قابلیت نہیں ہے، فرزندان اسلام کسی پر بھروسہ نہ کریں بلکہ خود اپنے اندر کام کرنے کی قوت پیدا کریں، یہودیوں کی طرف سے

---

[1] یہی حال آج عالموں اور صوفیوں کا ہے، کتاب وسنت تو درار ظہور ہو ہی، جن سے ان کی عزت برقرار رہتی، اب تعویذوں اور گنڈوں پر زور ہے، یہی ان کی آمدنی کے ذرائع ہیں، اور انہیں سے اپنی منزلت لوگوں کے دلوں میں قائم کئے ہوئے ہیں، بعض ارباب احسان وتصوف نے تو تمام قرآن ہی تعویذات کا مجموعہ بنا دیا ہے، اور اعمال قرآنی ایک کتاب شائع کر کے اپنے زعم باطل میں تحقیقات کا جدید باب مفتوح کیا ہے، پھر جن مولویوں اور صوفیوں کا ذریعہ معاش صرف تعویذات رہ گئے ہوں وہ اللہ کے نام پر کہاں اپنے آپ کو قربان کر سکتے ہیں، وہ تو کاہلی اور سستی کے دنیا میں زندہ نمونے ہیں، کاش وہ اس فریب خوردہ زندگی کو ترک کر کے تبلیغ ودعوت قرآن کو اپنا مقصد حیات بنائیں۔

ان کے دلوں میں عام نفرت و حقارت پیدا ہو، اور اس طرح ایک جدید قومیت صالحہ کی بنیاد پڑجائے، چنانچہ اب وقت آگیا کہ مسلمانوں کو ان سے دائمی طور پر الگ رہنے کا حکم دیا جائے فرمایا:۔

(۴۰۱) یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ؕ وَلِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ○	اے ایمان والو! تم راعنا مت کہو، اور انظرنا کہو، اور سنتے رہو، اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے۔

جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعظ و تذکیر میں مصروف ہوتے، اور مسلمانوں کو آپ کی کوئی بات سمجھ میں نہ آتی، تو عرض کرتے کہ مزید توضیح فرما دیجئے اور ایسے موقع پر راعنا کا لفظ استعمال کرتے، یہ مراعات سے ہے یعنی "ارعنا سمعک و فرغہ لکلامنا ہماری بات سن لیجئے"، مگر یہودیوں کے نزدیک یہ سب و شتم کے موقعہ پر بولا جاتا تھا، اور اس کے معنی یہ ہوتے تھے کہ "اسمع لاسمعت" خدا تمہیں سننے کا موقعہ ہی نہ دے، بعض کہتے ہیں کہ لفظ رعونتہ سے مشتق ہے، جس کے معنی احمق اور بیوقوف کے ہیں، مسلمان اپنی سادگی کی بنا پر اس کو استعمال کرتے تھے مگر اس سے یہودیوں کو ان کی تضحیک و تحمیق کا مشغلہ ہاتھ آجاتا تھا، اور کہتے کہ ہم تو اس رسول کے ساتھ استہزا خفیہ خفیہ کیا کرتے تھے لیکن مسلمان تو علی الاعلان کرتے ہیں، چنانچہ حسب ذیل روایت اس پر مزید روشنی ڈالتی ہے:۔

فلما سمعت الیہود ھذہ الکلمۃ من المسلمین قالوا فیما بینھم کنا نسب محمدا سرا فاعلنوا بہ الان فکانوا یاتونہ و یقولون راعنا یا محمد ویضحکون فیما بینھم فسمعھا سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ففطن لھا وکان یعرف لغتھم فقال	جب یہود نے مسلمانوں کو یہی کلمہ کہتے سنا تو انہوں نے ایک دوسرے سے کہا، ہم تو سرا محمد کو گالی دیتے تھے مگر وہ تو علانیہ کہتے ہیں، اسکے بعد وہ آتے اور کہتے راعنا یا محمد اور آپس میں خوب ہنستے، اتفاقاً سعد بن معاذ نے ان کو ایسا کرتے دیکھ لیا، وہ تاڑ گئے کہ یہ تمسخر و استہزا کرتے ہیں کیونکہ وہ عبرانی سے بھی واقف تھے انہوں

لليهود لئن سمعتها من احد منكم يقولها لرسول الله صلى الله عليه وسلم لاضربن عنقه فقالوا اولستم تقولونها فانزل الله تعالیٰ هذہ الایۃ۔	نے کہا کہ اگر ابکے میں نے تمہیں یہ لفظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کہتے سن لیا تو میں مار ڈالوں گا، انہوں نے کہا تم بھی یہی کہا کرتے ہو۔

اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

یہودیوں کی اس شرارت کے متعلق دوسری جگہہ آتا ہے: وراعنا لیا بالسنتہم و طعنا فی الدین (۴: ۴۸) زبان کو مروڑ مروڑ کر اور دین اسلام پر طعنے کی راہ سے راعنا کہکر خطاب کرتے ہیں، اس لئے شریعت نے ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کو حکم دیدیا کہ ان کے اعمال حیات تو ایک طرف، ان کے الفاظ و محاورات سے بھی پوری نفرت کرنی چاہیئے اور قولاً عملاً و اعتقاداً ان سے کلی اجتناب کیا جائے، ہاں اگر تم کوئی بات نہ سمجھ سکو تو انظرنا کہہ دیا کرو، اور سمجھنے کی کوشش بھی کرو، رہے یہ گستاخ اور دریدہ دہن تو ان کو گستاخی کی سزا مل جائیگی اور دنیا و آخرت میں ذلیل و رسوا ہو کر رہینگے۔

(۱۰۵) مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ○	کتاب والوں میں سے جو منکر ہیں، اور مشرک نہیں چاہتے کہ تمہارے رب کی طرف سے تم پر کوئی نیک بات اترے، اور اللہ جس کو چاہے اپنی رحمت کی وجہ سے خاص کر لیتا ہے، اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

یہود و نصاریٰ اور مشرکین کبھی اس بات کو پسند نہیں کر سکتے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اپنے مکالمہ و مخاطبت کے لئے چن لے، اور پھر وہ ترقی کے اعلیٰ مراتب پر پہنچ جائیں، بلکہ ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو مسلمانوں کو ترقی سے روک دیں، انہیں سر اٹھانے کا موقعہ نہ ملے، اور دائمی طور پر ہمارے ہی غلام رہیں، حالانکہ شریعتوں کے نازل کرنے میں کبھی اس امر کا خیال نہیں کیا جاتا کہ ایک قوم جو حد درجہ کی نالائق ہو کتاب

الٰہی سے بعد و ہجر اختیار کر چکی ہو، فسق و فجور میں مبتلا ہو، اخلاق فاضلہ اور اعمال صالحہ سے منحرف ہو، پھر بھی اس کو اپنی رحمت کے لئے مخصوص کر لے؟ اس کے فضل عظیم کی ایک ہی قوم اجارہ دار نہیں بن سکتی، بلکہ وہ جس کو چاہتا ہے اپنے کام کے لئے منتخب کر لیتا ہے۔

اس آیت میں مشرکین کا نام لیا گیا ہے اس لئے کہ یہ بھی اپنے آپ کو ملت ابراہیم کا متبع سمجھتے تھے، نماز، زکوٰۃ، حج، روزہ، ختنہ، اللہ کے نام پر جانوروں کا ذبح کرنا، اشہر حرم میں لڑائی نہ کرنا، تمام رسمیں ان میں موجود تھیں، ان کو قرآن حکیم کا نزول اس لئے ناگوار تھا کہ اب عرب کی سیادت اور حکومت ان کے ہاتھوں سے نکل کر مسلمانوں کے قبضہ میں آ جائیگی اور وہ تمام دنیا کی حکومت حاصل کرینگے، ظاہر ہے کہ جس قوم کی حکومت چھن جائے، ضرور دوسروں کی راہ میں رکاوٹ پیدا کریگی۔

مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ دنیا کی کوئی قوم ان کی دوست نہیں بن سکتی، بلکہ ان کے مقابلہ میں تمام کفار و مشرکین اور اہل کتاب ایک ہو جایا کرینگے، اس لئے کہ کفر ملت واحدہ ہے، سورۂ انفال میں فرمایا: والذین کفروا بعضہم اولیاء بعض (۸: ۷۳) اسلام کی دشمنی میں تمام کفار ایک دوسرے کے دوست ہیں، قرآن حکیم نے اس قدر صاف صاف اس موضوع پر آیات بینات پیش کی ہیں کہ شاید ہی اس سے زیادہ کسی اور مسئلہ پر گفتگو کی ہو گی، ایک جگہ فرمایا: ولن ترضیٰ عنک الیہود ولا النصٰرٰی حتی تتبع ملتہم (۲: ۱۲۰) پھر کہا: ولا یزالون یقاتلونکم حتیٰ یردوکم عن دینکم ان استطاعوا (۲: ۲۱۷) آل عمران میں کہا: لا یتخذ المومنون الکٰفرین اولیاء من دون المومنین (۳: ۲۸) پھر سورۂ ممتحنہ کے آخر میں فرمایا: یٰایہا الذین اٰمنوا لا تتولوا قوما غضب اللہ علیہم قد یئسوا من الاٰخرۃ کما یئس الکفار من اصحٰب القبور (۶۰: ۱۳) کس درجہ کھول کھول کر بیان کیا: یٰایہا الذین اٰمنوا لا تتخذوا بطانۃ من دونکم لا یالونکم خبالا ودوا ما عنتم قد بدت البغضاء من افواہہم وما تخفی صدورہم اکبر قد بینا لکم الاٰیٰت ان کنتم تعقلون ہاانتم

اولاء تحبونہم ولا یحبونکم و تومنون بالکتب کلہ ج واذا لقوکم ط قالوا آمنا ج صلے واذا خلوا عضوا علیکم الانامل من الغیظ ط (۳ : ۱۱۴ و ۱۱۵)

مگر مسلمانوں نے ان آیات کی بے حرمتی کی، ان کا احترام ان کے دلوں سے جاتا رہا، علمائے سو نے ان کی تاویلات شروع کر دیں اور ان تمام حرکات کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام بلاد و امصار اسلامی یکے بعد دیگرے ان کے ہاتھوں سے نکلے چلے جا رہے ہیں؛ ان کی عورتوں اور لڑکیوں کو بے آبرو کر کے آگ کی نذر کیا جاتا ہے، ان کے شہروں پر بم چلائے جاتے ہیں، کھیتیاں برباد کی جاتی ہیں، ارض مقدس چھن جاتی ہے؛

مگر آہ ثم آہ! ان کے بدن پر جوں تک نہیں رینگتی اور ذرا بھی ٹس سے مس نہیں ہوتے، فیالیتنی مت قبل ھذا وکنت نسیا منسیا۔

اعتراضات کی بوچھار

گزشتہ آیات میں اس مسئلہ کو صاف کر دیا کہ مسلمان اہل کتاب سے کسی قسم کے تعلقات بھی نہیں رکھ سکتے، اور ان سے اتحاد کلیۃً ممنوع و ناجائز ہے، ان سے علیحدہ ہونے کے بعد مسلمانوں کو مستقل قانون اور دستور العمل کی ضرورت ہو گی، تاکہ ان کا وجود قائم رہ سکے، یہ قانون تو فاذکرونی اذکرکم سے شروع ہو گا۔ مگر یہاں سے اس کی تمہید بیان کی جاتی ہے۔

کہیں کہیں آپ نے دیکھا ہو گا کہ یہودی قرآن حکیم پر اعتراض کرتے ہیں اور وحی الٰہی ان کا جواب دیتی ہے، لیکن اب انقطاع تعلقات ہو چکا ہے، ترک موالات کی بنا پر وہ نہ تو مجلس نبوی میں کھلے بندوں شریک ہو سکتے ہیں، اور نہ مسلمانوں کے عام مجامع میں انہیں شرکت کا موقعہ حاصل ہے، اس اجتناب کی بنا پر وہ مسلمانوں پر کوئی برا اثر نہیں ڈال سکتے، مگر نیش عقرب کی طرح مقتضائے طبیعت سے بچنا بھی مشکل، اسلئے

انہوں نے تجویز یہ کی کہ جب کبھی کوئی اکا دکا مسلمان راہ میں مل جائے تو اس کو بہکانے کی پوری کوشش کریں: ان یثقفوکم یکونوا لکم اعداء (۶۰ : ۲) اور ان کے سامنے ایسے اعتراضات کئے جائیں جن کا ان کے پاس کوئی جواب نہ ہو، اور اس طرح ان کے ایمان میں خلل واقع ہو:- ود کثیر من اہل الکتب لو یردونکم من بعد ایمانکم کفارا حسدا من عند انفسہم (۲ : ۱۰۷) بغض و عداوت کی بنا پر اہل کتاب کی سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ ایمان کے بعد تم کو پھر کفر و ضلالت میں لے جائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ نے ایک مدت تک بیت المقدس کی جانب نماز پڑھی، آخر میں ہمیشہ کے لئے امت مسلمہ کا قبلہ بیت اللہ بنا دیا گیا، یہ اس امر کی تمہید تھی کہ مسلمان دنیا کی تمام اقوام و امم سے الگ ہو کر اپنا مرکز جداگانہ قایم کرتے ہیں، اور ایک جدید قومیت صالحہ کی اساس و بنیاد محکم و استوار کرنے کی فکر میں ہیں، اس لئے وقت آگیا کہ مخالفین و معاندین اسلام بھی پوری قوت کے ساتھ اس تحریک کو فنا کرنے میں مصروف ہوں، تحویل قبلہ نے انہیں بہترین موقع دیدیا، اور تمام آلات سے مسلح ہو کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے، نسخ قبلہ پر اعتراض کرنا شروع کر دیا، اللہ تعالےٰ کے ازلی و ابدی اور محیط الکل علم پر نکتہ چینی کی، شارع علیہ السلام کی ذات اقدس کو مورد طعن و تشنیع بنایا کہ اپنی خواہشات کو مذہب کا نام دے رکھا ہے، جس طرف جی چاہتا ہے منہ کر لیتا ہے، اگر یہ مذہب الہامی ہوتا تو قبلہ بار بار نہ بدلتا۔

آیندہ آیات میں ان تمام مباحث کو صاف کر دیا جائیگا، اور قبلہ کی حقیقت پر روشنی ڈالی جائیگی، مگر اس بحث کے دو پہلو ہونگے، (۱) الزامی، (۲) تحقیقی، جواب دینے سے قبل ارشاد ہوتا ہے:-

(۱۰۶) مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ۭ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى	ہم جب کسی آیت کو موقوف یا فراموش کر دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی پہنچا دیتے ہیں، کیا تمہیں معلوم

كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ (۱۰۷) اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ○

نہیں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے، کیا تم نہیں جانتے کہ آسمانوں اور زمین کی سلطنت اللہ ہی کے لئے ہے اور تمہارا اللہ کے سوا کوئی حامی اور مددگار نہیں؛

پہلے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ یہودیوں کو مسلمانوں کے ساتھ جس قدر بغض و عداوت ہے، اس کا اصلی سبب صرف یہ ہے کہ بنی اسمٰعیل پر کیوں وحی الٰہی نازل ہوئی اور بنی اسرائیل کو کس لئے اس فضیلت کبریٰ سے محروم کر دیا گیا؟ ظاہر ہے کہ وحی و الہام کے بدلتے ہی حکومت کا مسئلہ بھی جدید صورت اختیار کریگا، یعنی یہودی ذلیل ہونگے، اور مسلمانوں کو حکومت نوازش ہوگی، اسی لئے وہ بدبخت زیادہ چیخ و پکار کرتے تھے، اس کا جواب یہ دیا گیا کہ جب ہم کسی ملّت کو منسوخ کرتے ہیں تو پھر دو صورتیں ہمارے سامنے ہوتی ہیں، اس سے بہتر قوم کو اس کی جگہہ کھڑا کر دیں، یا اس جیسی ہی ہو، چنانچہ یہودیوں کی مغضوبیت کے بعد اس کے مساوی درجہ کی قوم عیسائیوں کی کھڑی کر دی گئی، اب ان سے بہتر قوم کو پیدا کیا جاتا ہے: کنتم خیر امۃ اخرجت للناس، جو تمام دنیا میں پھیل جائیگی، اور ارض الٰہی کا ایک ایک گوشہ نغمۂ توحید سے معمور ہو جائیگا۔

زمین و آسمان کی بادشاہت اللہ کی ہے، وہ ایک قوم کو حکومت نوازش کرتا ہے، جب اس میں ناقابلیت پیدا ہو جاتی ہے تو اس کی جگہہ دوسری ملّت قایم کی جاتی ہے کہ نظام عالم میں خلل نہ واقع ہو، اور ارض الٰہی فساد کا گھوارہ نہ بن جائے، پھر اقوام و امم کے تغیر و تبدل پر اللہ تعالیٰ کا علم کس طرح محل اعتراض بن سکتا ہے، اگر عرب کے ظہور و شہود کو ہم نے باقی قوموں سے مؤخر کر دیا تھا، اور کائنات خلت ابراہیم کے بعد اس پر گمنامی کا پردہ ڈال دیا تھا تو یہ کسی نہ کسی مصلحت کی بنا پر تھا، چنانچہ اس تاخیر کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ آج دنیا کی تمام قومیں اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہیں، اور وہ جہاں جاتی ہے فتح و نصرت اس کے قدم لیتی ہے۔

ناسخ و منسوخ

فنِ تفسیر میں ناسخ و منسوخ ایک اہم ترین باب ہے، جس سے ناواقفیت زلۃ قدم کا باعث ہوتی ہے، نسخ کی تعریف میں متقدمین و متاخرین کا اختلاف ہے، اسی اختلاف کی بنا پر اس کے متعلق عجیب و غریب مباحث پیدا ہو گئے، حضرات صحابہ و تابعین کے کلام کا استقرا بتاتا ہے کہ وہ نسخ کو اس کے لغوی معنی میں استعمال کرتے تھے، یعنی ایک چیز کو دوسری چیز کے ذریعہ زائل کر دینا، اس لئے اگر عمل کی مدت ختم ہو گئی، کلام کو اس کے متبادر معنی سے غیر متبادر کی جانب پھیر دیا، یہ بتایا کہ پہلے جو قید تھی وہ صرف اتفاقی طور پر لگائی گئی تھی، لفظ کی عمومیت میں کچھ تخصیص کر دی، منصوص اور مقیس علیہ ظاہری میں امر فارق کو بیان کر دیا، یا جاہلیت کی کسی عادت اور قانون کو دور کر دیا، تو ان کے نزدیک یہ تمام صورتیں نسخ میں داخل ہونگی۔

ابن حزم نے کہا:۔

النسخ فی اللغۃ موضوع بازاء معنیین احدھما الزوال علی جہۃ الانعدام والثانی علی جہۃ الانتقال	لغت میں نسخ کے دو معنی آتے ہیں (۱) ایک حکم بالکلیہ زائل کر دینا، (۲) ایک حکم کی مدت عمل ختم ہو گئی اس کی جگہہ دوسرا حکم دینا۔

ایک مثال سے یہ مضمون زیادہ واضح ہو جائیگا، طبیب اپنے مریض کی حالت کا اندازہ کرکے اس کے لئے منضج کا نسخہ تجویز کرتا ہے، جب اس کا اثر مکمل ہو جاتا ہے، اور اس کی ضرورت باقی نہیں رہتی تو مسہل کا نسخہ دیتا ہے، یہی مثال ہے تمام احکام شرعیہ کی، مگر متاخرین ارباب تفسیر نے نسخ کی جو تعریف کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ایک ہی وقت میں دو متناقض حکم صادر ہوں تو دوسرا پہلے کے لئے ناسخ ہوگا، مگر نہیں معلوم ہونا چاہیے کہ منطقیوں نے تناقض کے لئے آٹھ شرطیں معین کی ہیں۔

در تناقض ہشت وحدت شرط داں وحدت موضوع و محمول و مکاں

وحدت شرط و اضافت جزو و کل   قوت و فعل است در آخر زماں

لیکن کیا کوئی صاحب علم و بصیرت ثابت کر سکتے ہیں کہ جن آیتوں میں وہ ناسخ و منسوخ کو تسلیم کرتے ہیں ان میں کہیں یہ شرطیں بھی پائی جاتی ہیں یا نہیں والبینۃ علی المدعی اگر ہم اس وقت، جبکہ الیوم اکملت دینکم کی آیت ہمارے سامنے ہو ناسخ و منسوخ کو قرآن میں تسلیم کرلیں تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ قریباً تمام قرآن بیکار ہے، خود زمانہ رسالت میں نسخ کا ہونا مسلم، اور اس کی مثال بیمار اور طبیب کی ہے، ایک اُمت کو وجود میں لانے کے لئے ان تمام منازل میں سے گزرنا ضروری ہے، مگر اب تو وہ ایک مکمل قانون کی صورت میں ہمارے سامنے ہے، اور کسی کو اس میں تغییر و تبدل کا حق نہیں، بعض لوگوں نے پانسو آیات کو منسوخ تسلیم کیا، شیخ محی الدین ابن عربی کے نزدیک بیس آیات ہیں، اور امام المتاخرین شاہ ولی اللہ نے اپنی کتاب فوز الکبیر میں صرف پانچ آیتوں پر اکتفا کیا، یہ رفتار خود بتا رہی ہے کہ کس طرح آہستہ آہستہ ناسخ و منسوخ کے اصول کو اس وقت قرآن سے زائل کیا جا رہا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اگر شاہ ولی اللہ کی پانچ آیتوں میں آپ ذرا دقت نظر سے کام لیں تو ان کا نسخ بھی جاتا رہتا ہے، اور اس طرح تمام کتاب اول سے لیکر آخر تک قابل عمل بن جاتی ہے، چنانچہ ہم نے ان پانچ آیات کی اپنے اپنے مقام پر ایسی توجیہ کر دی ہے کہ کوئی سلیم الفطرۃ انسان اس سے انکار ہی نہیں کر سکتا۔

اور اس آیت سے تو کسی طرح استدلال ہو ہی نہیں سکتا اس لئے کہ اس میں ملتوں اور قوموں کے عروج و زوال پر بحث کی گئی ہے۔

اعتراض کی اصلی غرض

(۱۰۸) اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ	کیا تم مسلمان بھی چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے ایسے سوال کرو جیسے اس سے قبل موسیٰ سے کئے گئے تھے، اور جو کوئی یقین کے بدلے انکار لیوے، وہ سیدھی

سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝ | راہ بھول گیا۔

جس وقت مسلمانوں نے یہودیوں سے قبلہ پر اعتراضات سُنے تو ان کے دل میں بھی خلجان پیدا ہوا، اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق کچھ سوالات کئے، انہیں جواب دیا گیا کہ جب تم نے شارع علیہ السلام کو اللہ کا رسول تسلیم کر لیا، اب اس کے احکام و اوامر میں شبہ کی گنجایش ہی نہیں رہی، جو شبہات تمہارے دل میں پیدا کئے گئے ہیں ان کی اصل غرض تو یہ ہے کہ تمہارے ایمان و اسلام میں خرابی آجائے، اور بنیادی اصول غلط نظر آنے لگیں، کثرت سے سوال کرنا، فلسفیانہ موشگافیاں، اور دور از کار مباحث لا کھڑے کرنا ان یہودیوں کا کام ہے، اُن کی تاریخ تمہارے سامنے ہے، موسیٰ علیہ السلام کو اپنے سوالات سے تنگ کر دیا، اور پھر اس سوال و جواب کا نتیجہ بھی کچھ نہ نکلا، ایسی سوالات کرنا مسلمانوں کی شان سے بعید ہے۔

جن لوگوں میں کام کرنے کی استعداد ہوتی ہے، اور وہ نوع انسانی کی خدمت کرنا چاہتے ہیں، انہیں سوالات کا بہت ہی کم موقع ملتا ہے، کیونکہ انہیں اپنے فرایض کی ادائگی ہی سے فرصت نہیں ہوتی کہ سوالوں کی طرف ان کا دماغ متوجہ ہو، البتہ بیکار لوگ برابر سوال کرتے رہتے ہیں، کثرۃ الکلام تنبئ عن قلت العمل، اسی لئے عرب میں یہ ضرب المثل مشہور ہے کہ کن یدا ولا تکن لسانا، زبان کی بجائے دست عمل بننے کی کوشش کرو،

(۱۰۹) وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝	بہت سے کتاب والے چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان کے بعد تمہیں کافر بنا دیں، اور یہ اس لئے ہے کہ ان کے دلوں میں تمہارے لئے حسد ہے، باوجود اس بات کے کہ حق ان پر کھل چکا ہے، پس تم درگزر کرو اور خیال میں نہ لاؤ جب تک اللہ اپنا حکم نہ بھیجے بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اس آیت میں یہودیوں کے اعتراض کی اصلی غرض بیان کر دی کہ وہ مسلمانوں کو دین حق سے منحرف کرنا چاہتے ہیں، اور وہ بھی بغض و عداوت کی بنا پر کہ بنی اسمٰعیل پر کس لئے وحی نازل ہوئی حالانکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ اب زمانہ کی ضروریات اسی بات کی مقتضی ہیں کہ قرآن کا نزول ہوا کیونکہ تورات، زبور اور انجیل میں سے کوئی کتاب بھی انسان کے لئے مفید نہیں ہوسکتی۔

جب ایک عالم آدمی قانون کا اتباع چھوڑ دیتا ہے تو اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ دوسرے لوگ بھی راہ حق سے منحرف ہو جائیں۔ ورنہ اس پر اعتراضات ہونگے یہی حال یہودیوں کا ہے، اپنی کتاب کو تو درہم برہم کر دیا، اب مسلمانوں میں بھی یہی بے عملی کا مرض پیدا کرنے کی فکر میں ہیں، اسی لئے اعتراض کی بوچھار ہو رہی ہے۔

مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ ان لوگوں کا اصلی مقصد اسلام سے الگ کرنا ہے تو ان کے غصہ و انتقام کی کوئی حد نہ رہی کہ ان کی عزیز ترین متاع حیات پر حملہ ہو رہا تھا، مگر انہیں سمجھا دیا گیا کہ بدلہ لینے کا ابھی وقت نہیں آیا، اس وقت تو درگذر سے کام لینا زیادہ مناسب ہے تا آنکہ اللہ تعالیٰ جہاد فی سبیل اللہ کے احکام نافذ کرے، چنانچہ جب مسلمان اس کے لئے تیار ہوگئے تو یہ آیت نازل ہوئی: اذن للذین یقتلون بانھم ظلموا ط وان اللہ علی نصرھم لقدیر ۝ الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ ط ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع وصلوٰت ومسٰجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرا ط ولینصرن اللہ من ینصرہ ط ان اللہ لقوی عزیز (۲۲ : ۴۰ و ۴۱) جن مسلمانوں سے کافر لڑتے ہیں انکو بھی ان کافروں سے لڑنے کی اجازت ہے اس واسطے کہ ان پر ظلم ہو رہا ہے، اور کچھ شک و شبہ نہیں کہ اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے یہ وہ مظلوم لوگ ہیں جو صرف اتنی بات کہنے پر کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے ناحق اپنے گھروں سے نکال دیے گئے، اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ہاتھ سے نہ ہٹواتا رہتا تو نصاریٰ کے صومعے اور گرجے اور یہودیوں کی عبادت

خانے اور مسلمانوں کی مسجدیں، جن میں کثرت سے خدا کا نام لیا جاتا ہی کبھی کے ڈھائے جا چکے ہوتے، اور جو اللہ کی مدد کریگا، اللہ بھی ضرور اس کی مدد کریگا، کچھہ شک و شبہ نہیں کہ اللہ زبردست اور سب پر غالب ہی۔

یہ فرصت کا وقت ہی، اس کو غنیمت جانو، اور لڑائی کے لئے جن ابتدائی امور اور اخلاق و جذبات کی ضرورت ہوتی ہے، ان کی مشق ان ایام میں کرلو، نماز، زکوٰۃ، روزے اور حج ابتدائی تعلیم کے قایم مقام ہیں، جب تک ان میں کمال نہ پیدا ہوگا، جہاد میں کامیابی کی کوئی صورت نہیں، اس آیت میں دو چیزوں کا حکم دیا کہ عفو اور صفح سے کام لو، عفو سے مراد یہ ہی کہ ان کی حرکات کو اس وقت اپنے دل سے اس طرح فراموش کردو کہ باوجود زور دینے کے پھر بھی یاد نہ آئیں، اور صفح کا منشا یہ ہی کہ ان باتوں کی طرف توجہ تک نہ کیجئے کیونکہ جب ان باتوں کی یاد تمہارے دل میں تازہ ہوگی، فوراً بھڑک اٹھوگے، اس لئے عفو سے کام لو، اور آنے والے وقت کے لئے تیار ہوجاؤ، ان ایام میں تمہارے فرائض یہ ہونگے :-

ارکان اسلامی کی انتہائی غرض

(۱۱۰) وَاَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ط وَمَا تُقَدِّمُوا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ط اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ○	اور نماز قایم کرو، اور زکوٰۃ دو، اور جو بھلائی اپنے لئے آگے بھیجوگے وہ اللہ کے پاس پاؤگے، بیشک اللہ تمہارے کام دیکھتا ہی۔

نماز پڑھنا، اور زکوٰۃ دینا، بچپن کی تعلیم، اور جوانی میں عمل صالح کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ بڑھاپے میں انسان کو آرام ملتا ہی، پس اس فرصت کو غنیمت سمجھکر نماز اور زکوٰۃ کی مشق کرو اور یہ محنت ضائع نہ جائیگی، بلکہ اب جس قدر مشقت برداشت کروگے، میدان جنگ میں اتنا ہی فائدہ ہوگا، تم میں جوش و ولولہ، عزم و ثبات قدم، اور استقلال و استقامت کے جذبات حقہ پیدا ہونگے، اور ایثار و فدویت کی بنا پر کفار و مخالفین کے مقابلہ میں کامیاب ہوجاؤگے کیونکہ جنگ کے موقع پر یہی اخلاق کام آتے ہیں، تعداد اور سامان حرب کی کثرت کچھہ بھی

مفید نہیں ہوتی : کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ کا یہی مطلب ہے، اللہ تعالیٰ تمہارا ایک ایک کام نہایت ہی گہری نظر سے دیکھ رہا ہے، اس کی مصلحت چاہتی ہے کہ ابھی جہاد کا حکم نافذ کرنے میں تاخیر ہو،

قرآن حکیم نے صدہا مقامات پر نماز کو مسلمانوں کا اولین فرض قرار دیا، کہیں فرمایا: واقیموا الصّلوٰۃ واٰتوا الزّکوٰۃ وارکعوا مع الراکعین (۲ : ۴۳) ایک جگہ آیا : حافظوا علی الصلوٰت والصلوٰۃ الوسطیٰ وقوموا للہ قٰنتین (۲ : ۲۴۰) بعض مواقع پر یوں ارشاد ہوا: ان الصلوٰۃ کانت علی المومنین کتٰبا موقوتا (۴ : ۱۰۴) اقیموا الصّلوٰۃ ولا تکونوا من المشرکین (۳۰ : ۳۰) یاایھا الذین اٰمنوا استعینوا بالصّبر والصّلوٰۃ (۲ : ۱۵۱) واذکر اسم ربّک وتبتّل الیہ تبتیلا (۷۲ : ۸) اقم الصلوٰۃ لذکری (۲۰ : ۱۴) مومنین کے خصائص بیان کرتے ہوئے کہا : الذین ھم فی صلاتھم خاشعون (۲۳ : ۲) اور والذین ھم علی صلوٰتھم یحفظون (۲۰ : ۹) اور رجال لاّ تلھیھم تجارۃ وّلا بیع عن ذکر اللہ واقام الصّلوٰۃ (۲۴ : ۳۷) کانوا قلیلا مّن الّیل ما یھجعون ۝ وبالاسحار ھم یستغفرون (۵۱ : ۱۷ و ۱۸)

ان آیات کے علاوہ اور بہت کثرت سے آیات ملسکتی ہیں جن میں نماز کی تاکید کی گئی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تاکید کو ان الفاظ میں واضح کیا :-

عن ابن مسعود قال سالت النبی صلی اللہ علیہ وسلم ای الاعمال احب الی اللہ تعالیٰ قال الصّلوٰۃ لوقتھا	ابن مسعود کہتے ہیں میں نے نبی کریم علیہ الصّلوٰۃ والتسلیم سے پوچھا، انفرادی حیثیت سے اعمال انسانی میں سے کونسا عمل اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسندیدہ ہے، آپ نے فرمایا نماز اپنے وقت پر ادا کرنا۔

حضرت جابر سے ہے کہ بین العبد وبین الکفر ترک الصلوٰۃ، بندہ اور کفر میں فرق کرنے والی چیز نماز کا ترک کر دینا ہے، ایک حدیث میں فرمایا: مروا اولادکم بالصّلوٰۃ وھم ابناء سبع سنین، واضربوھم علیھا وھم ابناء عشر سنین وفرقوا بینھم فی المضاجع،

سات سال عمر والی اولاد کو نماز پڑھنے کا حکم دو، دس سال ہونے کے باوجود نہ پڑھیں تو انکو مارو، اور اپنے پاس مت سونے دو۔ عبداللہ بن شقیق کہتے ہیں کہ صحابہ صرف ترک صلوٰۃ ہی کو کفر سے تعبیر کرتے تھے، کان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یرون شیئاً من الاعمال ترکہ کفر غیر الصلوٰۃ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے گورنروں کو حسب ذیل خط لکھا :- ان اھم امورکم عندی الصلوٰۃ من حفظھا وحافظ علیھا حفظ دینہ، و من ضیعھا فھو لما سواھا اضیع، تمہارے جس قدر اعمال و امور ملکی ہیں ان میں میرے نزدیک اہم و اعظم ترین نماز ہی، جس نے اس کی نگرانی کی، اس نے اپنے دین کو بچا لیا، اور جس نے اس ادنیٰ ترین مشقت کو برداشت نہ کیا، اس سے اب کیا توقع ہو سکتی ہی، اور کسی بڑے ملکی کام میں اس پر اعتماد نہیں ہو سکتا۔

ایسے ہی زکوٰۃ کے لئے بھی قرآن حکیم میں مختلف آیات نازل کی گئیں، مومنین کی شان یہ بیان کی، والذین ھم للزکوٰۃ فاعلون (۲۳ : ۴) انبیاء کو ان چیزوں کا الہام ہوا وجعلنٰھم ائمۃ یھدون بامرنا واوحینا الیھم فعل الخیرٰت واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ وکانوا لنا عٰبدین (۲۱ : ۷۳) عیسیٰ علیہ السلام نے دنیا میں آتے ہی اعلان کیا : واوصٰنی بالصلوٰۃ والزکوٰۃ مادمت حیا (۱۹ : ۳۱) اسمٰعیل کی تعلیم کے اصول اساسی یہ تھے : وکان یامر اھلہ بالصلوٰۃ والزکوٰۃ (۱۹ : ۵۶)

قرآن حکیم میں جہاں کہیں زکوٰۃ کا لفظ آتا ہے، اس سے فقہاء کی اصطلاحی زکوٰۃ مراد نہیں، بلکہ اللہ کے نام پر خرچ کرنا، اور فقراء و مساکین کو کھانا کھلانا، خصوصاً مکی آیات میں تو اس کے سوا اور دوسرے معنی ہو ہی نہیں سکتے، مدینہ میں آکر اس کا قانون مرتب ہوا، اور شارع علیہ السلام نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن کا گورنر بنانے وقت یہ وصیت کی:

ان اللہ قد فرض علیھم صدقۃ تؤخذ من اغنیاءھم فترد علیٰ فقراءھم	اللہ نے ان پر صدقہ فرض کیا ہی کہ ان کے دولتمندوں سے لیکر ان کے فقراء و مساکین میں تقسیم کیا جائے۔

اور اسی زکوٰۃ کے ادا نہ کرنے پر ابو بکر نے اصحاب الردۃ سے جنگ کی اور فرمایا:

واللہ لاقاتلن من فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ، فان الزکوٰۃ حق المال، واللہ لومنعونی عنا قا کانوا یودونھا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لقاتلتھم علی منعھا، واللہ جو شخص نماز اور زکوٰۃ میں فرق کریگا میں اس کے ساتھ جنگ کرونگا، اس لئے کہ یہ مال کا حق ہے، واللہ اگر یہ بکری کا ایک بچہ بھی مجھے نہ دینگے جبکہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے تو نہ دینے پر ضرور لڑونگا۔

نماز اور زکوٰۃ، دونوں کو مسلمانوں پر فرض کیا گیا، اور یہ وہ وقت تھا جبکہ جہاد کے لئے ایک آیت بھی نازل نہ ہوئی تھی، یہ ترتیب نزول خود اس امر پر شاہد ہے کہ شریعت کی نظر میں نماز۔ زکوٰۃ۔ روزہ۔ اور حج بالکل ابتدائی تعلیم کے درجہ پر ہیں، اعلیٰ ترین تعلیم اور انتہائی اسلامی ڈگری دوسری ہے جس کا نزول ایک مدت کے بعد ہوا، سورۂ بقرہ میں فرمایا:۔

لیس البران تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب (۲: ۱۷۷)	مشرق و مغرب کی جانب رخ کرکے نماز پڑھنا ہی بڑی نیکی نہیں، بلکہ آگے چلکر تمہیں اس سے اعلیٰ ترین نیکی بھی بتائی جائیگی۔

سورۂ صف میں اور زیادہ واضح کردیا:۔

ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفا کانھم بنیان مرصوص (۶۱: ۴)	اللہ ان لوگوں کو محبوب رکھتا ہے جو کہ اس کی راہ میں ایسے صف باندھ کر جنگ کرتے ہیں گویا کہ وہ دیوار ہیں جس میں سیسہ پلایا گیا ہے۔

خود اس سورہ کا شان نزول ہی بتاتا ہے کہ صحابہ، جو تمام اعمال اسلامی کی پابند تھے، اس امر کے متلاشی ہوئے کہ اب انہیں وہ کام بتایا جائے جو احب الاعمال الی اللہ ہو، اس سوال کے جواب میں صف کا نزول ہوا، پھر سورۂ توبہ میں تو صاف صاف کہہ دیا کہ:۔

اجعلتم سقایة الحاج وعمارة المسجد الحرام کمن اٰمن باللہ والیوم الاٰخر وجاھد فی سبیل اللہ ط لایستون عند اللہ ط (۹ : ۱۹)

کیا حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کی آبادی کو اس شخص کے برابر کر دیا، جو اللہ اور یوم آخرۃ پر ایمان رکھتا ہی، اور اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہی، اللہ کے نزدیک یہ دونوں گروہ کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔

سورۂ نسا، کو دیکھو، نماز جو تمہارے نزدیک جہاد اکبر تھی قرآن کی نظر میں جہاد فی سبیل اللہ کے مقابلہ میں کس طرح ابتدائی درجہ میں آگئی، قصر صلوٰۃ کی تین ہی صورتیں ہو سکتی ہیں (۱) قصر جماعت (۲) قصر رکعات (۳) قصر اوقات، پہلی صورت کو اسی سورۂ نسا، نے صاف کر دیا: واذا کنت فیہم فاقمت لہم الصلوٰۃ فلتقم طائفۃ منہم معک (۴ : ۱۰۳) رکعات کے متعلق یہ حکم ہوا کہ چار کی جگہ سفر میں دو پڑھ لیا کرو: واذا ضربتم فی الارض فلیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلوٰۃ (۴ : ۱۰۲) اب رہا قصر اوقات کا مسئلہ تو شارع علیہ السلام نے اپنے عمل سے بتا دیا کہ جمع صوری ہو سکتی ہے، تمام دن سفر کرتے کرتے ایک شخص دوپہر کو ضرور قیام کریگا پس ظہر و عصر کو ملا کر پڑھ لے، رات کو کسی نہ کسی جگہہ آرام کریگا، اس وقت مغرب اور عشا ادا کرلے، بلکہ غزوہ خندق میں آپ نے چار نمازیں ایک ہی وقت میں ادا کیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حرس لیلۃ فی سبیل اللہ افضل من الف لیلۃ یقام لیلہا و یصام نہارہا، اللہ کی راہ میں ایک رات کی چوکیداری ہزار شب کی ایسی عبادت سے بہتر ہی کہ تمام راتوں میں قیام ہو اور دن کو روزہ ہو، ایک حدیث میں آیا: رباط یوم فی سبیل اللہ خیر من الدنیا وما علیہا، فی سبیل اللہ ایک روز چوکیداری کرنا دنیا اور اس کے تمام سامانوں سے بہتر ہے۔

فضیل بن عیاض، بیت اللہ الحرام میں مصروف عبادت تھے، عبداللہ بن المبارک نے انہیں حسب ذیل اشعار لکھکر بھیجے:۔

یا عابد الحرمین لو ابصر تنا — لعلمت انک بالعبادۃ تلعب!
من کان یخضب خدہ بدموعہ — فنحورنا بدمائنا تتخضب!
ریح العبیر لکم ونحن عبیرنا — رہج السنابک والغبار الاطیب!

حقیقت تو یہی تھی جو اوپر بیان کی گئی مگر بدبختانہ ہم نے جہاد فی سبیل اللہ کو بالکل فراموش کر دیا، اور آج اس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں، نماز اسی لئے ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض کر دی گئی کہ جنگی خدمت تمام مسلمانوں پر لازم ہو، بیک وقت ایک لشکر جرار تیار ہو جس کے اندر قربانی، اور امیر کی اطاعت کا جذبہ صادقہ راسخ ہو، اور جو ہر قسم کی بدنی تکلیف کو برداشت کر سکے، زکوٰۃ کا منشا یہ تھا کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی عادت ہو تاکہ جب کبھی خلافت اسلامی کو روپیہ کی ضرورت ہو تو ہر مسلمان اپنی تمام جائداد خلافت کی نذر کر دے، اور ایک کوڑی بھی اپنے پاس نہ رکھے، اور ابوبکر کے اسوہ حسنہ پر عمل کرے، جس نے اللہ کی راہ میں تمام گھربار لٹا دیا تو رسول نے دریافت کیا، بال بچوں کے لئے کیا رکھا؟ ابوبکر نے عرض کیا: ابقیت لہم اللہ ورسولہ، سچ ہے:

آنکس کہ ترا بخواست جاں را چہ کند؟ — فرزند و عیال و خانماں را چہ کند؟
دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی — دیوانہ تو ہر دو جہاں را چہ کند؟

(۱۱۱) وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ۭ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ۭ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○

اور کہتے ہیں کہ جنت میں ہرگز نہ جائینگے مگر وہ جو یہودی ہونگے یا نصاری، یہ ان کی باطل آرزوئیں ہیں، ان سے کہدو کہ اگر وہ سچے ہوں تو کوئی دلیل لائیں،

(۱۱۲) بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۠ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

بیشک جس نے اپنا منہ اللہ کے لئے فرمانبردار بنا دیا، اور وہ نیکی پر ہی تو اس کی مزدوری اسکے رب کے پاس ہی، اور نہ ڈر ہی اُن پر، اور نہ اُن کو غم۔

یہودیوں کی ایمانی حالت تو یہ ہی کہ کسی شخص کو بھی راہ حق اختیار نہیں کرنے دیتے،

مگر باوجود ان حرکتوں کے نجات کے متعلق ان کا عقیدہ یہ ہی، حالانکہ دخول جنت کے لئے اوّلین شرط یہ ہی کہ وہ یکسر اطاعت و فرماں برداری بن جائے، اس کا اُٹھنا اور بیٹھنا سونا اور جاگنا، کھانا اور پینا، چلنا اور پھرنا، جینا اور مرنا سب اسی کے لئے ہو: ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین، لاشریک لہ وبذالک امرت وانا اوّل المسلمین، (۶: ۱۶۳) جس کی فطرت صالح اور قلب سلیم ہو، الا من اتی اللہ بقلب سلیم، اور جو الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت کے گروہ میں شامل ہو۔

تنسیخ ملل

(۱۱۳) وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُمْ يَتْلُونَ الْكِتٰبَ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ○	اور یہود نے کہا کہ نصاریٰ کسی راستی پر نہیں، اور نصاریٰ نے کہا یہودی راستی پر نہیں، حالانکہ وہ کتاب پڑھتے ہیں، ایسا ہی ان لوگوں نے بھی کہا جنکے پاس علم نہیں، پس جس بات میں وہ جھگڑتے تھے اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز کریگا۔

جب نصاریٰ نجران کا وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، تو علماء و احبار یہود بھی ان سے ملنے کے لئے آئے، باہمی گفتگو ہوتی رہی، تا آنکہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں نہایت ہی گستاخانہ الفاظ استعمال کئے اور کہا کہ نصاریٰ بالکل غلط راستہ اختیار کئے ہوئے ہیں، ادھر عیسائیوں نے حضرت موسیٰ کی نبوت کا انکار کیا اور کہا کہ سب کے سب یہودی ضلالت و گمراہی میں مبتلا ہیں، اور لطف کی بات یہ ہی کہ دونوں گروہوں کا توراۃ پر ایمان ہی جس میں حضرت موسیٰ و عیسیٰ دونو کی نبوت کا اعلان ہی، ایک دوسرے کو گمراہ کہنا، اور راہ حق پر نہ سمجھنا اس لئے ہی کہ انہیں سے کوئی فریق اقوام و ملل کے بدلنے اور منسوخ ہونے کا قائل نہیں۔

نسخ قبلہ پر اعتراض کرنے سے قبل یہ دونوں آپس میں فیصلہ کرلیں کہ ان میں سے

حق پر کون ہی، اور یاد رہے جب تک وہ تنسیخ ادیان وملل کے اصول کو تسلیم نہ کرینگے خود ان کا وجود ثابت نہ ہوسکیگا، یہودی دنیا میں اس وقت رہ سکتے ہیں جب موسیٰ علیہ السلام سے پہلے جتنے مذاہب تھے ان کو منسوخ مان لیا جائے، اور اگر یہود و نصاریٰ باہمی رضامندی سے ایک نتیجہ پر پہونچ بھی جائیں تو ان سے دست و گریبان ہونے کے لئے مجوسی ہیں، جن کا دعویٰ یہ ہی کہ ملت ابراہیمی کے اصلی پیروکار وہی لوگ ہیں۔

واقعہ یہ ہی کہ اس قسم کے اعتراضات کرنا، اور اصول تنسیخ ملل کو تسلیم نہ کرنا، تعلیم یافتہ جماعت کی شان سے بالکل بعید ہی، یہ جاہلوں کی باتیں ہیں، جو ارتقا روتنزول اقوام کے اصول وضوابط سے واقف نہیں ہوتے، اس جھگڑے کے طے کرنے کی بہترین صورت یہ تھی کہ گھر میں بیٹھکر غور وفکر کرتے، اس وقت انہیں معلوم ہوجاتا کہ دنیا میں قوموں کا بننا اور بگڑنا اسی اصول پر قایم ہی، اور اس کے سوا اور کوئی چارہ کار ہی نہیں، جب یہ لوگ اس طرح فیصلہ کرنے کے لئے تیار نہیں تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ اسلام کی راہ ترقی میں رکاوٹیں پیدا کرنا ان کی زندگی کا اصلی مقصد ہی، اور صرف اسی ایک غرض کی خاطر سوالات کا سلسلہ جاری ہی، پس جب حق کی تلاش نہیں تو ان جھگڑوں کے طے ہونے کی بھی کوئی صورت نہیں، ان سب کا فیصلہ قیامت پر اٹھا رکھئے کہ وہی احکم الحاکمین حقیقت اصلیہ کو واضح کردیگا۔

حقیقت قبلہ

(۱۱۴) وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰہِ اَنْ یُّذْکَرَ فِیْہَا اسْمُہٗ وَسَعٰی فِیْ خَرَابِہَا اُولٰٓئِکَ مَا کَانَ لَہُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْہَآ اِلَّا خَآئِفِیْنَ ۥ لَہُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّلَہُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ○

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہی جس نے اللہ کی مسجدوں میں اس کا نام لینے سے منع کیا، اور اسکے اجاڑنے کی کوشش کی، ایسے لوگوں کو مناسب نہیں کہ مسجدوں میں آئیں مگر ڈرتے ڈرتے، ان کے لئے دنیا میں ذلت ہی اور آخرت میں عذاب عظیم ہے۔

دنیا میں ہر قوم کی زندگی کے لئے ضروری ہی کہ اس کا ایک نہ ایک مرکز ہو، تمام افراد

ملّت اسی کے ساتھ وابستہ ہوں، ہر ایک شخص کو اسی کے ساتھ پیوستگی اور مواصلت ہو،
اور یہ ایک ایسا قاعدہ کلیہ ہے کہ زمین و آسمان کی ہر چیز اس کے ماتحت کام کر رہی ہے،
ہزاروں لاکھوں نجوم و کواکب اور ثوابت و سیارات ہیں مگر سب کا تعلق سورج کے
ساتھ ہی جس سے وہ اپنی روشنی حاصل کرتے ہیں، ایک درخت کی صدہا ٹہنیاں اور شاخیں
ہیں، مگر تمام کا رزق جڑ سے آتا ہی، ہر دریا اور نہر کے لئے چشمہ ہی، پس اسی قاعدہ کے مطابق
ضروری تھا کہ اُمّت مسلمہ کی ہدایت و راہ نمائی کے لئے ایک مرکزی درس گاہ ہوتی، جس
کی شاخیں تمام دنیا میں پھیل جاتیں، جو ان تمام متفرق اور منتشر اجزا کے لئے اتحاد کا مرکزی نقطہ
ہوتی، جو سب کے لئے جڑ کا کام دیتی، جسکے سرچشمہ سے تمام عالم اسلامی کے دریا اور نہریں
سیراب ہوتیں، چنانچہ اس غرض کے لئے وادِ غیر ذی زرع کو منتخب کیا گیا، وہ سب سے اعلیٰ
تعلیم گاہ قرار پائی، اور دنیا بھر کی تمام مساجد کو اس کے ساتھ ملحق کر دیا گیا کہ سب درس گاہوں
کی نگراں کار و محافظ ہو، جب مختلف بلاد و امصار اسلامی کے مسلمان اپنی اپنی تعلیم گاہوں سے
فارغ ہوں تو ایک مرتبہ اس مرکزی درس گاہ میں بھی ضرور حاضر ہوں۔

یہودیوں نے نسخ قبلہ پر اعتراض کیا کہ بیت اللہ قبلہ نہ بنے، لیکن دراصل ان کا مقصد
یہ تھا کہ مسلمانوں میں لامرکزیت کی ترویج و اشاعت ہو، ایک مرکز سے وابستہ نہ رہ سکیں،
ان کی قوتیں منتشر ہو جائیں، ان کی متحدہ طاقت فنا ہو جائے، ان کا کوئی تعلیمی مرکز نہ رہے
اور جب مرکز نہ ہوگا تو دنیا بھر کی مسجدیں خود بخود ذکر الٰہی سے خالی ہو جائینگی، کوئی قوت
اُن کی نگراں کار نہ ہوگی، ان کا نظام قایم نہ رہ سکے گا، پھر ان سے بڑھ کر بھی کوئی
دوسرا شخص ظالم ہو سکتا ہی، ایسے لوگوں کو مسجد میں قدم رکھتے ہوئے ڈرنا چاہیے کہ
کہیں ان پر عذاب نہ نازل ہو جائے، آخر میں ان کا انجام بتا دیا کہ وہ دنیا میں بھی
ذلیل رہینگے، اور آخرت میں عذاب عظیم کے مستحق ہونگے۔

(۱۱۵) وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا | اور اللہ ہی کے لئے ہی مشرق اور مغرب، سو جس طرف

تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ | تم رخ کرو، ادھر ہی کو اللہ متوجہ ہے، بیشک وہ گنجایش والا ہی اور سب کچھ جانتا ہے۔

مذہبی آدمی ہونے کے باوجود بنی اسرائیل، اللہ تعالیٰ کی رحمت کو بیت المقدس ہی میں محدود کرنا چاہتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ صرف اسی طرف رخ کرنے سے انوار و تجلیات الٰہیہ کا نزول ہو سکتا ہے، یہ خیال بالکل غلط ہے بلکہ اس کے لئے تو مشرق و مغرب سب برابر کی حیثیت رکھتے ہیں، جس جگہ کچھ لوگ جمع ہو کر اس کے ذکر میں مصروف ہونگے اسکی رحمت فوراً اس طرف متوجہ ہو جائیگی، اس کی رحمت کا کوئی احاطہ نہیں کر سکتا، اور وہی جانتا ہے کہ اس کا صحیح محل نزول کونسا ہے۔

قاعدہ یہ ہے کہ جب ایک بزرگ کسی جگہ بیٹھکر اللہ کی یاد کرتا ہے تو وہاں اس کی رحمت نازل ہونا شروع ہو جاتی ہے، اس کے بعد اگر عام لوگ اس کا اتباع کریں تو اور زیادہ انوار الٰہیہ نازل ہونا شروع ہو جائینگے، تمام جانتے ہیں کہ بیت اللہ کی بنیاد ابراہیم و اسمٰعیل دونوں نے مل کر رکھی، اور اس وقت سے لیکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر نبی نے اس کا حج کیا، گویا بنا کی تاریخ سے لے کر اُمّت مسلمہ کے وجود تک کوئی ایک زمانہ بھی ایسا نہیں گزرا کہ کوئی نہ کوئی پیغمبر جلیل طواف کعبہ کی غرض سے یہاں نہ آیا ہو، بیت اللہ بننے کے چالیس سال بعد حضرت اسحٰق علیہ السلام نے بیت المقدس کی بنیاد ڈالی اور آخر داؤد و سلیمان نے اس کی عمارت بنائی، اب ظاہر ہے کہ بیت اللہ جس قدر اس کی رحمت کے نزول کا باعث بن سکتا ہے، بیت المقدس اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔

بعض لوگوں نے اس آیت کے یہ معنی لئے ہیں کہ اس میں مسلمانوں کے غلبہ و اقتدار کی پیشین گوئی ہے، وہ جس طرف بھی رخ کرینگے فتح و نصرت ان کے ساتھ ساتھ ہوگی، دنیا کے گوشہ گوشہ اور کونہ کونہ میں پھیل کر رہیں گے، اور مشرق و مغرب پر انہیں کا قبضہ ہوگا، اللہ کی وسعت کو کون پا سکتا ہے، دوسری جگہ سورۂ قدر میں اسی قسم کی پیشین گوئی کی:

تنزل الملٰئکۃ والروح فیھا باذن ربھم من کل امرٍ سلٰمٌ ھی حتیٰ مطلع الفجر
(۹۷ : ۴ و ۵) لیلۃ القدر میں امن اور سلامتی کا جو پیغام نازل ہوا ہے وہ مشرق و مغرب تک پھیل کر رہیگا۔

(۱۱۶) وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا لا سُبْحٰنَہٗ ط بَلْ لَّہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط کُلٌّ لَّہٗ قٰنِتُوْنَ ○ (۱۱۷) بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَاِذَا قَضٰٓی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ○

اور کہتے ہیں کہ اللہ اولاد رکھتا ہے حالانکہ وہ اس سے پاک ہے، بلکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کا ہے، سب اس کے فرماں بردار ہیں، آسمانوں اور زمین کا وہی موجد ہے، اور جب کسی کام کے کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اسے کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔

اہل کتاب کا دعویٰ یہ ہے کہ اللہ کی رحمت صرف بیت المقدس ہی میں مل سکتی ہے، اس غلط عقیدہ کی بنا یہ ہے کہ اس سے پہلے یہودی عزیز علیہ السلام کو اور عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا تسلیم کرتے ہیں، حالانکہ اس کی ذات اقدس ان تمام تعلقات اور قیود سے پاک ہے، اور زمین و آسمان کی ہر چیز اس کی مملوک ہے۔

بنی اسرائیل کی شریعت میں علماء و مشائخ کے لئے ابن اللہ کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا جس کے معنی محبوب الٰہی ہوتے تھے، مگر جس وقت عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کے خلاف یونانیوں کو اپنے مذہب کی جانب بلانے کی کوشش کی، تو ان کے عقول عشرہ کے مسئلہ سے فائدہ اٹھا کر کہنے لگے کہ عقل اول کی روح ان میں حلول کر گئی ہے، اس لئے اگر پہلے احبار یہود مجازی طور پر ابناء اللہ کہے جاتے تھے تو عیسیٰ علیہ السلام حقیقی معنی کے اعتبار سے ابن اللہ ہیں۔

عقول کا سلسلہ چلانا بالکل غلط ہے، اس نے اپنی حکومت کسی کے حوالہ نہیں کی، بلکہ ہر چیز کا تعلق براہ راست اس کی ذات سے ہے، ابداع کہتے ہیں ایجاد شی لا من شی فیخرج الشی من کتم العدم بغیر مادۃ کہ بغیر مادہ کے کسی چیز کو عدم محض سے وجود

میں لانا، پس زمین و آسمان اور اس کی ہر چیز کا مبدع وہی ہے، اسی میں عیسیٰ علیہ السلام بھی داخل ہیں، اور اس کے فرماں بردار بندے، دوسری جگہ آیا: لن یستنکف المسیح ان یکون عبداً للہ ولا الملٰئکۃ المقربون (۴: ۱۷۰) مسیح کو خدا کا بندہ ہونے سے ہرگز کسی قسم کا عار نہیں، اور نہ فرشتوں کو جو خدا کے مقرب ہیں، قیامت کے روز جب ان سے پوچھا جائیگا کہ کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اپنا خدا مانو، تو وہ اپنی بریت و پاک دامنی کا اظہار کرینگے: واذ قال اللہ یٰعیسی ابن مریم ءانت قلت للناس اتخذونی وامی الٰھین من دون اللہ۔ قال سبحٰنک ما یکون لی ان اقول ما لیس لی بحق۔ ان کنت قلتہ فقد علمتہ۔ تعلم ما فی نفسی ولا اعلم ما فی نفسک۔ انک انت علام الغیوب ۰ ما قلت لھم الا ما امرتنی بہ ان اعبدوا اللہ ربی وربکم (۵: ۱۱۶ و ۱۱۷)

پس جس طرح عزیر و عیسیٰ کو خدا کا بیٹا ماننے میں وہ غلطی پر ہیں، ایسے ہی اس کی توجہ کو بیت المقدس کی جانب محدود کرنے میں غلط راستہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔

(۱۱۸) وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۭ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ○	اور جن کو علم نہیں وہ کہتے ہیں کہ خدا خود ہم سے کیوں نہیں کلام کرتا، یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی، ایسے ہی جو لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں، ان ہی جیسی باتیں کہا کرتے تھے، ان سب کے دل ایک ہی طرح کے ہیں، ہم نے یقین داروں کے لئے اپنی نشانیاں صاف طور پر بیان کردیں۔

توراۃ کو کتاب الٰہی، اور موسیٰ کو نبی ماننے کے باوجود تحویل قبلہ پر اعتراض کرنا، اور تنسیخ ملل کے اصول کو تسلیم نہ کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ مذہب سے بہت دور جا پڑے ہیں، اس صورت میں قبلہ کی بحث تو بعد میں آئیگی، پہلے ان لوگوں کو مطمئن کرلیں جو اپنی جہالت

ولاعلمی کی وجہ سے کہتے ہیں کہ نبی بھیجنے کی ضرورت ہی کیا ہے، اللہ تعالےٰ ہم سے کیوں نہیں براہ راست گفتگو کرتا، یا ہم میں سے ہر ایک کو کس لئے نبی نہیں بنایا جاتا، ہم پر بھی اللہ کی آیتوں کا نزول ہو، اور ہم سے معجزات ظہور میں آئیں، دوسری جگہہ ان جاہلوں کا اسی قسم کا مطالبہ بیان کیا :- وَاِذا جاءتھم اٰیۃ قالوا لن نومن حتی نوتی مثل ما اوتی رسل اللہ (۶ : ۱۲۴) ان کے جواب میں کہا گیا، اللہ یعلم حیث یجعل رسٰلتہٗ ط (۶ : ۱۲۴) اللہ تعالےٰ خوب جانتا ہے کہ رسالت کا مستحق کون ہے، اسی کو نوازش کریگا۔

اس قسم کے سوال وجواب وہی لوگ کرتے ہیں، جو جاہل ہوں اور دین سے بے بہرہ، یہودی بھی ان جاہلوں کی سی باتیں کرتے ہیں، دونوں جماعتوں میں کوئی فرق نہیں، اگر طبیعت میں کجی اور جہالت نہ ہوتی تو آیات کے سنتے ہی ان میں یقین واذعان پیدا ہو سکتا تھا۔

بعثت کی ضرورت

(۱۱۹) اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا وَّلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ○	ہم نے تمہیں حق دیکر خوشخبری دینے والا، اور ڈرانیوالا بنا کر بھیجا ہے، اور تم سے دوزخ والوں کی نسبت سوال نہ کیا جائیگا۔

ممکن تھا اہل کتاب کی کج بحثیوں، اور جاہلانہ باتوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنگ دل ہوتے، جیسے سورہ شعراء میں فرمایا: لعلك باخع نفسك الا یکونوا مؤمنین (۲۶ : ۲) اس لئے آپ کے اطمینان قلب کے لئے فرمایا کہ ہم نے تم کو خواہ مخواہ رسول بنا کر نہیں بھیجا بلکہ دنیا کے حالات وواقعات اسی امر کے مقتضی تھے، اس لئے کہ :-

(الف) بنی اسرائیل کو زمانہ ہوا مسیح سے قبل ہی غضب الٰہی میں مبتلا ہو چکے تھے، انکو سانپ اور سانپ کے بچے کہا جاتا تھا، مسیح علیہ السلام کی لعنت نے ان کو اور زیادہ مسخ کر دیا، اور اب ان میں انسانیت کا ذرہ برابر بھی شائبہ باقی نہ رہا، ہمسایہ قوموں کی صحبت دیکھا دیکھی سے ان میں بت پرستی آگئی۔

(ب) یورپ قرون مظلمہ میں سے گزر رہا تھا، اور چاروں طرف جہالت کا دور دورہ تھا۔
انگلستان میں برٹن اور سیکسن وحشی قومیں آباد تھیں۔ نارتھمبرلینڈ، مڈلینڈ، کون ہیز، نارفوک، سوفوک، اور ساسیکس، اضلاع انگلستان میں ووڈن بت کی پوجا ہوتی تھی۔

فرانس، برن ہلڈ، سگ برٹ، فرے دی گونڈ دی، اور ل ہے رک کے نصف پر افسانوں کی حکومت تھی، جبکہ پادریوں کے ایما سے بہت سی بیہودگیاں روا رکھی جاتی تھیں فرانس ہمیشہ سیکسن قوم سے دریائے الب پر جنگ کرتا رہتا تھا، یہ لڑائی ۸۰۲ء کے بعد تک جاری رہی، جبکہ ۴½ ہزار سیکسن قیدی نہایت ہی بے رحمی سے شہر وردن میں قتل کئے گئے، ہنگری ان دنوں بے انتہا وحشی و بربری اقوام کے قبضہ میں تھا، جسکو ظالمانہ وسائل سے اپنے مذہب میں لایا گیا تھا۔

(ج) ایران میں مشرکیہ کا زور تھا، جنھوں نے زر، زن اور زمین کو وقف عام کر دینے سے اخلاق انسانی اور نوعی ارتقا کا ستیاناس کر دیا تھا۔

(د) ہندوستان میں پرانوں کا زمانہ تھا، بام مارگی فرقہ قابو یافتہ تھا، جو اپنے ناپاک اور گندے اصولوں کی طرف لوگوں کو بلاتے تھے مندروں میں عورتوں اور مردوں کی برہنہ تصاویر بنا کر رکھی جاتی تھیں، انہی کی پرستش ہوتی تھی، عبادت خانوں کے درو دیوار پر ایسی تصویریں آویزاں ہوتی تھیں، جن کو ایک لمحہ کے لئے بھی کوئی شریف اور مہذب انسان دیکھنا گوارا نہ کرتا تھا۔

(ہ) چین کے رہنے والے اپنے ملک کو آسمانی فرزند کی بادشاہت تصور کر کے خدا سے منہ موڑ چکے تھے، ہر کام کے جدا جدا بت مقرر تھے، کوئی بارش کا ہے، کوئی امن کا ہے اور کوئی جنگ کا۔ عام خیال یہ ہے کہ کانفیوشس نے آکر چین کی اصلاح کی ہے، مگر اس وقت تک اس کا بھی ظہور نہ ہوا تھا۔

(و) مصر میں عیسائیت کا دور دورہ تھا، مسیح علیہ السلام کی شخصیت اور ابنیت

کے متعلق نت نئے عقیدے بنتے تھے، جن کی وجہ سے ایک فرقہ دوسرے کی تکفیر کرتا، باہمی خون ریزی ہوتی، اور اگر موقع بن پڑتا تو آگ میں بھی جلا دیتے۔

(ز) عرب میں خود سری تھی، اپنے ہی بھائیوں کو قتل کرتے، جوا اور شراب کا عام دستور تھا، بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیتے، پتھر، درخت، چاند، سورج، پہاڑ اور دریا ان کے معبود تھے، انسانی حقوق کا کوئی ضابطہ نہ تھا، اسی لئے قتل انسان، رہزنی حبس بیجا، ناجائز تصرّف، بیجا مداخلت کے مرتکب ہوتے تھے۔

پس عین ضرورت کے مطابق آپ کی بعثت ہوئی، اس لئے آپ اپنا فرض برابر ادا کرتے رہیں، جو لوگ راہ حق اختیار کریں ان کی ہمتوں کو اور زیادہ بڑھایئے، اور دنیا و آخرت کی کامیابی کی ان کو بشارت دیجئے، لیکن جو آپ کی مخالفت کریں، انکی کمرہمت کو توڑیئے، اور ان کو عذاب الیم کی بشارت دیجئے، رہے ضدی اور ہٹ دھرمی لوگ، ان کا سمجھانا آپ کے ذمہ نہیں انما انت مذکر لست علیھم بمصیطر (۸۸ : ۲۱ و ۲۲) ان کی ناپاک اور ملحدانہ زندگی کے متعلق تم سے کوئی سوال نہیں کیا جائیگا۔

(۱۲۰) وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِىْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (۱۲۱) اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ○	اور تم سے یہود و نصاری ہرگز خوش نہ ہونگے جبتک ان کا دین اختیار نہ کرلو، ان لوگوں سے کہدو کہ اللہ کی ہدایت وہی اعلیٰ ہدایت ہے، اور اگر اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آگیا ہے ان کی خواہشوں کی پیروی کی، تو پھر اللہ سے بچانے والا نہ کوئی دوست ہوگا، اور نہ مددگار، جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کو پڑھتے ہیں جو پڑھنے کا حق ہوتا ہے، اور وہی اس پر ایمان بھی رکھتے ہیں اور جو کوئی اس سے منکر ہوگا وہی نقصان

یہاں بالکل صاف صاف کہہ دیا، اور لن لانے سے اسکے دوام اور ہمیشگی کی طرف اشارہ کیا کہ یہود و نصاریٰ ایک لمحہ کے لئے بھی مسلمانوں سے خوش نہیں ہو سکتے، اسلام کے لئے بغض و عداوت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، ان کے نزدیک مسلمانوں کا سب سے بڑا جرم یہی ہے کہ ان یقولی ربی اللہ، اسی معصیت کی طرف سورۂ بروج میں اشارہ کیا: وما نقموا منهم الا ان یومنوا باللہ العزیز الحمید، سچ ہے۔

حیاتک ذنب لا یقاس بہ ذنب!

البتہ اگر مسلمان اپنے قرآن کو ترک کر دیں، اور ان کی اطاعت قبول کرلیں، تو پھر وہ ان کے ساتھ ہیں، مگر ان اہل کتاب کی اطاعت کو قرآن حکیم کفر سے تعبیر کرتا ہے، سورۂ آل عمران میں فرمایا:۔

یاایها الذین امنوا ان تطیعوا فریقا من الذین اوتوا الکتاب یردوکم بعد ایمانکم کفرین ٥ وکیف تکفرون وانتم تتلی علیکم ایات اللہ وفیکم رسولہ و من یعتصم باللہ فقد ھدی الی صراط مستقیم (۳ : ۹۵ و ۹۶)	مسلمانو! اگر تم اہل کتاب کے کسی فرقہ کا بھی کہا مانوگے تو وہ تمہارے ایمان لائے پیچھے تم کو پھر کافر بنا چھوڑینگے، اور تم کیسے کفر کرنے لگوگے حالانکہ اللہ کی آیتیں تم کو پڑھ پڑھ کر سنائی جاتی ہیں، اور اُسکے رسول تم میں موجود ہیں، اور جو شخص اللہ کے دین کو مضبوطی سے پکڑے رہے تو وہ سیدھی رستے لگ لیا۔

اطاعت کی ضرورت اس وقت محسوس ہوا کرتی ہے، جب کسی قوم کے پاس قانون نہ ہو، مگر مسلمانوں کے پاس قانون بھی ہے، اور اس کی شرح بھی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مقدس قرآن کی عملی تفسیر ہے، باوجود اس کے پھر وہ یہود و نصاریٰ کی فرماں برداری کریں، تو انھیں سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ کی رحمت سے دور جا پڑے ہیں، سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا:۔

ولولا ان ثبتناك لقد کدت ترکن	اگر یہ بات نہ ہوتی کہ ہم نے تم کو ثابت رکھا تو تم بھی

الیہم شیئاً قلیلاً ۵ اذاً لاذقناك ضعف الحیٰوۃ وضعف الممات ثم لا تجد لك علینا نصیراً (۱۷: ۷۴، ۷۵)

جھکنے لگ ہی جاتے ان کی طرف تھوڑا سا، ایسا ہوتا تو ہم ضرور دونا عذاب زندگی کا اور دونا عذاب موت کا چکھاتے، پھر تم ہمارے مقابلہ میں کسی کو مددگار نہ پاتے

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام تر زندگی اس بات پر شاہد ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اُن کی ہمیشہ نصرت و یادری کی، اور کبھی ان کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑا، پس معلوم ہوا کہ آپ نے یہود و نصاریٰ کے اتباع کا خیال بھی نہیں کیا، اس آیت سے یہ استدلال کرنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، معاذ اللہ اہل کتاب کا اتباع کر سکتے ہیں سخت غلطی کا مرتکب ہونا ہے، اس آیت کے معنی دو طریق پر ہو سکتے ہیں:-

(الف) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت تمام اُمت مسلمہ سے خطاب کیا جا رہا ہے کہ اگر تم نے اہل کتاب کا اتباع کیا تو ظالم بن جاؤ گے، چنانچہ آل عمران کی آیت ابھی آپ پڑھ چکے ہیں۔

(ب) غیر ممکن اور محال کو فرض کیا گیا ہے، ایک جگہ فرمایا: لو کان فیہما اٰلھۃ الا اللہ لفسدتا (۲۱: ۲۲)

اگر محال اور ناممکن کے حسب ذیل اقسام کو پیش نظر رکھ لیا جائے تو اکثر اشکالات خود بخود رفع ہو جائینگے۔

(۱) عقلی، جو کبھی نہ ہو سکے، مثلاً نظیر باری تعالیٰ۔

(۲) فطری، جو نیچر کے خلاف ہو، آفتاب کا یکایک غائب ہو کر پھر کبھی نہ نکلنا۔

(۳) عادی، یا نیچر کے جس قدر قوانین ہمیں معلوم ہیں، ان کے خلاف، چنانچہ انبیاء علیہم السلام کے معجزات اسی تیسری قسم میں داخل ہیں۔

محال عقلی تو اس لئے نہیں ہو سکتا کہ اس میں وجود کے قبول کرنے کی قابلیت اور استعداد ہی نہیں ہوتی۔

محال فطری، اس حکیم علی الاطلاق کی حکمت کلی کے خلاف ہے، اس لئے نہیں ہوتا، مگر اس میں وجود کی قابلیت ضرور ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی قدرت اس سے متعلق ہو سکتی ہے۔

محال عادی، ہمیشہ حضرات انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ہاتھ پر ہوا ہے۔

قرآن حکیم صرف ارباب صلاح وتقویٰ کے لئے نازل کیا گیا ہے، وہی اس میں درس وفکر کرتے ہیں، اور اس پر عمل کرنے کے لئے پوری ہمت صرف کرتے ہیں، جو بات انہیں سمجھ میں نہ آئے آپ سے دریافت کر لیتے ہیں، یہی لوگ مومن ہیں، اس لئے صرف انہی کی تعلیم کی طرف آپ کی توجہ ہونی چاہیئے، یہود ونصاریٰ بات کی پچ کرتے ہیں، ان پر وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں، وہ خود ہی اپنی ذلت ورسوائی کے اسباب پیدا کر رہے ہیں، اور آخر میں یہی لوگ ناکام ونامراد رہیں گے۔

انصاف سے کام لیں

(۱۲۲) يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ	اے بنی اسرائیل! میرا احسان یاد کرو جو میں نے تم پر کیا، اور یہ کہ سارے جہان پر تم کو بڑا کیا،
(۱۲۳) وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـــًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا ھُمْ يُنْصَرُوْنَ	اور اس دن سے ڈرو کہ کوئی شخص کسی کے کچھ کام نہ آئے، اور نہ اسکی طرف سے معاوضہ قبول کیا جائے، نہ کسی کی سفارش کام دے، اور نہ لوگوں کی ان کو مدد پہونچے۔

گزشتہ آیات میں تحویل قبلہ کے متعلق انہیں الزامی جواب دیا گیا، اب تحقیقی اعتبار سے گفتگو کی جاتی ہے، ان کی قومی دیانت، خاندانی بزرگی اور احتساب اعمال کو پیش کر کے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ جھوٹ بولنے سے پرہیز کریں، اور صحیح جواب دیں۔

(۱۲۴) وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ	اور جب ابراہیم کے پروردگار نے ان کو چند باتوں میں آزمایا، پھر انہوں نے ان کو پورا کر دیا، اللہ تعالیٰ

قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ۝

نے فرمایا کہ میں تجھ کو تمام لوگوں کا پیشوا بناؤنگا، ابراہیم نے عرض کیا اور میری اولاد میں سے؟ فرمایا کہ ظالموں کو میرے اقرار سے کچھ حصّہ نہ ملیگا۔

یہاں سے اُمت مسلمہ کے موسس اوّل حضرت ابراہیم علیہ السلام، ان کی ترک وطن اور ذہاب الی اللہ کی مختلف منازل، قربانی کے مراتب، اور بنائے کعبہ کی تاریخ بیان کی جاتی ہے، یہ تفصیل خود اُن کی کتابوں میں موجود ہے، اس کو پڑھ لینے کے بعد بتائیں کہ ابراہیم کے وارث کا قبلہ کونسا ہونا چاہیئے؟ اگر باوجود اس کے پھر بھی نہ مانیں تو معلوم ہوجائیگا کہ یہ تمام سعی وکوشش، فتنہ وفساد برپا کرنے کے لئے ہے، ورنہ توراۃ کی تعلیم کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ یہی ہونا چاہیئے۔

امتحان اور آزمایش کی غرض یہ ہوتی ہے کہ:

(الف) امتحان لینے والا خود اس شخص کی قابلیت اور استعداد کو دریافت کرنے کی فکر میں ہے، اللہ تعالیٰ کو اس کی ضرورت نہیں۔

(ب) دوسروں پر اس کے فضائل ومحاسن اور کمالات کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔

(ج) اس کی کمزوریوں کو دور کرکے کامل ومکمل بنانا مقصود ہے۔

چنانچہ اس جگہ دوسرے معنی مراد ہیں، وہ کلمات کیا تھے جن میں ابراہیم علیہ السلام کا امتحان لیا گیا؟ قرآن نے خود، دوسرے مقامات پر ان کو بیان کردیا ہے، اور وہ حسب ذیل ہیں:-

(۱) قوم سے علیحدگی، حضرت ابراہیم کی قوم ستارہ پرست تھی، اُنہوں نے بہتیرا سمجھایا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا، آخر انہیں اپنی قوم سے علیحدگی اختیار کرنی پڑی، اور اعلان کردیا

انا برءٰؤا منکم ومما تعبدون من دون اللہ کفرنا بکم وبدا بیننا وبینکم العداوۃ والبغضاء ابدا حتی تؤمنوا باللہ وحدہ، (۶۰: ۴) اور اس طرح بتادیا کہ حق وحریت

کی راہ میں قومیت کی آہنی زنجیریں پاؤں کو بوجھل نہیں کرسکتیں، اسلام ان پابندیوں سے آزاد، اور ایک بالاتر حقیقت ہے، تمام قومیں اور ملتیں اس کے دائرہ میں داخل ہوتے ہی اپنے امتیازات وخصائص کو مٹا دیتی ہیں اور صرف ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم ہی ان کے لئے باعث عز و افتخار رہ جاتا ہے، پس اگر قومیت اور اسلام میں کبھی تصادم ہو تو ایک مسلم قانت کا فرض ہے کہ وہ فوراً اس کی پابندیوں سے اپنے آپ کو آزاد کرلے۔

(ب) جانی قربانی، جب قوم کی مخالفت حد سے بڑھ گئی، تو سب نے مل کر انہیں آگ میں ڈال دیا: قالوا حرقوہ وانصروا آلھتکم ان کنتم فٰعلین (۲۱: ۶۸) کلمۂ حق کی خاطر اس کائنات خلت نے آگ میں کودپڑنا گوارا کیا، اس لئے قدوس حق نواز کی طرف سے حکم ہوا، قلنا یا نار کونی بردا وسلٰما علی ابرٰھیم (۲۱: ۶۹)

(ج) ترک وطن، باوجود ان تکالیف وشدائد کے انہوں نے دعوت الی اللہ کے اہم واقدم فرض کو ترک نہیں کیا، آخر چاروناچار انہیں وہ منزل اختیار کرنی پڑی، جو شہرائی حق کے لئے ضروری اور ناگزیر ہے، اور فرمایا: انی ذاھب الی ربی سیھدین (۳۷: ۹۹) توحید کے لئے انھیں وطن چھوڑنا پڑا، اور بتا دیا کہ وطنیت، اسلام کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی، مسلمان ایک خاص جگہ کے رہنے والے نہیں، بلکہ وہ شھداء علی الناس بنا کر بھیجے گئے ہیں کہ دنیا بھر کی قوموں کی نگرانی کریں، اور سب جگہ ان کی حکومت ہو، اسلئے تمام روے زمین ان کا وطن ہے۔ ع

مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا!

(د) بیٹے کی قربانی، ایک شخص اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال سکتا ہے، اس کے لئے قوم اور وطن کا قربان کرنا بھی کچھ مشکل نہیں، مگر وہ ایک لمحہ کے لئے یہ نہیں دیکھ سکتا کہ اسکی عزیز ترین متاع حیات، بیٹے کو کسی قسم کی تکلیف پہنچے، یہی سب سے زیادہ کٹھن منزل ہوتی ہے، اس لئے سب سے آخر میں اس کو رکھا گیا: فلما بلغ معہ السعی قال یٰبنی انی

ارٰی فی المنام انی اذبحك فانظر ماذا تریٰ ، قال یابت افعل ما تؤمر ستجدنی ان شاء اللہ من الصّٰبرین ٥ فلما اسلما وتلّه للجبین ٥ وناديٰنه ان یا براھیم قد صدقت الرءیا انا کذلك نجزی المحسنین (۳۷ : ۱۰۰ تا ۱۰۵)

حضرت ابراہیم علیہ السلام ان چاروں امتحانات میں کامیاب ثابت ہوئے، دوسری جگہہ آتا ہے: وابراھیم الذی وفیٰ (۵۳ : ۳۸) دنیا کو معلوم ہوگیا کہ اس زمین کی پشت پر ابراہیم سے بڑھ کر اور کوئی مسلم نہیں، اور وہ خود پکار اٹھے، اسلمت لرب العٰلمین، (۲ : ۱۲۵) ایک اور جگہہ کہا: ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العٰلمین ٥ لا شریك له وبذلك امرت وانا اوّل المسلمین (۶ : ۱۶۳) دوسرے مقام پر یوں توحید کا اقرار کیا: انی بریٓء مما تشرکون ٥ انی وجهت وجهی للذی فطر السمٰوٰت والارض حنیفا وما انا من المشرکین، (۶ : ۷۹)

جب ابراہیمی کمالات ظاہر ہوگئے تو فرمایا ہم تمکو دنیا کا امام وپیشوا بناتے ہیں، اگر حکومت وفرمانروائی کے دروازہ میں کسی قوم کو داخل ہونے کی خواہش ہو تو وہ تمہاری امامت وپیشوائی میں کام کرے، ایثار وفدویت، اور فداکاری وسرفروشی اس کے لئے الزم اللوازم ہے، گویا اس وجود مقدس نے دنیا کو بتا دیا کہ کامیابیوں کی بنیاد قربانی ہے، جو لوگ اس کے لئے تیار نہ ہونگے، وہ کبھی زندہ نہ رہ سکیں گے، چنانچہ اس کے بعد ہی فوراً فرما دیا کہ لا ینال عھدی الظّٰلمین۔

یہ عہد صرف حضرت اسحٰق کے ساتھ مخصوص نہ تھا جیسا یہودیوں نے سمجھا بلکہ حضرت اسمٰعیل بھی اس میں شریک تھے،

تفصیل ملاحظہ ہو:-

(۱) خدا نے درد وغم کو سنا، ہاجرہ کے، ۱۶ : ۱۲ کتاب پیدائش

سارہ کے، ۲۵ : ۱۲ "

(۲) خدا نے نام رکھا، ہاجرہ کے فرزند سمٰعیل کا، ۱۲ : ۱۶ کتاب پیدائش

سارہ کے فرزند اسحٰق کا، ۱۹ : ۱۷ 〃

(۳) خدا نے برکت دی، ہاجرہ کے فرزند اسمٰعیل کو، ۲۰ : ۱۷ 〃

سارہ کے فرزند اسحٰق کو، ۲۰ : ۲۵ 〃

(۴) خدا ساتھ تھا، اسمٰعیل کے، ۲۰ : ۲۱ 〃

اسحٰق کے، ۲۴ : ۲۶ 〃

(۵) قوموں اور بادشاہوں کا باپ ہوگا، اسمٰعیل، ۱۶ : ۲۵ 〃

اسحٰق، ۶ : ۱۷ 〃

ان آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے امامت و پیشوائی کا جو عہد کیا تھا، اس میں اُن کے دونوں صاحبزادے اسمٰعیل و اسحٰق شریک تھے، دو آیتیں اور بھی پیش نظر رکھ لیجئے کہ مزید وضاحت ہو:-

جو تیری صلب سے پیدا ہوگا، وہ ہی تیرا وارث ہوگا، اور وہ اُس کو باہر لے گیا اور کہا کہ اب آسمان کی طرف نگاہ کر اور ستاروں کو گن اگر تو انہیں گن سکے، اور اسے کہا کہ تیری اولاد ایسے ہوگی (کتاب پیدائش ۱۵ : ۴ و ۵) حضرت اسمٰعیل یقیناً ابراہیم کی صلب سے تھے، آگے چلکر اسمٰعیل کا نام لیا: اور اسمٰعیل کے حق میں میں نے تیری سنی، دیکھ میں اسے برکت دونگا اور اسے برومند کروں گا، اور اسے بہت بڑھاؤں گا، اور اس سے بارہ سردار پیدا ہونگے، اور میں اسے بڑی قوم بناؤنگا (پیدائش ۱۷ : ۲۰)

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ وہ کلمات جن میں ابراہیم کا امتحان ہوا، یہ ہیں، (۱) مونچھوں کا کم کرنا، (۲) ڈاڑھی کا بڑھانا، (۳) مسواک کرنا، (۴) ناک میں پانی ڈالنا، (۵) ناخنوں کا کترنا، (۶) ناک صاف کرنا، (۷) بغل کے بال مونڈنا، (۸) موئے زیر ناف مونڈنا (۹) پانی سے استنجا کرنا (۱۰) اور کلی کرنا - ان کا اعتماد اس روایت پر ہے جسکو

ترمذی نے عائشہ سے نقل کیا ہے: عشر من الفطرۃ، قص الشارب، واعفاء اللحیۃ، والسواک، والاستنشاق، وقص الاظفار، وغسل البراجم، ونتف الابط، و حلق العانۃ، وانتقاص الماء، والمضمضۃ۔

لیکن ہم نے جو معنی اختیار کئے ہیں، وہی حبرامت حضرت ابن عباس کی رائے ہے:
الکلمات التی ابتلی بھا ابراھیم فراق قومہ فی اللہ حین امر اللہ بمفارقتھم و محاجتہ نمرود فی اللہ حین قال احی وامیت وصبرہ علی قذفھم ایاہ فی النار لیحرقوہ فی اللہ والھجرۃ بعد ذالک من وطنہ وبلادہ حین امرہ بالخروج عنھم وما امرہ بہ من والصبر علیھا وما ابتلی بہ من ذبح ولدہ، مگر ترمذی کی روایت بھی ہمارے مخالف نہیں، اصل بات یہ ہے کہ انسان کی فطرۃ اولی تو محض نیکی ہی ہے، اس میں بدی کی مطلق آمیزش نہیں، مگر اس کی ثانوی تخلیق میں خیر و شر دونوں کو ودیعت کیا گیا ہے، اگر ایک شخص کا قلب سلیم ہے، اور خارجی اثرات ضلالت سے اسکے آئینہ کو گرد آلود نہیں کیا گیا، تو وہ ضرور اپنے خالق کے آگے جھکے گا، اور جو چیزیں اسکے تزکیۂ نفس اور طہارت و پاکیزگی میں خلل انداز ہونگی، اُن کو دور کرنے کی کوشش کریگا، اس طہارت کے پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ ان خصائل فطرت کا اپنے آپ کو عادی بنا لیا جائے،

اگر ایک شخص چالیس روز تک ان خصائل فطرت کو ترک کر دے، تو اُسے معلوم ہوگا کہ اس کے ارادہ میں ضعف، اس کے عزم میں کمزوری، اور اس کی طبیعت میں کدورت پیدا ہوگئی ہے، خیالات میں پراگندگی اور افکار میں تشتت معلوم ہوتا ہے، حضرت ابراہیم اس رواج کے بانی ہیں، قوم میں ایک خاص کیرکٹر پیدا کرنا ان کا مقصود ہے اور وہ یہ ہے کہ جو چیزیں ہمارے بدن میں کدورت پیدا کرنے والی ہوں، اُن کو فوراً کاٹ دیا جائے تاکہ آہستہ آہستہ طبیعت اس درجہ پر آجائے کہ صحیح فرض معلوم ہونے پر انسان اپنی زندگی

بھی قربان کر سکے۔

طہارت و پاکیزگی کے یہ اصول اساسی اس قدر آسان ہیں کہ عام انسانوں میں ان کی اشاعت نہایت سہولت کے ساتھ ہو سکتی ہے، حضرت ابراہیم نے ان کو عام کر دیا، اور ہر شخص ان کا عادی بن گیا تاکہ مجددین ملت اور دعاۃ اسلام کی تعلیم کو لوگ قبول کرنے کو تیار ہوں، اور ان کی راہ میں جو رکاوٹیں حائل ہو سکتی ہیں، وہ ایک حد تک دور ہو جائیں

(۱۲۵) وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝	اور جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کے اجتماع اور پناہ کی جگہہ بنایا، اور لوگوں کو حکم دیا کہ ابراہیم کی جگہہ کو نماز کی جگہہ مقرر کرو، اور ابراہیم اور اسمٰعیل سے کہا کہ میرے اس گھر کو طواف کرنے والوں، اور اعتکاف کرنیوالوں، اور رکوع اور سجدہ کرنیوالوں کے لئے پاک رکھو

سرزمین عرب میں بیت اللہ کے سوا اور کوئی عبادت گاہ نہ تھی، یمن، حضرموت، خلیج فارس کے کناروں، شام کے جنگلوں، اور حیرہ و عراق عرب سے لوگ ہر سال یہاں جمع ہو کر فریضہ حج ادا کیا کرتے تھے، مورخین اس کی قدامت کی کوئی تاریخ معین نہیں کر سکتے، یہودی، اور عیسائی متفق ہیں کہ بیت المقدس کی بنیاد اسحٰق نے ڈالی، اور سلیمان نے اس کی تکمیل کی، اس لئے کعبہ کی تعمیر یروشلم سے قریباً ۹۲۱ سال، اور مسیح علیہ السلام سے ۱۹۲۱ سال پیشتر کی ہے۔

ہندوستان کی تہذیب کا اولین دور جو ویدکا ابتدائی زمانہ ہے مسیح سے چودہ سو اور دو ہزار سال پیشتر کا تھا، اس دور میں یہاں کوئی مندر نہ تھا، پس معلوم ہوا کہ عبادت الٰہی کے لئے دنیا میں جو اولین گھر تعمیر ہوا وہ بیت اللہ ہی تھا۔ ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ (۳: ۹۰)

مثابۃ مشتق ہے ثاب یثوب سے، جس کے معنی ہیں بار بار رجوع کرنے کے، گویا ابراہیم

نے جو گھر بنایا ہے، وہ زیارت گاہ خلائق ہوگا، دنیا کے ہر گوشہ سے زخمی دل یہاں آکر شفا کا مرہم پائینگے، مضطر روحوں کو اسکی آغوش میں آرام نصیب ہوگا، گناہ کی کثافتوں سے آلودہ جسم اس جگہہ آکر اپنی گندگیوں اور ناپاکیوں کو دھوئینگے، اسی روشنی کی طرف سب پروانے دوڑینگے، اور اسی آشیانہ کی جانب تمام پرند اُڑینگے، اس فریضۂ حج کو نہ تو کوئی دنیوی طاقت روک سکیگی، اور نہ یہ گھر ہی برباد ہوگا۔

پھر یہی نہیں بلکہ وہ امن کا گھر ہوگا، حرماً امناً یجبیٰ الیہ ثمرات کل شیئ (۲۸: ۵۷) عرب کے لوگ باوجود اپنی وحشت و بربریت کے حرم کے اندر نہ تو کسی کا خون بہاتے تھے، اور نہ کسی سے جنگ کرتے تھے، ایک عیسائی بادشاہ ابرہہ والی یمن نے اس پر حملہ کیا اور برباد ہوگیا[1]، امن والا گھر اس لئے بنایا گیا کہ لوگ اس جگہہ آئیں، اور امن و اطمینان قلب کے ساتھ خدا کی یاد کر سکیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام، اور اُن کی اولاد کا دستور تھا کہ میدان میں جس جگہہ کو عبادت گاہ مقرر کرتے، وہاں ایک لمبا، بن گھڑا پتھر، ستون کی طرح کھڑا کر دیتے تھے، جیسے اب بھی مسلمان کھلی جگہہ میں نماز پڑھتے وقت اپنی چھڑی وغیرہ گاڑ لیا کرتے ہیں، جسے سترہ کہتے ہیں۔ مقام ابراہیم ایک مشہور جگہہ ہے، جس کے دیکھنے سے خود ذی نشان یاد آجائیگا، اور بار بار اس کی زیارت کرنے سے وہی جذبات پیدا ہونگے جو کائنات خلت اور اُس کے فرزند جلیل میں تھے، اس لئے حکم ہوا کہ مقام ابراہیم کو نماز کی جگہہ بناؤ تاکہ اس جگہہ قدم رکھتے ہی تمام واقعات ذہاب الی اللہ یاد آجائیں، ہر شخص اسلام کی خاطر، اپنی جان، اپنا مال،

[1] یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدایش کے سال ہوا، اس میں دراصل یہ بتانا تھا کہ مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن عیسائی ہونگے، یہی خانہ کعبہ پر اپنے پیشرو ابرہہ کی طرح حملہ آور ہونگے، اور آخر ان کا وہی انجام ہوگا جو انکے ہم مذہب کا ہوا، چنانچہ موجودہ واقعات اس کی حرف بحرف تصدیق کرتے ہیں، اس کا ایک ٹکڑا پورا ہوگیا، دوسرے کا انتظار ہے، وما ذلک علی اللہ بعزیز، وکان وعداً مفعولا

وطن و دیار، اور شعوب و قبائل کو قربان کرنے کو تیار ہو، ان قربانیوں نے ابراہیم کو دنیا کا امام و پیشوا بنا دیا، پس تم بھی ان چیزوں کی مشق کر کے امامت و پیشوائی کے لئے دعا کرو!
واجعلنا للمتقین اماماً۔

یہ گھر اس لئے بنایا گیا تھا کہ خدائے واحد کی غلامی کرنے والے یہاں آئیں، اور اپنے محبوب حقیقی سے قرب و وصال کی فکر کریں، جب ہم کو یہ معلوم ہے کہ دنیا کے تمام کام اسی خدائے یگانہ کے اختیار و ارادہ سے انجام پاتے ہیں، ہر قسم کی داد و ستد، سلب و عطا، اور نفع و ضر اسی کے ہاتھ میں ہے، ہر قسم کا کمال، اور حسن و خوبی اسی کی ذات اقدس میں موجود ہے، اور اس کے سوا اس عالم کا اور کوئی مربی و محسن نہیں، تو بے شبہ عقل کے نزدیک ایسے خدا کی اطاعت سے سرمو انحراف جائز نہ ہوگا، اور یہ لازم ہوگا کہ اس کی خدمت گزاری میں انسان مصروف رہے، اسی کا ہر دم دھیان رکھے، اسی کی محبت میں اپنے آپ کو دیوانہ بنائے، جئے تو اسی کی خاطر، اور مرے تو اسی کا کلمہ پڑھتا مرے۔

پس اگر اس خدا کو محبوب حقیقی خیال کرتے ہو تو اس سے مواصلت، اور اتحاد و یگانگی کی فکر میں ہر ایک ماسوائے اللہ سے بیزار ہو کر آب و طعام اور لذت جماع کو ترک کر دینا، اسکی تجلی گاہ کی جانب پا برہنہ، سر برہنہ، لبیک لبیک کہنا، والہانہ و مجنونانہ دوڑنا، اور وہاں پہنچ کر کبھی شوق و وجد میں اس تجلی گاہ کے گرد گھومنا، کبھی جنگلوں میں بھٹکتے پھرنا، کبھی دشمن محبوب کے خاص مکان پر سنگ باری کرنا، کبھی جان و مال سے فدا ہونے کو تیار رہنا، اور کلمہ حق کی عظمت اور خدائے واحد کی محبت و پرستش کے لئے جمع ہونا ہی طواف ہی، گویا اللہ کے خوف، اور اس کی تلاش و جستجو نے ان لوگوں کے اندر ایک آتشکدہ محبت مشتعل کر دیا ہی، اور اس کا دہواں والہانہ صداؤں اور بے قرارانہ فریادوں کی صورت میں ان کی زبانوں سے اٹھ رہا ہے:۔

جمال کعبہ مگر عذر رہرواں خواہد | کہ جان خستہ دلاں سوخت در بیاباں ش!

دعائے رزق

(۱۲۶) وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝	اور جب ابراہیمؑ نے دعا مانگی کہ اے میرے پروردگار! اس شہر کو امن کا شہر بنا، اور اسکے رہنے والوں میں سے ان لوگوں کو روزی دے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائیں، اللہ نے فرمایا، اور جو منکر ہوگا اسکو بھی چند روز کے لیے فائدہ اٹھانے دونگا پھر مجبور کرکے دوزخ کے عذاب میں داخل کروں گا، اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔

چونکہ یہ وادی غیر ذی زرع تھی اس لئے ابراہیم علیہ السلام نے دو باتوں کے لئے دعا کی:۔

(۱) اس کو امن والا گھر بنا، اور یہ جنگل ہے اس کو آباد کرکے شہر بنا۔

(۲) یہاں کے رہنے والوں کو رزق نوازش کر، چنانچہ جو لوگ مکہ مبارکہ جاتے ہیں، وہ دیکھتے ہیں کہ اس کی سرزمین پیداوار سے خالی ہے، اور وہاں زراعت نہیں ہوتی، مگر باوجود اس کے بازاروں میں سبز و تر میوے، اور ترکاریاں نہایت ہی ارزاں قیمت پر مل جاتی ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا مقصد یہ تھا کہ اس جگہ صرف ایمان والے آباد ہوں، اور انہیں کو رزق ملے، مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ کفار کو بھی اس سامان سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ دیا جائیگا، آخر ایک وقت ایسا آئیگا کہ ان کا بالکل خاتمہ ہوجائیگا، اور ایک کافر بھی دکھائی نہ دیگا، چنانچہ ایسا ہی ہوا، قرآن حکیم نے کھلے الفاظ میں اعلان کردیا: انما المشرکون نجس فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامہم ھذا مسجد حرام کے حدود صرف توحید کی پاکی کے لئے مخصوص ہیں، اب آئندہ کوئی غیر مسلم اس کے قریب بھی نہ آنے پائے، یعنی نہ صرف یہ کہ وہاں غیر مسلم نہ رہیں، بلکہ کسی حال میں داخل بھی نہ ہوں۔ مرض الموت میں شارع علیہ السلام نے تین باتوں کی وصیت فرمائی تھی، ان میں سے

ایک یہ تھی: اخرجوا المشرکین من جزیرۃ العرب، حضرت عمر کی روایت میں ہے: لاخرجن الیھود والنصاری من جزیرۃ العرب حتی لا ادع الا مسلما امام احمد کی روایت میں ہے: اخر ما تکلم بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اخرجوا یھود اھل الحجاز واھل نجران من جزیرۃ العرب، ابن شہاب زہری نے ان الفاظ میں روایت کیا: لایجتمع دینان فی جزیرۃ العرب۔

چونکہ مسلمانوں کا مذہب عالمگیر تھا، اس لئے اس کی ارضی وسعت و انتشار کے لئے عبادتکدۂ ابراہیمی کا کعبۃ اللہ، اس کی سرزمین حجاز، اور اس کا ملک جزیرۂ عرب، دائمی مرکز قرار پایا، پس ضروری ہوا کہ اس تمام سرزمین کو غیروں کے عنصر سے پاک وصاف کر دیا جائے، اور صرف خدائے واحد کے ماننے والے اس جگہ کو آباد کر سکیں۔

دعائے خلیل

(۱۲۷) وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ۭ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۱۲۸) رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ	اور جب ابراہیم اور اسمٰعیل خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے، اور دعا مانگ رہے تھے کہ اے ہمارے پروردگار ہماری یہ خدمت قبول کر بے شک تو ہی سننے والا جاننے والا ہے۔ اور اے ہمارے پروردگار ہم کو اپنا فرمانبردار بندہ بنا اور ہماری نسل میں ایک امت پیدا کر، جو تیری حکم بردار ہو، اور ہم کو ہماری عبادت کے طریقے بتا، اور ہمیں معاف کر، بیشک تو ہی بڑا معاف کرنے والا مہربان ہے۔

کعبہ کی پہلی تعمیر حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل نے کی، پھر بنو جرہم، بنو عمالقہ، قصی، اور قریش نے اس کی تجدید کی، تجدید عمارت کی ضرورت، مرور زمانہ کے اثر یا سیلاب کے صدموں کی بنا پر ہوتی تھی، پانچ ھزار سال تک کسی غیر قوم نے قبضہ کر کے اس کو نہیں گرایا، اور یہ ایسا شرف ہے جو دنیا کے کسی عبادت خانہ کو حاصل نہیں ہوا، جس وقت یہ پیغمبران

خلیل خانہ کعبہ کی اساس وبنیاد کو بلند کر رہے تھے تو ان کی زبان پر یہ دعائیہ کلمات جاری تھے، خداوندا! جس مقصد کے لئے ہم اس گھر کی تعمیر کر رہے ہیں اس کو ضرور پورا کیجیو، تو ہماری دعاؤں کو سنتا، اور نیتوں کو جانتا ہے، شہرت وناموری کی آرزو نہیں، بلکہ منشا یہ ہے کہ اس کو توحید کا مرکز بنا دیا جائے۔

ہماری اولاد میں ایک ایسی جماعت ہمیشہ رہے جو تیرے احکام کی پیروی اور اتباع کو اپنی زندگی کا مقصد اصلی بنائے اور چونکہ وہ الگ تھلگ ہوگی، اگر اس کے پاس کوئی قانون نہ ہوا تو راہ حق سے بھٹک جائیگی، اس لئے تو اس کو دائمی اور ابدی قانون نوازش کر، اور اگر قانون ملنے کے باوجود اس سے کوئی غلطی سرزد ہو تو ان کے ساتھ لطف ونوازش سے پیش آ۔

یہ دعائیہ کلمات صاف بتا رہے ہیں کہ جس امت مسلمہ کی تخلیق کے لئے درخواست کی جارہی ہے، ضروری ہے کہ وہ ان کی اولاد میں سے ہو، اسحٰق علیہ السلام اور ان کی اولاد سے اس دعا کو کوئی تعلق نہیں۔

(۱۲۹) رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ	اور اے ہمارے پروردگار! ان ہی میں سے ان میں ایک رسول بھیج کہ تیری آیتیں انہیں پڑھکر سنائے، اور ان کو کتاب اور عقل کی باتوں کی تعلیم دے، اور ان کی اصلاح کرے، بیشک تو ہی زبردست حکمت والا ہے۔

ان میں ایک رسول بھیج جو حسب ذیل فرائض انجام دے:

(الف) تلاوت آیات، تیری آیات کو پڑھکر سنائے تاکہ لوگ ان کا مفہوم ومطلب سمجھ لیں، اور جو لوگ عربی نہ جانتے ہوں وہ ترجمہ کے ذریعہ واقفیت بہم پہونچائیں۔

(ب) تعلیم کتاب، تلاوت کے بعد جس قدر شکوک اور شبہات پیدا ہوں ان کو دور کرنا کیونکہ جب تک اعتراضات کو دور نہ کیا جائیگا قانون کی جانب توجہ نہ ہوگی۔

(ج) تعلیم حکمۃ، بعض لوگوں نے حکمت سے نبی کی منہاج عمل اور سنت مراد لی ہے، اور اس کی تائید میں مقدام کی روایت پیش کرتے ہیں کہ آپ نے تین مرتبہ زور دیکر فرمایا: الاوانی اوتیت الکتاب ومثلہ، یعنی کتاب اللہ اور مثل اس کے سنت واسوۂ حسنہ رسول اللہ۔ اس میں شک نہیں کہ یہ معنی فی نفسہ ٹھیک ہیں، مگر قرآن حکیم کی تصریحات اس سے بلند نظری کی طالب ہیں، یوسف علیہ السلام کی نسبت فرمایا: ولما بلغ اشدہ اتینہ حکما وعلما (۱۲: ۲۲) عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت کہا: ویعلمہ الکتب والحکمۃ: (۳: ۴۳) لوط علیہ السلام کے متعلق کہا: ولوطا اتینہ حکما وعلما (۲۱: ۷۴) قرآن کی نسبت کہا: یس والقرآن الحکیم، سورۂ بقرہ میں حکمت کو خیر کثیر سے تعبیر کیا: ومن یوتی الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا، تو یہ اور اسی قسم کی صدہا آیات بتاتی ہیں کہ حکمت سے مراد علم اور دانائی کی باتیں ہیں جن تک صرف ارباب فہم و فراست ہی کی دسترس ہوسکتی ہے، گویا قرآن کی تعلیم کو ایسے اصول کلیہ پر حل کرنا کہ دنیا کے تمام مذاہب ان سے انکار نہ کرسکیں، اور اس کی عالمگیر دعوت کے آگے اپنی گردنیں خم کردیں۔ ابن وہب کہتے ہیں: قلت لمالک ما الحکمۃ قال المعرفتہ بالدین والفقہ فیہ والاتباع لہ۔ میں نے امام مالک سے دریافت کیا کہ حکمت کسے کہتے ہیں، انھوں نے جواب دیا کہ دین کی معرفت، اس میں درس و فہم، اور اس کے اتباع کا نام حکمت ہے، بعض کے نزدیک مصالح شرعیہ اور احکام دین کا معلوم کرنا حکمت ہے، حق و باطل میں تمیز کرنا اور حقائق اشیا کی معرفت بھی اسی قبیل سے ہیں۔

(د) تزکیۂ نفس، انسان کی سعادت و نیک بختی کے لئے تعلیم محض بالکل بیکار رہی جبتک اس کے زندہ نمونے بھی انسانوں کے سامنے دکھائی نہ دیں، انسانی طبیعت منفعل اور اثر پذیر واقع ہوئی ہے، محض تعلیم کی سماعت وہ اثر نہیں پیدا کرسکتی جو انسانی

نمونہ عمل کا پڑتا ہے، پس نبی اس نمونہ کو پیش کرتا ہے، اور اپنی صحبت و ہم نشینی سے لوگوں کو پاک اور مزکی بناتا ہے۔

تو عزیز ہے اس دعا کو شرف اجابت بخش، اور رسول پیدا کر، یہ ضرور نہیں کہ اسی وقت وہ رسول آجائے، نہیں بلکہ جب تیری حکمت اور مصلحت تقاضا کرے لیکن ایک دفعہ ضرور ہو کر رہے آپ نے فرمایا ہے: انا دعوۃ ابی ابراھیم۔

انجام کار یہ دعائیں قبول ہو کر رہیں، اس رسول نے آیات کی تلاوت بھی کی، اور نہ صرف عرب کے لوگوں کو پاک بنایا، بلکہ وہ خود دوسروں کے پاک ہونے کا ذریعہ بنے، جن کو آپ نے تعلیم دی، وہی دنیا کے رہبر اور معلم بن گئے، اور قیصر و کسریٰ کے خزانوں کی کنجیاں ان کے ہاتھ میں آگئیں:۔

یہ اسی کا تھا کرشمہ کہ عرب کے بچے
کھیلنے جاتے تھے ایوان گہہ کسریٰ میں شکار!

(۱۳۰) وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ۭ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝	اور کون ہے جو ابراہیم کے دین سے اعراض کرے مگر وہی جو احمق ہو، اور ہم نے اس کو دنیا میں بھی منتخب کیا، اور آخرت میں بھی وہ نیکوں کے زمرے میں ہوگا۔

یہودی، عیسائی، اور مشرکین عرب، سب کے سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا امام و پیشوا تسلیم کرتے ہیں، اب ان کی تعلیم سے وہی شخص منحرف ہوگا جسے دنیا اور آخرت کی عزت مطلوب نہیں، کیونکہ ابراہیم کو ہم نے نہ صرف دنیا میں معزز و محترم کیا بلکہ آخرت میں بھی وہ نیکو کاروں کے گروہ میں ہونگے، پس دنیا اور آخرت کی کامیابی صرف ان کے نقش قدم پر چلنے سے مل سکتی ہے۔ دوسرے مذاہب میں ترک دنیا اور رہبانیت کی تعلیم ملے گی مگر ابراہیم کا طریق ایسا ہو کہ وہ دین اور دنیا، سیاست اور مذہب سب کو حاوی

اور جامع ہے اور یہی مذہب ہر قسم کی ترقی کا ذمہ دار و کفیل ہے۔

تحویلِ قبلہ سے پہلے اہلِ کتاب خاموش تھے، مگر اس کے بدلتے ہی شدید مخالفت شروع کردی، قرآن نے ان وعدوں کی طرف توجہ دلائی جو ابراہیم کے ساتھ کیے گئے تھے، پھر اُن کی دعاؤں کا تذکرہ کیا، اور بیک وقت ان تینوں فرقوں پر حجت قائم کردی، اگر اب بھی یہ لوگ آپ کی رسالت تسلیم نہ کریں تو ان سے بڑھکر اور کون احمق ہوگا۔

(۱۳۱) إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ○ (۱۳۲) وَوَصَّىٰ بِهَا إِبْرَاهِيمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ يَا بَنِيَّ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ لَكُمُ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ○

جب ان سے ان کے پروردگار نے کہا کہ ہماری ہی فرمانبرداری کرو، تو اس نے عرض کیا کہ میں سارے جہان کے پروردگار کا حکم بردار ہوا، اور ابراہیم اپنے بیٹوں کو یہی وصیت کر گئے، اور یعقوب بھی کہ بیٹا اللہ نے تمہارے لئے اسی دین کو پسند کیا ہے، پس تم مسلمان ہی مرنا۔

وہ قانون جس کی بنا پر ابراہیم علیہ السلام کو دنیا و آخرۃ میں سرفراز کیا گیا یہی ہے کہ: ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین لاشریک لہ وبذلک امرت وانا اول المسلمین (۶: ۱۶۳) اسی کی وصیت اُنہوں نے اپنی اولاد سے کی کہ اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں مسلم قانت بن جاؤ، اور یہی چیز ہے جسکی جانب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعوت دے رہے ہیں: قل ھذہ سبیلی ادعوا الی اللہ قف علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی ط وسبحن اللہ وما انا من المشرکین (۱۲: ۱۰۸)

ایک اور حجت

(۱۳۳) أَمْ كُنتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِن بَعْدِي

کیا تم اس وقت موجود تھے، جس وقت یعقوب کو موت آئی، اس وقت اُنہوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ میرے بعد کس کی عبادت کروگے، اُنہوں نے جواب دیا

قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ

کہ ہم تیرے معبود، اور تیرے بڑوں یعنی ابراہیم، اور اسمٰعیل اور اسحٰق کے معبود، خداے واحد کی غلامی کرینگے، اور ہم اسی کے تابع فرمان ہیں،

(۱۳۴) تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

وہ ایک جماعت تھی جو اپنے زمانہ میں ہو گذری، ان کا کیا ان کو، اور تمہارا کیا تم کو، اور جو کچھ وہ کر گزرے ہیں تم سے اس کے متعلق کوئی بازپرس نہ ہوگی۔

اسلام کی تعلیم تو وہی ہے جو اوپر ذکر کی گئی مگر یہودی کہتے ہیں کہ یعقوب علیہ السلام نے اپنی وفات کے قریب وصیت فرمائی تھی کہ یہودیت کے پابند رہنا، یہی وصیت سینہ بسینہ ہم تک پہنچی ہے، اس کا جواب ان آیات میں دیا گیا کہ ان کی وصیت تو یہی تھی کہ خداے واحد کی غلامی کرنا، اور انکی اولاد نے بھی یہی اقرار کیا تھا، اگر تم سچے ہو تو بتاؤ، ان کی وفات کے وقت کون شخص موجود تھا جس پر تمہاری روایت کی انتہا ہوتی ہے، اور تھوڑی دیر کے لیے مان لو کہ انہوں نے ایسا کہا تو تمہیں کیا؟ ہر شخص اپنے اعمال کا آپ ذمہ دار ہے، اپنے لئے تم خود راہ نجات تلاش کرو، اور دیکھو کہ یہ تعلیم صحیح ہے یا نہیں۔

(۱۳۵) وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝

اور کہتے ہیں کہ یہودی یا نصرانی ہوجاؤ تو سیدھے راستے پر آجاؤ، ان لوگوں سے کہدو، یہ نہیں بلکہ ہم ابراہیم کے طریق پر ہیں جو ایک طرف تھے، اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔

اپنے دعوے کے ثبوت میں نہ تو ان کے پاس نقل صحیح ہے، اور نہ مشاہدہ پیش کرسکتے ہیں، مگر پھر بھی کہتے ہیں کہ ہدایت و رہنمائی صرف یہودی یا نصرانی ہونے سے مل سکتی ہے، اس کا جواب یہ دیا گیا کہ ان میں سے کوئی راستہ بھی نیکی کی طرف نہیں لیجاتا، دونوں گروہ افراط و تفریط میں مبتلا ہیں، ایک نے مسیح کا انکار کیا اور تفریط میں مبتلا ہوئے

دوسرے نے اس کے ماننے میں حد درجہ کا غلو کیا، اور افراط کے مرتکب ہوئے، پس ہدایت نہ تو افراط میں ہے اور نہ تفریط میں، بلکہ اعتدال و توسط میں ہے۔

(۱۳۶) قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○ (۱۳۷) فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

تم لوگ ان یہود و نصاریٰ سے کہدو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں، اور جو اترا ہم پر، اور جو اترا ابراہیم اور اسمٰعیل، اور اسحٰق، اور یعقوب، اور اولاد یعقوب پر، اور جو کچھ دیا گیا موسیٰ اور عیسیٰ کو، اور جو دوسرے پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے ملا اس پر، ہم ان میں سے ایک میں بھی فرق نہیں کرتے اور ہم اسی ایک خدا کے فرماں بردار ہیں، جن چیزوں پر تم ایمان لائے ہو اگر یہ لوگ بھی تمہاری طرح ان ہی چیزوں پر ایمان لے آئیں، تو راہ راست پر آگئے، اور اگر انحراف کریں تو وہ ضد پر ہیں، ان کے شر سے اللہ تمہارے لئے کافی ہوگا، اور وہ سننے والا جاننے والا ہے۔

وہ لوگ تو ہر بات میں کوئی نہ کوئی حجت قائم کرتے ہیں اور کہتے ہیں: نؤمن ببعض و نکفر ببعض، کبھی کہتے ہیں: نؤمن بما انزل الینا و یکفرون بما وراءہ مگر ایک مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ ہر نبی پر ایمان لاتا ہے، صداقت کی آواز دنیا کے کسی گوشہ سے بلند ہو، اس کو لبیک کہنے والا مسلمان ہی ہوتا ہے، اس کا مذہب عالمگیر، اور ہر سچائی اس کے دامن میں جگہ پکڑنے والی، اسی حقیقت کی طرف حدیث نے اشارہ کیا: کلمة الحکمة ضالة المؤمن حیث وجدها فهو احق بها، حکمت و دانائی کی بات مسلمان کی گم شدہ متاع ہے، جہاں دیکھے اس پر قبضہ کرلے کہ وہی اس کا

وارث ہے۔ اگر اب بھی وہ اس تعلیم صحیح کے آگے گردنیں خم نہ کریں تو معلوم ہو گیا کہ ان کا اصلی مقصد اسلام کی عداوت اور مخالفت کے سوا کچھ نہیں، وہ مسلمانوں میں اختلاف پیدا کرنے کے آرزومند اور ان کی قومیت متحدہ کے فنا کرنے کی فکر میں ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کے شر و فساد سے تمہیں محفوظ رکھیگا، اور ان کی دشمنی کچھ بھی نہ بگاڑ سکے گی[1]۔

صبغۃ اللہ

(۱۳۸) صِبْغَةَ اللّٰهِ ج وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ز وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ○

(۱۳۹) قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِى اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ج وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ج وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ○

ہم نے اللہ کا رنگ قبول کیا، اور اللہ کے رنگ سے کس کا رنگ بہتر ہے، اور ہم اسی کی عبادت کرتے ہیں، ان سے کہدو کہ کیا تم لوگ اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو، حالانکہ وہی تمہارا بھی اور ہمارا بھی پروردگار ہے، اور ہم کو ہمارے اور تمکو تمہارے عمل، اور ہم خالص اسی کو مانتے ہیں۔

اسلام نے اپنا عقیدہ پیش کرتے وقت کمال درجہ کی بے تعصبی اور فراخدلی کا اظہار کیا، مگر یہودی اب بھی یہی کہتے ہیں کہ مذہبی رنگ پیدا ہی نہیں ہو سکتا جب تک ایک شخص یہودی یا نصرانی نہ بن جائے، رنگ دینے اور دین اختیار کرنے کی دو ہی صورتیں ہیں:۔

(الف) اللہ تعالیٰ کی تعلیم کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنائے اور تمام انبیاء علیہم السلام

---

[1] یہ پیشین گوئی تھی چنانچہ دنیا کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ چند سال کے اندر نصاریٰ کی حکومت، مجوس کی سلطنت، اور ارباب کفر و شیطنت کے بلاد و امصار کس طرح ایک ایک کرکے مسلمانوں کے قبضہ میں آگئے، اگر آج بھی مسلمان حقیقی معنی میں اس آیت پر ایمان لے آئیں تو پھر یہی وعدہ ان کے ساتھ بھی پورا ہو سکتا ہے وکان وعداً مفعولا۔

کی صداقتوں کا اقرار کرے، یہی اللہ کا رنگ اور دین ہے، اور صرف اسی تعلیم پر کار بند ہو کر ہم میں یہ جذبہ صادقہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی انسان کے آگے ہماری گردن نہ جھکے، اور تمام انسانوں سے باغی ہو کر ایک اللہ کی حکومت کو مان لیں بخاری میں ابن عباس سے روایت ہے کہ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: ای الدین احب الی اللہ، آپ نے فرمایا: الحنیفیۃ السمحۃ، حاکم اور ابن عساکر نے سعد بن عبد اللہ بن مالک خزاعی سے آپ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ احب الدین الی اللہ الحنیفیۃ السمحۃ۔

(ب) دوسرا رنگ انسانوں کا خود تجویز کردہ ہے، جس کو قبول کرنے کے بعد انسان توحید سے نکل جاتا ہے، اور انبیاء علیہم السلام کی مخالفت شروع کر دیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جس تعلیم سے فطری جذبات کی تربیت ہوتی ہو، وہی بہترین مذہب ہے، اور ہم اسی خدائے واحد کے پرستار ہیں، یہ کس قدر جہالت کا سوال ہے کہ اللہ کا رنگ کس قسم کا ہوگا؟ تعلیم یافتہ کے لئے مناسب نہیں کہ وہ اس قسم کی باتیں کرے، ایسے لوگوں سے تو جس قدر بھی جلد انقطاع تعلقات کیا جائے اتنا ہی بہتر ہے۔

(۱۴۰) أَمْ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرٰهِمَ وَإِسْمٰعِيلَ وَإِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ كَانُوا هُودًا أَوْ نَصٰرٰى ط قُلْ ءَأَنْتُمْ أَعْلَمُ أَمِ اللّٰهُ ط وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللّٰهِ ط وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ○	یا تم کہتے ہو کہ ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ اور اولاد یعقوب، یہ سب یہودی یا نصرانی تھے، ان سے کہو کیا تم بڑے جاننے والے ہو یا اللہ، اور اس سے بڑھکر اور کون ظالم ہے جس کے پاس اللہ کی گواہی تھی، اور اس نے اس کو چھپا لیا، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں،
(۱۴۱) تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ج لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ج وَلَا تُسْـَٔلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ○	وہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی، اس کا کیا اس کو، اور تمہارا کیا تم کو، اور تم سے انکے کاموں کی پوچھ نہ ہوگی۔

ذرا انصاف سے بتاؤ تو سہی کہ ان لوگوں میں سے کون یہودی تھا، توراۃ کے ابتدائی اوراق کو دیکھو وہاں یہودیت کی تاریخ موجود ہوگی، دوسری جگہ فرمایا:

یاھل الکتاب لم تحاجون فی ابراھیم وما انزلت التوراۃ والانجیل الا من بعدہ افلا تعقلون، (۳: ۶۵) اے اہل کتاب! ابراہیم کے بارہ میں کیوں جھگڑتے ہو، حالانکہ توراۃ وانجیل کا نزول ان کے بعد ہوا، کچھ تو عقل سے کام لو۔ ایک جگہ کہا: ما کان ابراھیم یھودیا ولا نصرانیا ولکن کان حنیفا مسلما ط وما کان من المشرکین: (۳: ۶۷)

شہدا علی الناس

(۱۴۲) سَیَقُوْلُ السُّفَھَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰھُمْ عَنْ قِبْلَتِھِمُ الَّتِیْ کَانُوْا عَلَیْھَا ط قُلْ لِّلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ط یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ○

بیوقوف اب یہی کہیں گے کہ جس قبلہ پر مسلمان پہلے تھے اس سے کیوں پھر گئے کہدو کہ مشرق و مغرب اللہ ہی کے لئے ہے جسکو چاہتا ہے سیدھا رستہ دکھاتا ہے۔

توراۃ کی شہادت پیش کی گئی، کتاب پیدائش کے واقعات بیان کئے گئے اور سب کو معلوم ہوگیا کہ ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کو یہودیت اور نصرانیت سے کوئی تعلق نہیں، انھوں نے بیت اللہ کی تعمیر کی کہ قبلہ عالم بن جائے؛ ظاہر ہے کہ جو شخص ملت ابراہیمی کا پابند ہوگا، اس کا قبلہ، بیت اللہ ہی ہونا چاہیے، لیکن باوجود ان حقائق ثابتہ کے، احمق یہی کہتے ہیں کہ یہ لوگ بیت المقدس کو چھوڑ کر بیت اللہ کی جانب کیوں پھر گئے؛ یہ اعتراض ان کی سفاہت و کم عقلی کا نتیجہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کی توجہ تو مغرب و مشرق کی طرف یکساں ہے، مگر جس قدر مرکز اعلیٰ ترین ہوگا، اس کے نتائج بھی نہایت ہی شاندار ہونگے، اس لئے امت مسلمہ کو بہترین مرکز نوازنا

کیا گیا کہ وہی اس عزت و کرامت کی مستحق تھی، اور ایک عالمگیر مذہب کے لیے یہی موزوں و مناسب تھا کہ توحید کا پہلا گھر آخری نبی کا قبلہ ہو۔

(۱۴۳) وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۝	اسی طرح ہم نے تم کو معتدل امت بنایا تاکہ اور لوگوں کے مقابلہ میں گواہ بنو، اور تمہارے مقابلہ میں رسول تم پر گواہ ہو۔

جس طرح تمہیں بہترین مرکز نوازش کیا گیا ہے، ایسے ہی ہم نے تم کو اُمت عادلہ پیدا کیا ہے، جس میں یکسر خیر و برکت ہی ہے، تاکہ تم تمام دنیا کے لئے راہ اعتدال و توسط میں نمونہ ہو، ہر قوم و ملت تمہاری نگرانی میں رہ کر صراط مستقیم حاصل کرے کہ طریق استقامت صرف تمہارے ہی پاس ہے اور تمہارے لئے رسول اللہ کی ذات اقدس نمونہ ہو وسط کے معنی عدول اور خیار کے آتے ہیں، چنانچہ زھیر کہتا ہے۔

هم وسط یرضی الانام بحکمهم   اذا نزلت احدی اللیالی بمعظم

بعض کے نزدیک اس کے معنی درمیان کے ہیں، یعنی غلو و تقصیر کے درمیان، اسلام کی تعلیم ہے، نصاری نے حضرت عیسیٰ کے بارہ میں غلو کیا، اور یہودیوں نے تحریف و تبدیل سے کام لیا، لیکن قرآن حکیم اس افراط و تفریط سے پاک راہ اعتدال اختیار کئے ہوئے ہے۔

پھر یہ نگرانی اسی جگہہ دنیا ہی میں ختم نہ ہوگی بلکہ قیامت کے روز بھی تمہیں بطور شہید اور گواہ کے کام دینا پڑیگا، حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے روز جب تمام قومیں میدان محشر میں موجود ہونگی، اللہ تعالی انبیاء کرام سے سوال کریگا کہ کیا تم نے تبلیغ حق و صداقت کا فرض ادا کر دیا، سب اثبات میں جواب دینگے مگر ان کی اُمتیں انکار کرینگی، اس پر اُمت مسلمہ شہادت دیگی کہ بیشک ان پیغمبران جلیل نے اپنا فرض ادا کیا[۱]۔

---

[۱] اس آیت میں دو چیزوں کو بیان کیا :۔

(الف) مسلمان دنیا کے امام و پیشوا ہیں، اور ان کی زندگی دوسروں کے لئے نمونہ ہوگی، ہر نیکی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳۸)

بیت المقدس عارضی قبلہ کیوں بنا؟

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا | اور جس قبلہ پر تم پہلے تھے اس کو قبلہ ہم نے اسلئے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳۷) کو قائم کرنیوالی اور ہر برائی کے دور کرنے والے یہی ہونگے، کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنہون عن المنکر (۳ : ۱۰۶)

(ب) قیامت کے روز ان لوگوں کو بطور گواہ کے پیش کیا جائے گا اس دعوے کے ثبوت میں کہ ہر نبی نے اپنا فرض ادا کیا۔

ان دو چیزوں کو پیش نظر رکھکر ہر مسلم کا مقصد حیات خود بخود معلوم ہو جاتا ہے، اور وہ یہی ہے کہ قرآن حکیم کو اپنے ہاتھ میں لے لے، اور اس کی نشر و اشاعت میں سرگرم کوشش کرے، دنیا کا ایک ایک کونہ چھان مارے، اور کوئی اُمت ایسی نہ رہ جائے جس میں اس نے اسلام کی تبلیغ نہ کی ہو، اگر ایسا نہ کرے تو قیامت کے روز شہادت دینے کے قابل نہ ہوگا، اور ویکون الرسول علیکم شہیدا سے محروم ہو جائے گا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت اسی صورت میں میسر ہو سکتی ہے جبکہ وہ اس فرض کو ادا کرے، لیکن مسلمانوں کی موجودہ حالت زبان حال سے پکار پکار کے کہہ رہی ہے کہ عوام تو ایک طرف تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی اس طرف توجہ نہیں، آہ! وہ کتاب جو دنیا کی ہدایت وراہ نمائی اور عالمگیر امن و سلامتی کے لئے آئی تھی، اس کی طرف سے بے اعتنائی اختیار کی جا رہی ہے۔

اے فرزندان اسلام! وائے عزیزان ملت! ایسا نہ ہو کہ آج تم اس فرض اہم واقدم سے اجتناب کرو، اور کل جبکہ تمام اقوام عالم ایک میدان میں جمع ہونگی، سب کے سامنے تمہیں ذلیل ورسوا ہونا پڑے، اور خود رسول بھی تمہاری نسبت یہ شکایت کرے: یرب ان قومی اتخذوا هذا القران مهجورا (۲۵ : ۳۲) پس ابھی وقت ہی خواب غفلت سے بیدار ہو، اور کتاب عزیز کو ہاتھ میں لیکر اپنے فرض کو ادا کرو نہیں معلوم کل کیا ہونے والا ہے، اور یوم تبیض وجوه و تسود وجوه کو کس کا چہرہ سفید ہوگا، اور کس کا سیاہ۔ وشر الند امة یوم القیامة۔

الا لنعلم من یتبع الرسول ممن ینقلب علیٰ عقبیه و ان کانت لکبیرۃ الا علی الذین ھدی اللہ ،	بنایا تھا تاکہ معلوم کرلیں کہ رسول کی پیروی کون کرتا ہے، اور کون الٹے پاؤں پھر جائے گا، اور قبلہ کا بدلا جانا سب کے لئے تکلیف دہ تھا مگر ان لوگوں کے لئے آسان ہوگیا جن کو اللہ نے ہدایت دی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ جس مسئلہ کے متعلق کوئی حکم موجود نہ ہوتا اس میں اہل کتاب کے اتباع کو ترجیح دیا کرتے تھے، نماز تو آغاز نبوت ہی میں فرض ہوچکی تھی، مگر قبلہ کے متعلق کوئی صاف حکم موجود نہ تھا، اس لئے آپ مکہ مبارکہ میں بیت المقدس کی جانب نماز پڑھتے رہے، بیت اللہ کی جانب بھی پشت نہ ہوتی تھی، اس لئے اگر بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ اقامت مکہ کے دوران میں آپ نے بیت اللہ کی جانب نماز ادا کی ہے تو ایک لحاظ سے بالکل ٹھیک ہے۔

جب آپ مدینہ منورہ تشریف لائے تو بیت المقدس ہی قبلہ رہا مگر ہجرت کے دوسرے سال، ۱۷ ماہ کے بعد اللہ تعالےٰ نے قبلہ بدل دیا، اور اوّل بیت وضع للناس کو مسلمانوں کا قبلہ گاہ بنا دیا جسے مکعب شکل ہونے کی وجہ سے کعبہ، صرف عبادت الٰہی کے لئے بنائے جانے کے سبب بیت اللہ، اور عظمت و حرمت کی بنا پر مسجد الحرام کہا جاتا تھا۔

بیت المقدس کو عارضی قبلہ بنانے کے اسباب حسب ذیل تھے :۔

(الف) جب تک آپ مکہ مبارکہ میں رہے، بیت المقدس، قبلہ رہا، کیونکہ مشرکین مکہ، بیت المقدس کے احترام کے قائل نہ تھے، اور کعبہ کو تو انہوں نے خود ہی اپنا بڑا معبد بنا رکھا تھا، اسلئے شرک چھوڑ دینے، اور اسلام قبول کرنے کی بیّن علامت مکہ میں یہ رہی کہ مسلمان ہونے والا بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھے۔

(ب) مدینہ میں زیادہ تر یہودی اور عیسائی آباد تھے، اُن کے نزدیک بیت اللہ کی کوئی عزّت نہ تھی، وہ صرف بیت المقدس ہی کو انوار و تجلیات الٰہیہ کا مہبط یقین کرتے

تھے، اس لئے مدینہ میں اسلام قبول کرنے کی نشانی یہ قرار پائی کہ بیت اللہ کی جانب نماز پڑھیں۔

(ج) دنیا معلوم کرلے کہ عرب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اس لئے نہیں کیا کہ آپ ان کے آبائی قبلہ کو اپنا سجدہ گاہ بنا رہے ہیں، بلکہ وہ آپ کی دعوت کو حق وصدق پر مبنی خیال کرتے ہیں، اور اس لئے جس طرف آپ کا ارشاد ہوتا ہے فوراً اپنے آپ کو پھیر لیتے ہیں، اگرچہ ایک قوم کے لئے یہ بہت مشکل ہے کہ وہ کسی کی خاطر اپنے آبائی قبلہ کو ترک کردے، مگر چونکہ حق ان پر واضح ہو چکا تھا اس لئے وہ ہر ایک بات کے لئے تیار ہو گئے۔

(د) جس قدر منافقین ہیں، اور اپنے ایمان کو چھپائے پھرتے ہیں، الگ ہو جائیں تاکہ آئندہ صرف راسخ الایمان ہی میدان عمل میں نکلیں۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ إِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ۔	اور اللہ ایسا نہیں کہ تم مسلمانوں کے ایمان کو ضائع ہونے دے، خدا تو لوگوں پر شفقت رکھنے والا مہربان ہے۔

اللہ تعالیٰ کو تمام جہات سے یکساں تعلق اور نسبت ہے، اس کی تجلیات زمین و آسمان کے ذرہ ذرہ میں جاری و ساری ہیں، اور عالم تکوین کے اطراف و جوانب اس کے نزدیک ایک ہی درجہ رکھتے ہیں: وللہ المشرق والمغرب فاینما تولوا فثم وجہ اللہ اور اللہ نور السمٰوٰت والارض کا یہی مطلب ہے، لیکن جب کسی جگہ میں اللہ کا کوئی برگزیدہ بندہ ایک مدت تک اس کی یاد میں مصروف رہتا ہے، اس کے پاک نام پر قربانی کرتا ہے، اور اس کے شوق وصال میں ریاضتیں اور مجاہدے کرتا ہے تو اس جگہ دوسرے مقامات کی نسبت انوار الٰہیہ زیادہ نازل ہونا شروع ہو جاتے ہیں، اور اگر مدت ہائے دراز تک وہاں ہمیشہ کوئی نہ کوئی بزرگ موجود رہے، اور برابر خدا کو یاد کرتا رہے تو پھر اس مقام کو ایک قسم کی خصوصیت حاصل ہو جاتی ہے کہ دوسرے مقامات اس سے محروم

رہتے ہیں، گرد و پیش کے لوگ خود بخود اس جگہہ کی طرف کشاں کشاں چلے آتے ہیں، اسکی عزت و توقیر ان کے دلوں میں بیٹھ جاتی ہے، اور باقی مقامات کے مقابلہ میں اس کے احترام کو لازمۂ قومیت خیال کرنے لگ جاتے ہیں۔

جب لوگ اس کے لئے یکسر طلب بن جائیں تو ملاء اعلیٰ کی دعائیں اُن کی امداد و اعانت میں مصروف ہو جاتی ہیں، اور اس جگہہ کو ان کا قبلہ بنا دیا جاتا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لیکر ہر نبی نے اس گھر کا طواف کیا، او ر برابر حج کرتے رہے، اہل عرب نے اس کی عظمت شروع کر دی، زمانہ جاہلیت میں باوجود وحشت و بربریت کے اس کی عزت کرتے، یہ تمام باتیں اس امر کی داعی ہوئیں کہ اسے قبلہ بنا دیا جائے اور ربنا تقبل منا انك انت السمیع العلیم کو شرف اجابت نصیب ہو۔

قبلہ بننے کے لئے ہزارہا سال کی سعی و کوشش کی ضرورت ہے، یہ ابراہیمی تعلیم کا اثر تھا کہ عرب اباً عن جدٍ بیت اللہ کو اپنا قبلہ مانتے رہے، اور اس کے مجاورین کو اشرف ترین عرب شمار کرتے رہے، اس لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ ہزارہا سال کی محنت و جانکاہی، اور ابراہیم و اسمٰعیل کی دعاؤں کو ضایع کر دیتا، جدید قبلہ بنانے کے لئے اتنی ہی کوشش دوبارہ کرنی پڑتی، اور اس لئے مزید وقتوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا، کوئی عقلمند یہ تجویز نہیں کر سکتا کہ اس پُرانی کوشش کو برباد کر کے بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کے حکم کو دائمی قرار دے۔

چونکہ بیت المقدس عارضی قبلہ تھا، اور یہ اوّلین فرزندان اسلام کے ایمان و اسلام کی آزمایش بھی، اس لئے ان لوگوں کے دلوں میں اس خیال کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر تھا کہ ایّام امتحان کی نمازوں کا کیا حشر ہوگا، خصوصًا ان صحابہ کرام کی زیادہ فکر تھی جو اسی زمانہ میں فوت ہو چکے تھے، اس آیت نے یہ شبہ دور کر دیا کہ ان لوگوں کا اجر و ثواب کبھی ضائع نہیں ہوگا۔ ابن عباس نے ایمانکم کے معنی صلاتکم الیٰ بیت المقدس

کیے ہیں۔

تحویل قبلہ

(۱۴۴) قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّیَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَیْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوْنَ ۝

تمہارا منہ پھیر پھیر کر آسمان کی جانب دیکھنا ہم ملاحظہ کر رہے ہیں پس ہم اسی قبلہ کی طرف تجھے پھیر دینگے جس کو تو چاہتا ہے، تو اب مسجد حرام کی طرف اپنا منہ پھیر، اور جس جگہ تم ہو اکرو اسی کی طرف منہ پھیرو، اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ یہی ٹھیک ہے اور ان کے رب کے حکم سے ہے، اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ اس سے بے خبر نہیں،

(۱۴۵) وَلَئِنْ اَتَیْتَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰیَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَاۤ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝

اور اگر تم کتاب والوں کے پاس تمام دلائل لے آؤ پھر بھی تمہارے قبلہ کی پیروی نہ کریں اور نہ تم ہی ان کے قبلہ کی پیروی کرنے والے ہو، اور نہ انمیں کا کوئی فریق بھی دوسرے فریق کے قبلہ کی پیروی کرنے والا ہے اور تمہیں جو علم نوازش کیا گیا ہے اگر اس کے بعد تم ان لوگوں کی خواہشوں پر چلے تو بے شک تم بھی بے انصافوں میں سے ہو جاؤ گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ ایک قوم کی ہزارہا سال کی سعی وکوشش یوں رائیگاں نہ جائیگی، اور عرب کو جو بیت المقدس کی جانب رخ کرنے کا حکم دیا گیا ہے صرف ان کے امتحان کی خاطر ہے، جب آزمایش میں پورے اترے تو اب قدرتی طور پر آپ اس امر کے لئے یکسر انتظار بن گئے کہ کس وقت تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوتا ہے، چنانچہ اسی حالت میں ان آیات کا نزول ہوا، اور بیت اللہ کو ہمیشہ کے لئے دنیائے اسلام کا مرکز

وحید بنا دیا گیا، آپ کا ارشاد مبارک انا دعوۃ ابراھیم بتاتا ہے کہ آپ ہی ابراہیمی دعاؤں کے حقیقی مصداق ہیں، اور دونوں باپ بیٹوں کی یہی دعا تھی کہ ربنا تقبل منا انك انت السمیع العلیم اہل کتاب کے نزدیک اس جگہ کا قبلہ قرار پانا، اور آپ کا نبی ہونا اجلی بدیہیات میں سے تھا، مگر وہ لوگ آپ کی نبوت کو صرف عرب تک محدود خیال کرتے تھے اور اس لئے خاموشی سے آپ کے دعاوی کو سن لیتے تھے، لیکن جس وقت قبلہ بدلا تو انہیں معلوم ہوا کہ یہ تو ہم پر حملہ کیا جا رہا ہے اور اب نبوت، بنی اسرائیل سے منتقل ہو کر بنی اسمٰعیل میں چلی جا رہی ہے، اس لئے فوراً ناسخ و منسوخ کی بحث چھیڑ دی۔

اہل کتاب کے بغض و حسد کی یہ حالت ہی کہ اگر آپ ان کے سامنے تمام دلائل پیش کر دیں پھر بھی وہ بیت اللہ کو قبلہ نہ مانینگے، اور چونکہ آپ کو بہترین مرکز نوازش کیا گیا ہے، اس لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ اس ادنیٰ ترین قبلہ کی طرف متوجہ ہوں، خود اہل کتاب کو دیکھو، ایک ہی توراۃ پر سب کا ایمان ہے، لیکن قبلہ میں سب مختلف ہیں، ایک دوسرے کا اتباع نہیں کرتے، سامریوں کا قبلہ اور ہے، یہودیوں کا دوسرا، اور عیسائیوں کا رُخ مشرق کی جانب ہوتا ہے، یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے کہ آج چہل کروڑ نفوس اسی بیت اللہ الجلیل کو اپنا قبلہ تسلیم کرتے ہیں۔

(۱۴۶) اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ (۱۴۷) اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝	جن کو ہم نے کتاب دی ہی وہ حقیقت استقبال کعبہ کو ایسے ہی پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو اور ان میں ایک گروہ ایسا ہی جو دیدہ دانستہ حق بات کو چھپاتا ہی، حق وہی ہی جو تمہارے رب کا حکم ہے، پس شک کرنیوالوں میں سے نہ ہو جانا۔

کوئی شخص اپنے بیٹوں کے شناخت کرنے میں غلطی نہیں کر سکتا، پس جس طرح یہ ایک یقینی اور قطعی بات ہے، ایسے ہی اہل کتاب کو خوب معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ

بیت اللہ ہی ہو سکتا ہے، مگر بد دیانتی کی وجہ سے اس کو مخفی رکھتے ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ نے اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے: کسانیکہ دادہ ایم ایشاں را کتاب، می شناسند وے را یعنی حقیقت استقبال کعبہ را چنانکہ می شناسند فرزندان خویش را۔

مسلمانوں کا دائمی قبلہ یہی ہونا چاہیے اس لئے دل میں کبھی کوئی شک نہ پیدا ہونے پائے۔

مرکز قائم کرنا ہے

اب تک بنی اسرائیل کو الزامی و تحقیقی جواب دیا گیا، اور تحویل قبلہ کی بعض مصلحتوں پر روشنی ڈالی گئی، اب بیان کیا جاتا ہے کہ تمام اُمت مسلمہ کے لئے ایک ہی قبلہ مقرر کرنے سے اصلی مقصد کیا ہے، اور کونسی غرض و غایت پیش نظر ہے؟

(۱۴۸) وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ؕ أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَأْتِ بِكُمُ اللَّهُ جَمِيعًا ؕ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۱۴۹) وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِن رَّبِّكَ ؕ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ○	اور ہر جماعت کو ایک ہی طرف منہ کرنا ہے، سو تم نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو، جس جگہ بھی تم ہوگے اللہ تم کو جمع کر دیگا، بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے، اور جس جگہ سے تم نکلو تو مسجد حرام ہی کی طرف منہ کرو، اور یہی حقیقت میں تیرے رب کی طرف سے ہے، اور اللہ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں۔

بیت اللہ کا قبلہ بنانا اس لئے ہے کہ ایک عالمگیر اخوت قائم کرکے اس کے لئے تمام عالم میں ایک مرکز بنا دے، کہ وحدۃ مقصد کے ساتھ وحدت مرکز ہونا ضروری ہے پس مسلمانوں کی ہر جماعت کا فرض ہے کہ وہ جس طرف بھی جائے، اور جدھر کا سفر کرے، نماز پڑھتے وقت اسی بیت اللہ کی جانب رخ کرے۔ جب مرکز ایک ہی ہے تو ہم میں سے ہر ایک اس امر کی سعی و کوشش کرے کہ خیر و صلاح، نیکی و پاکدامنی، طہارت و پاکیزگی، اور

ایثار و فدویت میں ایک دوسرے سے آگے بڑھے، اور سابق القدم رہے۔ سبقت کی ایک صورت یہ ہے کہ ہم اپنے دوستوں میں پیش پیش رہنے کی کوشش کریں، اور دوسری شکل یہ ہے کہ جس مرکز پر امت مسلمہ کے تمام فرزندان جلیل جمع ہوں، اُن کے ساتھ مقابلہ کرنے اور ہر ایک سے آگے رہنے کا جنون دامن گیر ہو، اور حقیقت میں اعلیٰ ترین عزت و کرامت کا وہی مستحق ہوگا جو اس میدان مسابقت میں سب کا امام و پیشوا بن جائے، مرکز کی وحدت ہم میں اس قدر جوش و ولولہ، عزم و استقلال، صبر و استقامت، علو ہمتی، اور بلند پروازی پیدا کر دیگی کہ ایک ایک مسلمان تمام دنیا سے مقابلہ کرنے کو تیار ہو جائیگا، اور وہ یقین کر لیگا کہ صرف وہی کامیاب ہو سکتا ہے، جب اعمال و اخلاق میں ہم بہترین بن جائینگے پھر کسی کو ہم سے یارائے دم زدن نہ ہوگا۔ وفی ذلك فلیتنافس المتنافسون۔

سورۂ تغابن میں اسی طرف توجہ دلائی: یوم یجمعکم لیوم الجمع ذلك یوم التغابن (۶۴: ۹) تمہیں اقوام عالم سے مقابلہ کرنا ہے، میدان محشر میں ان سے مقابلہ کرتے وقت اگر ان سب سے آگے بڑھ گئے تو کامیاب رہے، ورنہ اصلی ناکامی وہی ہوگی، گویا ایک فرزند اسلام دنیا میں بھی ہر ایک سے آگے رہنے کی کوشش کرے کہ الدنیا مزرعۃ الاخرۃ، اس لئے قرآن نے تعلیم دی کہ واجعلنا للمتقین اماما کی دعا کیا کرو۔ پھر سورۂ غاشیہ میں فرمایا: والی السماء کیف رفعت، گویا ایک مسلمان کا مقصد آسمان کی طرح بلند و برتر ہونا چاہیے۔

مرکز قائم کرنے کا یہی مقصد ہے کہ جب ہر ایک مسلم کو حج بیت اللہ کے لئے جانا ضروری ہے، اور وہاں دنیا کے بہترین مسلمان جمع ہونگے تو ہمارا فرض ہے کہ اپنے اندر اس قدر طہارت و پاکیزگی پیدا کر لیں کہ اُن کے سامنے ذلیل و رسوا نہ ہوں، اگر ایک مرکز نہ ہوتا تو اس قدر جوش و ولولہ نہیں پیدا ہو سکتا تھا، رہا اس جگہ پر دنیا کے ہر گوشہ سے مسلمانوں کا جمع کرنا، سو یہ اللہ کے قبضہ میں ہے وہ ضرور سب کو یہاں لا کر چھوڑیگا، ہمارا فرض یہ ہونا

چاہیے کہ جہاں کہیں سے تم نکلو تمہارا رُخ اسی جانب ہو، اور باقی تمام مسلمان بھی اسی کی طرف منہ کرکے نماز پڑھیں، اگر تم اس مرکز کا احترام کروگے تو ضرور دنیا و آخرت میں سرفراز رہوگے۔

(۱۵۰) وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۙ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ ۙ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي ۙ وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ	اور جہاں سے تو نکلے اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کرلیا کرو، اور جہاں کہیں تم ہوا کرو تو اسی کی طرف اپنا منہ کرو، تاکہ لوگوں کو جھگڑنے کی جگہہ نہ رہے، مگر ان میں سے وہ جو بے انصاف ہیں سو اُن سے مت ڈرو، اور مجھ سے ڈرو، اور اس لئے کہ تم پر اپنی نعمت پوری کروں، اور شاید تم راہ پاؤ۔

اس آیت میں مزید تاکید کے طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مسلمانوں کو خطاب کرکے فرمایا کہ وہ ہمیشہ اسی کو اپنا قبلہ بنائیں، ایک لمحہ کے لئے بھی کسی مسلمان کو قبلہ بدلنے اور رسول کے طرز عمل سے استدلال کرنے کا خیال نہ پیدا ہو، بلکہ اب اس میں کبھی تبدیلی نہ ہوگی، ورنہ لوگوں کو یہ کہنے کا موقعہ مل جائیگا کہ مسلمانوں کا کوئی اُصول بھی قابل اعتماد نہیں، ہے ظالم و بدکار، سو وہ اپنی کٹ حجتی سے کبھی باز نہ آئینگے، عیسائی اب تک یہی کہتے ہیں کہ عربوں کو اپنے ساتھ ملانے کی خاطر بیت اللہ قبلہ بنایا گیا، حالانکہ ابراہیمی عہد انہیں خوب یاد ہے، اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ جس شخص نے صدہا سال کی بت پرستی کو فنا کردیا جو اس قوم کے نزدیک بے انتہا عزیز و محبوب اور لازمہ قومیت تھی، وہ اپنی قوم کو خوش کرنے کے لئے ایسا کس طرح کرسکتا ہے۔

پس آیندہ کے لئے یہ قاعدہ مقرر ہوگیا کہ بیت اللہ ہی دنیا بھر کے مسلمانوں کا مرکز رہیگا، جب یہ لوگ دوسری اقوام میں تبلیغ و دعوت کے لئے جائیں تو ان کی خاطر اپنے قبلہ اور دوسرے اصول اساسی کو ترک نہ کردیں، تم لوگوں کو اعلیٰ ترین مرکز دیا گیا،

اس لیے اُس کے حقوق ادا کرنے میں میرے سوا اور کسی انسان کا خوف تمہارے دل میں نہ آنے پائے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم پر اتمام نعمت کرونگا، خلافت ارضی نوازش ہوگی اور چونکہ یہ تعلیم عین فطرت انسانی کے مطابق ہی، اسلئے بہت جلد ترقی کرجاؤ گے دوسری قوموں کو اگر اخلاق حسنہ و اعمال صالحہ کے کسب و حصول میں صدہا سال صرف کرنے پڑتے ہیں تو تم اس تعلیم کی بدولت چند سال میں ان نیکیوں کے مالک بن جاؤ گے اور دنیا و آخرۃ کی تمام کامیابیاں تمہیں مل جائینگی۔

قبلہ ایک ہی ہوگا۔

(۱۵۱) كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۞	جیسا ہم نے تم میں تم ہی میں کا ایک رسول بھیجا، جو ہماری آیتیں تم کو پڑھ کر سناتا ہی، اور تم کو سنوارتا ہی، اور تم کو کتاب سکھاتا ہی اور عقل کی باتیں، اور تمکو ایسی باتیں سکھاتا ہی جو تم نہ جانتے تھے۔

کسی کو یہ خیال نہ آنے پائے کہ اہل کتاب کے ساتھ مصالحت کرنے کی خاطر ان کے قبلہ کو بھی دوسرے درجہ پر ہی تسلیم کرلیا جائے، اس لئے کہ جب تمام نوع انسانی کے لئے ایک ہی رسول بھیجا گیا ہی، اس کی بعثت میں کسی قوم کی تخصیص نہیں، بلکہ اس کا روئے سخن عام اور سب کی طرف ہی، اس لئے قبلہ بھی ایک ہی ہو سکتا ہی۔

قرآن حکیم کے نزول سے قبل، عرب خانہ جنگی اور خون ریزی میں مبتلا تھے، نظام صالح اور قومیت متحدہ سے بہت دور جا پڑے تھے، اب ان کو ایسی تعلیم دی گئی جس نے ان شتربانوں کو جہانباں بنا دیا، اور رسول اُمّی کی گود میں تاجداران عالم نے پرورش پائی۔

چند لطیف نکتے

اہل کتاب خوب جانتے تھے کہ جو مسجد آخر میں قبلہ قرار پائیگی، وہ درجہ میں بھی پہلی مسجد سے برتر ہوگی، دیکھئے ان آیات میں مکہ کی تعریف کی گئی ہی:-

(۱) "سمندر کی فراوانی تیری طرف پھریگی، اور قوموں کی دولت تیرے پاس فراہم ہوگی، اونٹوں کی قطاریں اور مدیان اور عیفا کی سانڈنیاں آ کے تیرے گرد بے شمار ہونگی، وہ سب جو سبا کے ہیں، آوینگے، وہ سونا اور لبان لاوینگے، اور خداوند کی تعریفوں کی بشارتیں سناوینگے، قیدار کی ساری بھیڑیں تیرے پاس جمع ہونگی بنیط کے مینڈھے تیری خدمت میں حاضر ہونگے، وہ میری منظوری کے واسطے میرے مذبح پر چڑھائے جائینگے، اور میں اپنی شوکت کے گھر کو بزرگی دونگا" (یسعیاہ ۶۰: ۵، ۶، ۷)

مدیان، عیفا، سبا، قیدار اور بنیط، پانچوں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے یا پوتے ہیں، جو عرب میں آکر آباد ہوگئے تھے، ان کی نسل کے قبائل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں داخل ہوئے یہ لوگ نہ تو یہودی تھے اور نہ عیسائی، ان سب نے ملکر صرف ایک مذبح منیٰ پر اپنی قربانیاں پیش کی تھیں، قوموں کے نام، منیٰ کا پتہ، عرب کا قاطبۃً مسلمان ہونا، حجۃ الوداع میں سب کا آپ کی خدمت میں حاضر ہونا، یہ تمام تاریخی واقعات بتا رہے ہیں کہ شوکت کا گھر در اصل بیت الحرام ہی۔

(۲) حجی نبی کی کتاب میں ہی:-

"اس پچھلے گھر کا جلال پہلے گھر کے جلال سے زیادہ ہوگا رب الافواج فرماتا ہی، اور میں اس مکان میں سلامتی بخشونگا، رب الافواج فرماتا ہی" (حجی، ۲: ۹)

مسلمان ہر نماز کے بعد یہ دعا پڑھتے ہیں: اللھم انت السلام ومنك السلام تبارکت یا ذا الجلال والاکرام۔

(۳) مکاشفات یوحنا میں ہی:-

"جو غالب آئے میں اسے اپنے خدا کے مقدس میں ایک ستون بناؤں گا، وہ پھر کبھی باہر نہ نکلیگا، اور میں اپنے خدا کا نام اور اپنے خدا کے شہر یعنی اس نئے یروشلم کا نام جو میرے خدا کے پاس سے آسمان سے اترنے والا ہی، اور اپنا نیا نام اس پر لکھوں گا جسکے

کان ہوں وہ سُنے کہ روح کلیساؤں سے کیا کہتا ہی" (مکاشفات یوحنا، ۳: ۱۲و۱۳)

عارف یوحنا نے اپنے مکاشفہ میں دو باتوں کا ذکر کیا ہی (۱) نیا یروشلم،

(۲) نیا نام،

نئے یروشلم سے مراد کعبہ ہی۔ آسمان سے اترنے کے یہ معنی ہیں کہ کعبہ کو قبلہ بنانے کے لئے آسمان سے حکم نازل ہو گا، قرآن میں ہی: قد نری تقلب وجھك فی السماء فلنولینك قبلۃ ترضٰھا (۲: ۱۳۹)

صلح حدیبیہ کے وقت عہدنامہ میں اسم رحمٰن لکھا گیا تو سہیل سفیر کفار نے کہا واما الرحمٰن فو اللہ ما نعرفہ (خدا کی قسم ہم نہیں جانتے رحمٰن کون ہی) قرآن میں ایک جگہہ آیا: وھم بذکر الرحمٰن ھم کافرون (۲۱: ۳۶) ایک مقام پر یوں ارشاد ہوا: واذا قیل لھم اسجدوا للرحمٰن قالوا وما الرحمٰن (۲۵: ۶۱) یہی وہ نیا نام تھا جس سے اہل عرب باوجود اہل زبان ہونے کے ناواقف تھے، قرآن نے آکر انہیں روشناس کرایا۔

(۴) زبور میں داؤد علیہ السلام یوں مدح و ستائش کرتے ہیں:۔

"مبارک وہ ہیں جو تیرے گھر میں بستے ہیں، وہ سدا تیری ستایش کرینگے (سلاہ) مبارک وہ انسان جس میں قوت تجھ سے ہی، ان کے دل میں تیری راہیں ہیں، وہ بکا کی وادی میں گذر کرتے ہوئے اسے ایک کوآں بناتے۔ پہلی برسات اسے برکتوں سے ڈھانپ لیتی" (زبور، ۸۴: ۴ و ۵ و ۶)

ان آیات سے حسب ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں:۔

(الف) یہ خدا کا ایک گھر ہی، وہاں کے باشندے مبارک ہیں، اور وہ ہمیشہ خدا کی تقدیس اور بزرگی بیان کرتے رہینگے۔

(ب) ان لوگوں کی قوت و شوکت کا سبب خود اللہ تعالیٰ ہو گا۔

(ج) بکا ایک ایسا نام ہی جو معرفہ معلوم ہوتا ہی اور اس میں تبدیلی نہیں ہوئی۔
(د) وادی بکا میں سے گزرتے وقت ایک کنواں بنائینگے۔

اب ان کا مصداق ملاحظہ ہو:۔

(۱) بسنے والوں سے مراد حضرت اسمٰعیل کی اولاد ہی، حضرت ابراہیم دعا کرتے ہیں: ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم (۱۴ : ۴۰) خداوندا! میں نے اپنی اولاد کو اس وادی میں تیرے عزت والے گھر کے پاس آباد کیا ہی جس میں زراعت نہیں ہوتی۔

(۲) جس وادی کا نام بکا، زبور میں ہی اس کی نسبت قرآن یوں کہتا ہے: ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ (۱۳ : ۱۹) پہلا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا وہ وہی ہی جو بکا میں ہی۔

(۳) کنوئیں کے متعلق بخاری میں ہی، فلما بلغت الوادی سعت، جس وقت ہاجرہ اس وادی میں پہنچیں تو پانی کے لئے دوڑیں، پھر فرمایا وغمر عقبیہ علی الارض قال فانبثق الماو فدھشت ام اسمٰعیل فجعلت تحفر فرشتہ نے اپنی ایڑی زمین پر ماری، پانی اُبل پڑا، اسمٰعیل کی ماں حیران رہ گئی اور اُسے کھود کر کنواں بنانے لگی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام، یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے جد اعلیٰ ہیں، ان شان دار قوموں کے پدر بزرگوار کی مسجد کو قبلہ قرار دینا گویا تینوں قوموں کو اتحاد نسبی وجسمانی کی یاد دلا کر اتحاد روحانی کے لئے دعوت دینا اور متحد بن جانے کا پیغام سُنا دینا ہی۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ مسلمان، خانہ کعبہ کی طرف منہ کرکے اس کی پرستش کرتے ہیں اور یہ پُرانی بت پرستی اب تک ان میں قایم ہی،

عبادت کرنے کے لئے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہی اولاً جس چیز کی پرستش کی جائے اس کی عظمت سے دل بھرپور ہو اس کے جلال و کبریائی سے جسم انسانی پر رونگٹے کھڑے ہوتے ہوں، اور یکسر توجہ بن کر اس کے حضور میں کھڑا ہو۔ ثانیاً اس کی حمد و ستائش کے گیت زبان سے گائے جائیں اور تیسرے یہ کہ اپنی آرزو بر آنے کی اس سے درخواست ہو، لیکن ان میں سے کوئی بات بھی توجہ الی القبلہ سے نہیں ثابت ہوتی، بلکہ نماز کے تمام اجزا میں خدائے قدوس کی طرف توجہ ہوتی ہی، اسی کی پاکی بیان کی جاتی ہی، اور اسی کے آگے دست سوال دراز ہوتا ہی، مسلمان تو ایک طرف خود مشرکین بھی اس گھر کو نہیں پوجتے تھے بلکہ وہ ان بتوں کی پرستش کرتے جو اس کے اندر رکھے گئے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان بتوں کو پاش پاش کر کے ایک اللہ کی عبادت کے لئے اس کو خاص کر دیا۔

یہ بھی کہا جاتا ہی کہ حجر اسود کو بوسہ دینا بھی بت پرستی کی بقایا میں سے ہے، اس اعتراض کا جواب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان سے سُن لینا چاہیے: انک حجر لا تضر و لا تنفع تو ایک پتھر ہی کسی کے نفع و نقصان سے تمہیں کوئی سروکار نہیں یہ پتھر صرف اس لئے ہی کہ طواف کی ابتدا اور انتہا معلوم کرنے کا کام دے، ہمیں زبور میں اس کے متعلق حسب ذیل الفاظ ملتے ہیں: "وہ پتھر جسے معماروں نے رد کیا کونے کا سرا ہو گیا ہی، یہ خداوند سے ہوا جو ہماری نظروں میں عجیب ہی" (زبور، ۱۱۸: ۲۲، ۲۳) دانیال میں ہی، "جیسا کہ تو نے دیکھا کہ وہ پتھر بغیر اس کے کہ کوئی ہاتھ سے اس کو پہاڑ سے کاٹ نکالے آپ سے آپ نکلا" (دانیال، ۲: ۴۵) انجیل میں انگوری باغ کے ٹھیکیداروں کی تمثیل میں یوں فرمایا: انہوں نے اس سے کہا، ان بڑے آدمیوں کو بری طرح ہلاک کریگا، اور باغ کا ٹھیکیدار باغبانوں کو دیگا جو موسم پر اس کو پھل دیں، یسوع نے ان سے کہا، کیا تم نے کتاب مقدس میں کبھی نہیں پڑھا جس پتھر کو معماروں

نے رد کیا:
وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا۔
یہ خداوند کی طرف سے ہوا۔
اور ہماری نظر میں عجیب ہے۔
اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائیگی، اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے، دے دی جائیگی اور جو اس پتھر پر گریگا اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائینگے، مگر جس پر وہ گریگا اُسے پیس ڈالیگا (متی ۲۱: ۴۲تا۴۴)

پس حجر اسود وہی نشان ہے جس کا ذکر کتاب مقدس کی ان آیات میں آیا ہے۔
قبلہ کی بحث نے دراصل اس بات کو واضح کر دیا کہ ابراہیمی دعا نبی امی کے لئے تھی، یہودیوں نے اپنے قوائے عملیہ کو بیکار کر دیا، دعوۃ و تبلیغ کے فرض کو چھوڑ بیٹھے، کتاب الٰہی میں تحریف کے مرتکب ہوئے، اس لئے اب خود بخود زمین و آسمان سے ندا بلند ہونے لگی کہ دعوت ابراہیم کا مصداق ظاہر ہو کیونکہ دنیا تباہی و بربادی کے گڑھے میں جا رہی ہے، چھ صدی تک یہ زمین الہام الٰہی سے محروم رہی تاآنکہ اللہ تعالےٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، جنہوں نے ایک جدید قومیت کی بنیاد ڈالنے کے لئے وہ تعلیم دی جس کا تذکرہ اگلی آیتوں میں آتا ہے۔

باب ۳

تہذیب اخلاق

جب یہودیوں کی نسبت یہ فیصلہ ہوگیا کہ وہ ناکارہ محض ہیں تو اب خود بخود اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ دوسری قوم اُٹھ کر کرہ ارضی کی تہذیب و شائستگی کے فرض کو اپنے ہاتھ میں لے لے، قرآن نے دعویٰ کیا کہ وہ اس اہم و اقدم فرض کو ادا کرنے کے لئے تیار ہے، اور یہاں سے اس نے اپنی تعلیم شروع کی جس نے چند سال کے اندر عرب میں ایسا محیر العقول انقلاب پیدا کر دیا کہ دنیا اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔

اگرچہ اسلام کے سامنے جملہ اقوام و ملل پر برتری حاصل کرنا ہے: ھوالذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ مگر اس نے اس کی طرف تدریجی قدم بڑھایا کہ اولین سنگ بنیاد ٹھیک طور سے رکھا جائے تاکہ اسی پر قومیت صالحہ کی جدید عمارت محکم و استوار ہو سکے، اس نے سب سے پہلے اخلاق انسانی پر نگاہ ڈالی اور انکی اصلاح و تہذیب کو مطمح نظر بنا لیا کہ قوم میں صحیح کیرکٹر پیدا ہو، اور ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم کا مصداق بن جائے، یہی اخلاق، اعمال کا سرچشمہ ہیں، اور ان ہی پر حیات قومی کا دارومدار۔

اخلاق کی تفصیل

انسانی ارتقاء اور اس کے مدارج علو و رفعت ان چار عنوانوں سے باہر نہیں،

(۱) تہذیب اخلاق (۲) تدبیر منزل (۳) سیاست مدینہ (۴) خلافت کبریٰ جسقدر

انبیاے کرام دنیا میں تشریف لائے ان کا روے سخن ایک ایک قوم کی طرف تھا، اسلئے ان کی انتہائی ترقی بھی سیاست مدینہ سے آگے نہ بڑھ سکی، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام عالم کے لئے بھیجے گئے تھے : وما ارسلنك الا كافة للناس بشيرا ونذيرا (۳۴: ۲۷) اس لئے آپ کو خلافت کبریٰ کا وعدہ دیا گیا، اور آپ کی امت کو شهداء على الناس کے درجہ پر فائز کیا گیا،

یہاں سے تہذیب اخلاق کا باب شروع ہوتا ہی جس میں حسب ذیل اخلاق پر زور دیا گیا ہی:-

(۱۵۲) فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ (۱۵۳) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝	پس تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھونگا، اور میرا احسان مانو، اور ناشکری مت کرو، اے مسلمانو! صبر اور دعا سے مدد طلب کرو، بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہی-

ان دونوں آیتوں میں حسب ذیل اخلاق پر زور دیا گیا ہی:-

(الف) ذکر، ہر حالت میں خدا کو یاد رکھنا الست بربکم کے جواب میں جو بلے کہا تھا فراموش نہ ہونے پائے، ایاك نعبد وایاك نستعين کی حقیقت طاری ہو، اور الا بذكر الله تطمئن القلوب سے حلاوت اندوز ہو، ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی لله رب العلمين لا شريك له وبذلك امرت وانا اول المسلمين کا جذبۂ عشق وشیفتگی پیدا ہو، اور اسلمت لرب العلمين اس کے ہر رگ وپے میں جاری وساری ہو، جس طرح دنیا میں ہر قوم کے لئے مرکز ہونا ضروری ہے، بجوم وکواکب کا تعلق سورج کے ساتھ ہی درخت کی مختلف شاخیں جڑ سے متعلق ہیں، ایسے ہی نوع انسانی اپنے مرکز حقیقی سے وابستہ ہو کہ وہی سرچشمہ حیات ہی، اور وہی ہماری ضروریات زندگی کو پورا کرنے والا- جھکے تو اسی کے آگے، عاجزی وفروتنی ہو تو اسی کی خاطر، اور مانگو تو اسی سے

وہی دیگا۔

(ب) شکر، جو کچھ اس نے دیا، اس کو صحیح موقع و محل پر صرف کرنا شکر ہے، ولئن شکرتم لازیدنکم ولئن کفرتم ان عذابی لشدید، اگر اس کو بیجا خرچ کیا تو یہ کفر ہوا، سلیمان علیہ السلام نے کہا: ھذا من فضل ربی لیبلونی ءاشکر ام اکفر ومن شکر فانما یشکر لنفسہ ومن کفر فان ربی غنی کریم (۲۷: ۴۰) لوط علیہ السلام پر نعمتوں کے نزول کا سبب شکر قرار دیا: نجینٰھم بسحر نعمۃ من عندنا کذٰلک نجزی من شکر (۵۴: ۳۴ و ۳۵) چونکہ وہ خدا کی دی ہوئی چیز کو صحیح موقع و محل پر صرف کرتے تھے اس لئے ہم نے ان کو عذاب سے نجات دی۔

(ج) صبر، ہر مقصد کے حصول میں تکلیفوں اور مصیبتوں کا پیش آنا لازمی ہے، تمام دنیا سے شرک و بت پرستی کو دور کرنا، اس کے گوشہ گوشہ اور کونہ کونہ میں توحید کی نشر و اشاعت، اور اقوام عالم پر برتری کا حصول بے انتہا قربانیوں کے بغیر نہیں ہو سکتا، اسلئے اپنے مقصد حیات پر مرنے کے لئے تیار رہنا اور مصائب و موانع کی بنا پر اپنے نصب العین کو نہ چھوڑنا صبر ہے، سورۂ آل عمران کے آخر میں خلافت ارضی کی شرط اسی صبر کو قرار دیا: اصبروا وصابروا ورابطوا واتقوا اللہ لعلکم تفلحون، ایک جگہ اس کو اعلیٰ ترین اخلاقی قوتوں میں سے شمار کیا: وان تصبروا وتتقوا فان ذٰلک من عزم الامور (۳: ۱۸۳)، دوسری جگہ اس کو اولوالعزم پیغمبروں کے مختصات میں شامل کیا: فاصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل، (۴۶: ۳۴) قرآن حکیم ہر صابر مسلمان سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ دس کافروں پر بھاری ہو: ان یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا مائتین، (۸: ۶۶) جنگ میں کامیابی کے مختلف اصول بیان کرتے ہوئے فرمایا: واطیعوا اللہ ورسولہ ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم واصبروا ان اللہ مع الصابرین، (۸: ۴۸) لڑائی کے موقع پر اسی صبر و استقامت کی سبب

زیادہ ضرورت ہوتی ہے: ربنا افرغ علینا صبرا وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکفرین (۲: ۲۵۱) اسی صبر پر امامت وپیشوائی عالم نوازش کی گئی: وجعلنا منہم ائمۃ یھدون بامرنا لما صبروا (۳۲: ۲۴) اسی کی خاطر بنی اسرائیل ہر قسم کی خیر وبرکت کے نزول کا باعث بن گئے۔ وتمت کلمت ربك الحسنیٰ علی بنی اسراءیل بما صبروا (۷: ۱۳۳) بہترین جزا صرف صابرین کو ملیگی: ولنجزین الذین صبروا اجرھم باحسن ما کانوا یعملون (۱۶: ۹۸) ان کو بغیر حساب ہر چیز نوازش ہوگی: انما یوفی الصّٰبرون اجرھم بغیر حساب (۳۹: ۱۳) اسی صبر واستقامت پر بالآخر فرشتوں کی اعانت کا وعدہ دیا گیا: ان تصبروا وتتقوا ویاتوکم من فورھم ھذا یمددکم ربکم بخمسۃ الاف من الملئکۃ (۳: ۱۲۱) آل عمران کی اس آیت نے تو صبر کے معنی بالکل ہی واضح کر دیے: وکاین من نبی قتل معہ ربیون کثیر فما وھنوا لما اصابھم فی سبیل اللہ وما ضعفوا وما استکانوا واللہ یحب الصّٰبرین (۳: ۱۴۰) یہاں تو مقصد پر مرنے کے سوا اور کوئی مطلب ہی نہیں لیا جا سکتا۔

(د) دعا اللہ تعالیٰ سے اعانت کے طلبگار رہنا، آدم علیہ السلام مدتوں پریشان پھرتے رہے تا آنکہ انہوں نے دعا کی اور مصیبت سے نجات حاصل کی، ادعونی استجب لکم اسی لئے کہا گیا، مومنین کے خصائص بیان کرتے ہوئے فرمایا: والذین یقولون ربنا اصرف عنا عذاب جھنم ان عذابھا کان غراما (۲۵: ۶۶) زکریا علیہ السلام کے خصائص و امتیازات بیان کرتے ہوئے کہا: انھم کانوا یسٰرعون فی الخیرات ویدعوننا رغبا ورھبا (۲۱: ۹۰) گناہوں کی مغفرت صرف دعا کے ذریعہ ہو سکتی ہے: والذین اذا فعلوا فاحشۃ او ظلموا انفسھم ذکروا اللہ فاستغفروا لذنوبھم ومن یغفر الذنوب الا اللہ (۳: ۱۲۹)

امام احمد نے اپنی مسند میں نعمان بن بشیر سے روایت کیا ہے کہ رسول علیہ السلام نے فرمایا: الدعاء ھو العبادۃ ایک روایت میں آتا ہے: الدعاء مخ العبادۃ، ابن ماجہ میں ہے: لیس شئی اکرم علی اللہ من الدعاء، دعا سے بڑھکر اللہ کے نزدیک اور کوئی چیز بزرگ و برتر نہیں۔ بیہقی نے دعوات کبیر میں روایت کیا ہے: ان ربکم حی کریم یستحی من عبدہ اذا رفع یدیہ الیہ ان یردھما صفرا تمہارا پروردگار باحیا ہے، جب ایک بندہ اس کے حضور میں ہاتھ پھیلاتا ہے تو خالی واپس کرتے ہوئے اسے شرم آتی ہے۔

مواقع صبر

(۱۵۴) وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ○	اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے جائیں انہیں مردہ مت کہو، بلکہ زندہ ہیں لیکن تمہیں خبر نہیں۔

یہاں سے ان مواقع کا ذکر کیا جاتا ہے، جہاں صبر کے بغیر چارہ نہیں، اور جو ہر راہ رَوِ حق کے لیے ضروری و ناگزیر ہیں کہ بغیر ان تکالیف و مصائب کے اچھے اور برے میں تمیز نہیں ہو سکتی، قرآن حکیم نے اکثر مقامات پر جہاں لڑائیوں کا فلسفہ بیان کیا ہے، وہاں بار بار اس حقیقت کبریٰ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جنگ صرف اس لیے ہوئی اور ان مصیبتوں کا نزول اس بنا پر ہوا کہ منافق اور مومن میں تمیز ہو جائے، چنانچہ فرمایا: ولیعلم اللہ الذین اٰمنوا ویتخذ منکم شھداء ط واللہ لا یحب الظّٰلمین ○ و لیمحص اللہ الذین اٰمنوا ویمحق الکٰفرین (۳: ۱۴۰ و ۱۴۱) دوسری جگہ کہا: ولیبتلی اللہ ما فی صدورکم ولیمحص ما فی قلوبکم (۳: ۱۴۸) اور ایک موقع پر یوں ارشاد ہوا: وما اصابکم یوم التقی الجمعٰن فباذن اللہ ولیعلم المومنین ○ ولیعلم الذین نافقوا (۳: ۱۶۰)

اصل بات یہ ہے کہ قوموں کی زندگی شہداء کے خون اور گوشت سے وابستہ ہے کھیتی کے لیے پانی اور سورج کی حرارت کی ضرورت ہوتی ہے، ایسے ہی آزادی حاصل نہیں ہو سکتی جب تک اس کے لیے گردنیں نہ کٹیں، ہزاروں انسانوں کا خون نہ بہے، قوموں کی کھیتی کو خون سے سینچا جاتا ہے، جب تک کسی قوم کے بہترین افراد قتل نہ ہوں، اس میں کبھی جوش و ولولۂ انتقام نہیں پیدا ہوتا، اسی کی طرف قرآن نے اشارہ کیا جب کہا: ولیعلم اللہ الذین آمنوا ویتخذ منکم شہداء (۳ : ۱۳۴) جب قوم کی قوم میں جذبۂ ایثار و فدویت پیدا ہو جائیگا اور بچہ بچہ یکسر جوش و انتقام بن جائیگا تو کس کو ہمت ہو گی اس سے مقابلہ کرنے کی، یہی وہ حیات قومی ہے جو شہداء کے خون بہنے سے پیدا ہوتی ہے، دنیا میں سب سے بڑی لعنت یہ ہے کہ ایک قوم پر غیروں کو مسلط کر دیا جائے، اس لئے فرمایا کہ جو لوگ ہماری راہ میں اپنی جانیں دینگے ان کی قوم کبھی غیروں کی غلام و محکوم نہیں بن سکتی، بلکہ وہ ابدی زندگی کی وارث بن جاتی ہے، مگر یہ زندگی عظیم الشان قربانی کے بعد شروع ہوتی ہے:

دورِ حیات آئیگا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد!

بنی اسرائیل کو جب بیت المقدس پر حملہ کرنے کے لئے کہا گیا تو وہ اسی قربانی سے ڈرتے تھے، اور مرنے سے جی چراتے تھے، پھر تمہیں معلوم ہے ان کا کیا حشر ہوا، قرآن خود اس کو بیان کئے دیتا ہے:-

قال فانها محرمة عليهم اربعين سنة يتيهون في الارض فلا تاس على القوم الفسقين (۵ : ۲۹)	خدا نے فرمایا اچھا تو وہ ملک چالیس برس تک ان کو نصیب نہ ہوگا، مصر کے جنگل میں بھٹکے بھٹکے پھرینگے تو تم نافرمان لوگوں کے حال پر کچھ افسوس نہ کرنا۔

گویا چالیس سال تک ان کو حکومت و سرفرازی سے محروم کر دیا گیا، یہی وہ قتال

فی سبیل اللہ ہے جس کی نسبت قرآن اعلان کرتا ہے کہ اس راہ میں مرنے کے بعد تمام گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں، اس کے سوا اور کوئی نیکی نہیں جس کے لئے اس قسم کا وعدہ کیا گیا ہو: تؤمنون باللہ ورسولہ وتجاھدون فی سبیل اللہ باموالکم وانفسکم ذلکم خیر لکم ان کنتم تعلمون ۝ یغفر لکم ذنوبکم (۶۱: ۱۱ و ۱۲) حدیث میں آتا ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کی آرزو شہید فی سبیل اللہ کے سوا اور کوئی نہیں کرتا: مامن احد یدخل الجنۃ یحب ان یرجع الی الدنیا ولہ مافی الارض من شیء الا الشھید یتمنی ان یرجع الی الدنیا فیقتل عشر مرات لما یری من الکرامۃ۔ شہید چاہتا ہے کہ دنیا میں آئے اور راہ حق وحریت میں بارہا قتل ہو، اور یہ خواہش اسی عزت وکرامت نے پیدا کی جو مرنے کے بعد اُسے میسر آئی، اور اس لئے کہ اس کی راہ میں جان دینے کی لذت وسعادت ایک ہی مرتبہ میں ختم نہ ہو جائے:۔

تمنت سلیمی ان نموت بحبھا
واھون شی عندنا ما تمنت!

ایک جگہ فرمایا: مامن میت یموت الا ختم عملہ الا من مات مرابطا فی سبیل اللہ، فانہ ینمولہ عملہ الی یوم القیمۃ وامن من فتنۃ القبر کوئی ایسی موت نہیں جس کے ساتھ اعمال کا سلسلہ بھی ختم نہ ہوتا ہو الا وہ شخص کہ جہاد کی راہ میں دشمن کے حملے کا انتظار کرتا ہوا دنیا سے گیا پس اس کا عمل ایسا ہی جو مرنے کے بعد بھی قیامت تک بڑھتا رہیگا۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حسنات جاریہ تین ہیں، اولاد صالح، علم نافع، اور اوقاف وتعمیرات خیریہ، گزشتہ حدیث سے پتہ لگتا ہے کہ جہاد کا ہر کام بھی اسی قسم میں داخل ہے، کیونکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ اپنے بعد کے زمانے اور آنے والی نسلوں کی حفاظت وسعادت کے لئے اپنا وجود قربان کر دیا جائے، پس کوئی عمل نہیں جو

اس سے زیادہ سچی اور بے لاگ انسانی خدمت اور نوعی حفاظت کے جذبات رکھتا ہو اور اس لئے ضروری ہوا کہ اس کا اجر بھی وقتی نہ ہو، دائمی ہو، عمل کا اجر تو نتائج پر موقوف ہی جب نتائج بعد کے زمانوں اور نسلوں کو ملینگے، تو صاحب عمل کا اجر بھی فوراً کیوں منقطع ہوجائے؟

اسی چیز کی طرف آیت زیر بحث نے اشارہ کیا کہ جب حق پر کبھی موت طاری نہیں ہوسکتی تو یہ کیسے ہوسکتا ہی کہ اس کی راہ میں قربان ہونے والے پر موت طاری ہو، اس کے اعمال حسنہ کے ثمرات و نتائج میں کسی قسم کا انقطاع نہیں ہوتا۔

(۱۵۵) وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ○

اور البتہ ہم تم کو تھوڑے سے خوف سے، اور بھوک سے، اور مال اور جان اور میوہ جات کی کمی سے آزمائینگے، اور صبر کرنے والوں کو خوش خبری دیدئیے

(۱۵۶) الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ○

وہ لوگ ہیں کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہی تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کا مال ہیں، اور اسی کی طرف ہمیں لوٹ کر جانا ہی، ایسے ہی لوگوں پر ان کے رب کی طرف

(۱۵۷) أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ○

سے رحمت اور عنایت ہی، اور یہی لوگ راہ راست پر ہیں

موت تو سب سے بڑی مصیبت تھی جو انسان کو بالکلیہ دنیا اور اس کی ہر چیز سے الگ کردیتی ہی، اب ان چیزوں کا ذکر کیا جاتا ہی جو بظاہر اس کا مقابلہ تو نہیں کرسکتیں مگر ان کا تسلسل اور برابر رہنا مصیبت اور تکلیف میں موت سے بھی بڑھ جاتا ہی، اور اکثر لوگ ایسے موقعوں پر کمزوری اور بزدلی کا اظہار کرتے ہیں، دشمن کا خوف دامن گیر ہی، قیدخانہ کی کوٹھریاں، نظربندی کی مصیبت، اور جلاوطنی کی تکلیف کا ڈر لگا ہوا ہے، حکومت نے سامان رسد پر قبضہ کرلیا ہی، مصنوعی قحط سے ملک کو تنگ کر رکھا ہے، اموال و جائداد میں روز بروز کمی ہوتی جاتی ہی، یار و مددگار، اور عزیز و قریب فنا

ہوتے جاتے ہیں، کھانے پینے کی چیزوں میں قلت ہوتی جاتی ہے۔

یہ سنت اللہ ہے اور ہر داعی حق کو اس منزل سے گزرنا پڑتا ہے، دوسری جگہہ آتا ہے: ام حسبتم ان تدخلوا الجنة ولما یاتکم مثل الذین خلوا من قبلکم ط مستہم البأساء والضراء وزلزلوا حتی یقول الرسول والذین امنوا معہ متی نصر اللہ ط الا ان نصر اللہ قریب (۲ : ۲۱۰) ایک مقام پر یوں ارشاد ہوا: احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا امنا وھم لا یفتنون ہ ولقد فتنا الذین من قبلھم فلیعلمن اللہ الذین صدقوا ولیعلمن الکذبین (۲۹ : ا و ۲) سورۂ آل عمران میں ہے: وکاین من نبی قتل معہ ربیون کثیر ج فما وھنوا لما اصابھم فی سبیل اللہ وما ضعفوا وما استکانوا ط (۳ : ۱۴۰) جو لوگ ان مصائب و تکالیف سے پریشان خاطر نہیں ہوتے بلکہ: انا للہ وانا الیہ راجعون کے الفاظ ان کی زبانوں پر جاری ہو جاتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جو فتح و کا[illegible] کے مستحق [illegible] سب [illegible]

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

الفاظ وبشر الصٰبرین کس درجہ حقیقت صبر کو ظاہر کرنے والے ہیں کہ ان مصیبتوں کو برداشت کرتے ہیں مگر راہ حق میں دعوت الی الخیر کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، اور آخر یہی لوگ رحمت عامہ اور خاصہ کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

تعلیم گاہ حریت

(۱۵۸) اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَۃَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰہِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَیْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْہِ اَنْ یَّطَّوَّفَ بِھِمَا ط وَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰہَ شَاکِرٌ عَلِیْمٌ ہ

صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں، پھر جو شخص اس گھر کا حج یا عمرہ کا ارادہ کرے اس پر ان دونوں کے درمیان طواف کرنے میں کوئی گناہ نہیں، اور خوش دلی سے نیک کام کرے تو اللہ تعالیٰ قدر دان جاننے والا ہے۔

ہر تعلیم کی کامیابی کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہے:۔

(۱) نصاب تعلیم بہترین ہو کہ اسی سے قوم کے بچوں میں حس و بیداری پیدا ہوگی، جوش و ولولۂ عمل سے قوم زندہ ہو جائیگی، اور جذبہ قومیت و وطنیت ہر شخص میں نظر آئیگا۔

(۲) معلم کا وجود اس تعلیم کا بہترین نمونہ ہو کہ تعلیم محض بالکل بیکار ہے جب تک اس کے ساتھ انسانی نمونہ عمل نہ ہو۔

(۳) تعلیم گاہ ایسی ہو جس کی روایات شاندار ہوں، اور جس کی تربیت نے بہترین افراد امت پیدا کئے ہوں۔

اسلام نے ان تینوں ضرورتوں کو بہترین طریق سے پورا کیا، اس نے قرآن حکیم کو نصاب تعلیم تجویز کیا کہ لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید (۴۱: ۴۲) اسی کی نسبت حضرت عمر نے کہا حسبنا کتاب اللہ، رسول اللہ اسکے معلم ہیں، یعلمھم الکتاب والحکمۃ جو خود اس تعلیم کے اکمل ترین نمونہ ہیں: لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (۳۳: ۲۱) انک لعلی خلق عظیم کی تفسیر میں حضرت عائشہ نے فرمایا: کان خلقہ القرآن، درس گاہ حرمیت یہی بیت الحرام ہے، جس میں آنے کی ہر مسلمان کو دعوت دی: وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا،

تہذیب اخلاق کے باب میں جن جذبات حقہ کی تعلیم دی گئی، ان کی تربیت و تکمیل کے لئے فرمایا کہ صفا اور مروہ کا طواف کر لیا کرو، اور بار بار سعی بین الصفا والمروہ تو اور بھی زیادہ مفید ثابت ہوگی کہ کثرت کار و مشق کی بنا پر ہر وقت ابراہیم و اسمعیل کے مقامات ذہاب الی اللہ یاد آتے رہیں گے، اور بتدریج وہی اخلاق و جذبات جڑ پکڑ لینگے، ابراہیم نے اس گھر کی بنا اسی لئے ڈالی تھی کہ اس جگہہ مجاہدین فی سبیل اللہ تیار ہوں، اس لئے سپاہیانہ زندگی کے لوازمات کی تکمیل بھی اسی جگہہ ہو سکتی ہے، آپ

آگے چلکر دیکھینگے کہ جس جگہ سورۂ بقرہ میں احکام حج بیان کئے گئے ہیں، اسی کے ساتھ جہاد کے فرائض کا بھی تذکرہ ہی، اگر قرآن کی آیات باہمدگر مربوط و مسلسل ہیں تو وہاں اس کے سوا اور کوئی معنی ہو نہیں سکتے کہ حج اور جہاد کا آپس میں گہرا تعلق ہی۔

جو لوگ اس کا بار بار طواف کرکے اپنے جذبات حقہ کی تکمیل کرینگے، اللہ تعالی ان امتیازات کو ضایع نہ کریگا، بلکہ صحیح موقع پر ان سے کام لیگا، وہ موقعہ کونسا ہوگا، اس کو اللہ کے سوا، دوسرا نہیں جانتا، جب میدان جنگ میں مسلمانوں اور کافروں کی صفیں آراستہ ہونگی، کامیابی کے لئے صبر و استقامت اور عزم و استقلال کی ضرورت ہوگی، اس وقت مسلمان دعا کرینگے: ربنا افرغ علینا صبرا وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکفرین (۲: ۲۵۱) اس وقت ان جذبات حقہ سے کام لیا جائیگا، جب فرعون کو عین دربار میں جادوگروں نے للکارا، اور اس نے جواب میں ان کے ہاتھ پاؤں کاٹنے کی دہمکی دی تو انھوں نے بھی یہی دعا کی تھی: وما تنقم منا الا ان امنا بایت ربنا لما جاء تنا ربنا افرغ علینا صبرا و توفنا مسلمین (۷: ۱۲۳) ہمارا اس کے سوا اور جرم ہی کیا ہی کہ جب اللہ کی آیات ہمارے پاس آگئیں تو ہم نے ان کے آگے اپنی گردنیں خم کردیں، اب تم ہمیں قتل سے ڈراتے ہو تو خداوندا ہم پر صبر انڈیل دے کہ خوف کے مارے پھسل نہ جائیں، اور مریں تو مسلمان ہوں۔

یاد رکھنا چاہیے کہ خواتیم آیات دراصل تمام آیت کے مطالب و معانی کا مغز اور لب لباب ہوتے ہیں، افسوس ہی کہ مفسرین نے اس موضوع کی طرف بالکل توجہ نہ کی، اور ایک اہم ترین باب اب تک بند کا بند ہی رہا، کم ترک الاوّل للآخر۔

تبلیغ و دعوت

(۱۵۹) اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا	وہ لوگ جو ان صاف حکموں اور ہدایت کی باتوں کو چھپاتے ہیں بعد اس کے کہ ہم نے انہیں نازل کیا

بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ۝ (۱۶۰) اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ (۱۶۱) اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝ (۱۶۲) خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ۝	اور کتاب میں لوگوں کو صاف صاف سمجھا دیا، ان پر خدا لعنت کرتا ہے اور سب لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں مگر جن لوگوں نے توبہ کی اور اپنی حالت درست کرلی، اور صاف صاف بیان کر دیا، تو اُن کی توبہ ہم قبول کرتے ہیں، اور ہم بڑے قبول کرنے والے مہربان ہیں، البتہ جن لوگوں نے انکار کیا اور انکار ہی کی حالت میں مر گئے تو ان پر خدا کی لعنت اور فرشتوں اور آدمیوں کی سب کی، وہ ہمیشہ اسی لعنت ہی میں رہینگے، نہ تو ان سے عذاب ہی ہلکا کیا جائیگا اور نہ ان کو مہلت دیجائیگی۔

یہ وہ اخلاق ہیں جن کو ہر مذہب و ملت میں تسلیم کیا جاتا ہے، کتاب الٰہی میں ان کے بیان کرنے سے مقصد یہی ہے کہ ان کی نشر و اشاعت ہو، اور لوگ ان سے فائدہ حاصل کریں، مگر جو بدبخت ان کی تبلیغ و دعوت سے گریز کرتے ہیں، ان کی مثال اس شخص کی ہے جو جنگل میں پانی کے ایک شیریں چشمہ پر قابض ہے مگر نہ تو انسان کی تشنہ لبی کو دور کرتا ہے اور نہ کسی جانور کو اپنی پیاس بجھانے دیتا ہے، ایسے شخص پر زمین و آسمان کی ہر چیز لعنت کریگی، یہی حال ان ارباب علم کا ہوگا جو اپنے علم کو چھپاتے ہیں، حالانکہ ان سے وعدہ لیا گیا تھا کہ وہ اس کی نشر و اشاعت میں مصروف ہو جائیں گے، اہل کتاب کی سب سے بڑی خرابی یہی تھی کہ وہ دعوت و ارشاد کے فرض کو ترک کر چکے تھے: واذ اخذ اللہ میثاق الذین اوتوا الکتٰب لتبیننہ للناس ولا تکتمونہ فنبذوہ وراء ظھورھم واشتروا بہ ثمنا قلیلا فبئس ما یشترون (۳: ۱۸۴) شارع علیہ السلام کو یہی حکم دیا گیا: وانذر عشیرتک الاقربین، اور قم فانذر و ربک فکبر، قرآن کا

کا نزول اسی لئے ہوا کہ اس کی نشر و اشاعت ہو واوحی الی ھذا القرآن لانذرکم به ومن بلغ (۶ : ۱۹) رسول کو لسان الٰہی نے ان الفاظ میں خطاب کیا: یاایھا الرسول بلغ ما انزل الیك من ربك، وان لم تفعل فما بلغت رسالته (۵ . ۷۱)

ان تمام آیات سے معلوم ہوا کہ تبلیغ و دعوت رسول اور اس کے جانشینوں کا فرض ہے، اگر جو اس مقصد حیات کو ترک کر دینگے، وہ اللہ کی رحمت سے دور ہو جائینگے ملائکۃ الرحمٰن سے دوری نصیب ہوگی، اور اس طرح خیر و صلاح سے یک قلم الگ ہو جائینگے، کیونکہ نیکی کا الہام فرشتوں ہی کی طرف سے ہوتا ہے، اور عام لوگوں کے دلوں میں ان کے لئے بغض و عداوت کے جذبات پیدا ہونگے۔[۱]

---

[۱] امت مسلمہ کے علماء و مشائخ ان آیات میں درس و فکر سے کام لیں کہ تبلیغ و دعوت پر کتنا زور دیا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔ وما اجتمع قوم فی بیت من بیوت اللہ یتلون کتاب اللہ و یتدارسونه بینھم الا نزلت علیھم السکینة وغشیتھم الرحمة وحفتھم الملٰئکة وذکرھم اللہ فی من عنده، اور جب ایک قوم مسجد میں اس لئے آتی ہے کہ قرآن حکیم کی تلاوت کرے، اور اس کے درس و افہام کو اختیار کرے تو اس پر اللہ کی سکینت و رحمت نازل ہوتی ہے، ملائکہ اپنی خیر و برکت میں انہیں لے لیتے ہیں، اور ملاء اعلیٰ میں ان کا ذکر ہوتا ہے۔ ترمذی نے ابن مسعود سے اور دارمی نے ابو درداء سے روایت کی کہ نضر اللہ امراء سمع منا شیئا فبلغه کما سمعه فرب مبلغ اوعیٰ له من سامع، خدا اس شخص کو خوش رکھے جس نے ہم سے کچھ سنا، اور اس کی پوری پوری اشاعت کی، اس لئے کہ بہت سے سننے والے داعی سے زیادہ سمجھدار ہوتے ہیں، اور وہ زیادہ نفع حاصل کرتے ہیں۔ دارمی نے حسن سے مرسلاً روایت کیا ہے کہ من جاءہ الموت وھو یطلب العلم لیحیی به الاسلام فبینه وبین النبیین درجة واحدة فی الجنة، جو شخص اس حال میں مرگیا کہ احیاء و تجدید ملت کے لئے علم دین حاصل کر رہا تھا تو اس میں اور نبیوں میں درجات کے اعتبار سے جنت میں صرف ایک ہی درجہ کا فرق ہوگا۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ کے سامنے بنی اسرائیل کے دو شخصوں کا ذکر کیا گیا، ایک وہ تھا جو صرف فرائض نماز ہی ادا کرتا اور باقی اپنا تمام وقت تبلیغ و دعوت میں صرف کرتا اور دوسرا صائم الدہر اور قائم اللیل تھا، لوگوں نے آپ سے دریافت کیا کہ ان دونوں میں سے افضل کون ہے؟ آپ نے فرمایا: فضل

اب تک انفرادی حیثیت سے تہذیب اخلاق کی تعلیم دی گئی تھی، مگر ظاہر ہے کہ حقیقت میں یہ کوئی زندگی نہیں، زندگی اگر ہے تو اجتماعی، اسی لئے نبی عربی نے ہمیشہ حیات

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۵) هذا العالم الذی یصلی المکتوبة ثم یجلس فیعلم الناس الخیر علی العابد الذی یصوم النهار ویقوم اللیل کفضلی علی ادناکم، وہ عالم جو فرض نماز پڑھنے کے بعد لوگوں کی تعلیم میں مصروف ہوتا ہے اس عابد کے مقابلہ میں جو صائم الدہر اور قائم اللیل ہے ایسا ہی بزرگی اور شرافت میں اعلی ہے جیسے میری فضیلت و برتری تم میں سے ادنی ترین پر ہے، عبد اللہ بن عمرو کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مسجد میں گئے تو دیکھا دو گروہ ہیں فرمایا دونوں نیکی میں مصروف ہیں مگر ایک دوسرے سے افضل ہے، جو لوگ اللہ کے ذکر میں مصروف ہیں، اور اس کی طرف توبہ وانابت کر رہے ہیں اخدا کی مرضی پر موقوف ہے انہیں کچھ نوازش کرے یا کچھ بھی نہ دے، واما هولاء فیتعلمون الفقه او العلم ویعلمون الجاهل فهم افضل مگر یہ لوگ دوسروں کو فقہ اعلم کی باتیں سکھاتے ہیں اور جاہلوں کو تعلیم دیتے ہیں، یہ ان سے افضل و اعلی ہیں، پھر فرمایا انما بعثت معلما ثم جلس فیهم کہ میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں، اور انہی کے درمیان بیٹھ گئے۔

حضرت عمر بن عبد العزیز نے ابوبکر بن حزم، مدینہ کے قاضی کو لکھا:

انظر ما کان من حدیث رسول الله صلی الله علیه وسلم فاکتبه فانی خفت دروس العلم وذهاب العلماء ولا تقبل الا حدیث النبی صلی الله علیه وسلم ولیفشوا العلم ولیجلسوا حتی یعلم من لا یعلم فان العلم

دیکھو جو آپ کی حدیثیں تمہیں ملیں ان کو لکھ لو کیونکہ مجھے علم دین کے مٹنے اور علما کے چل بسنے کا خوف ہے، اور صرف حدیث ہی قبول کرنا کسی اور کا قول نہ ہو، علما کا فرض ہے کہ وہ اشاعت علم میں مصروف ہوں، تعلیم دینے میں لگ جائیں تاکہ جاہل علم حاصل کریں، اس لئے کہ جہاں علم پوشیدہ ہوا اور وہ

اجتماعی پر زور دیا، مگر قوم ہمیشہ افراد سے بنتی ہی اس لئے ضروری تھا کہ پہلے فرداً فرداً ہر ایک شخص میں صحیح کیرکٹر پیدا کر دیا جائے تاکہ آیندہ چلکر قومی عمارت محکم و استوار ہو جب اس سے فراغت ہو گئی تو اجتماعی زندگی کی طرف توجہ کی، یہاں آکر انسانوں کے ایک دوسرے سے تعلقات و روابط قائم ہوتے ہیں، نکاح کی بنا پر اولاد پیدا ہوتی ہی، ان تمام کی ضروریات زندگی کا بہم پہونچانا اور بچوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام باپ کے ذمہ عائد ہوتا ہی، گھر دراصل ایک چھوٹی سی حکومت ہی جس میں نظم و نسق اور عدل و انصاف کی ضرورت ہی، ان تمام امور پر اس باب میں بحث ہوگی۔

ضایع ہو گیا۔	لا یھلک حتی یکون سرا۔

علما کا فرض تو یہ ہی تھا کہ وہ اپنی تمام عمر اسی فرض جلیل میں صرف کرتے مگر ان بدبختان ملت نے کتاب وسنت کی ان تصریحات کی پروانہ کی اور علم کو چھپانا شروع کر دیا، اور اب تو دعوت و ارشاد میں ایک عالم بھی مصروف نہیں، فیا للاسف ویا للعار کیا ان علمائے سو کو یاد نہ رہا کہ من سئل عن علم فکتمہ الجمہ اللہ یوم القیامۃ بلجام من نار جس عالم سے کوئی بات دریافت کی گئی اور با وجود جاننے کے اس نے بتانے سے گریز کیا تو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کے منہ میں آگ کی لگام ڈالیگا۔ بیشک اس صادق و مصدوق نے سچ فرمایا تھا کہ الا ان شر الشر شرار العلماء کہ بدترین خلائق اور شر البریہ یہی عالم ہیں جو اپنے علم کی نشر و اشاعت سے غافل ہیں، بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت علی علیہ السلام سے روایت کی کہ علماءھم شر من تحت ادیم السماء من عندھم تخرج الفتنۃ وفیھم تعود اس آسمان کی چھت کے نیچے جو کچھ ہے، اسمیں بدترین یہی علما رہیں کہ یہی فتنہ و فساد کے بانی ہونگے، اور پھر انہی پر ہر قسم کی مصیبت نازل ہوگی،

علامہ ابن تیمیہ، اپنی کتاب مدارج السالکین میں اسی تبلیغ و دعوۃ کی حقیقت پر ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں:-

المرتبہ السادسۃ مرتبۃ البیان العام چھٹے درجہ میں بیان عام کا شمار ہوگا جس کا منشا یہ ہی

وھو تبیین الحق وتمیزہ من الباطل بادلتہ وشواھدہ واعلامہ بحیث یصیر مشھوداً للقلب کمشھود العین لمرئیات وھذہ المرتبۃ ھی حجۃ اللہ علی خلقہ التی لا یعذب احداً	کہ دلائل و براہین اور شواہد و اعلام کے ذریعہ حق و باطل میں ایسی تمیز کر دیجائے کہ قلب ان میں ایسے ہی فرق و امتیاز کر سکے جیسے آنکھ، اسی تبلیغ و ارشاد کے بعد اللہ کی حجت قائم ہوتی ہی اور اسی سے انکار و جحود عذاب کا

جب ثانی زندگی شروع ہوتی تو سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ روزی کمانے کی صورت کیا ہو، اور روپیہ کس طرح حاصل کیا جائے، اس لئے سب سے پہلے ان ذرائع و وسائل کو بیان کیا جائے گا جن سے روپیہ مل سکے۔

دولت کمانے کے ذرائع

(۶۳) وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ج لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ہ	اور تمہارا معبود تو وہی ایک خدا ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، رحمٰن ہے رحیم ہے۔

اسلام کا یہ ناز اور سرمایہ افتخار مسئلہ توحید کا ہے جس کی وجہ سے وہ مذاہب و ادیان عالم سے ممتاز و نمایاں ہے، وہ زندگی کے ہر شعبہ میں توحید خالص دیکھنے کا متمنی ہے، اسلئے تہذیب اخلاق سے لیکر سیاست کبریٰ تک ہر جگہہ اس کی حفاظت الزم اللوازم ہوگی، تدبیر منزل میں گو [illegible] ہے، کھانے کمانے کے مسائل ہیں مگر یہاں بھی اس حبل اللہ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور سب سے پہلے اسی کی تعلیم دی، اور بتا دیا کہ اسی کی ذات اقدس تمہاری تمام ضروریات زندگی کی ذمہ دار و کفیل ہے، وما من دابة فی الارض الا علی اللہ رزقها (۱۱: ۸) پس یہ نہ ہو کہ اگر کسی وقت کوئی دقت پیش آئے تو غیر اللہ سے طالب اعانت ہو،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۷) ولا یفعله الا بعد وصولهم الیهم هذا البیان هو الذی بعثت به الرسل وحملة الیهم والی العلماء بعد هم وبعد ذلك [illegible] الله من یشاء۔	باعث ہوتا ہے، اسی کی خاطر انبیاء کی بعثت ہوئی، اور یہی فرض پیکے بعد دیگرے علمائے امت کے ذمہ عاید ہوتا رہا۔

حضرت شاہ ولی اللہ اپنی عدیم النظیر کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

امہ المجازات [illegible] الرابع فلا یکون الا بعد بعثة الانبیاء وکشف الشبهة وصحة التبلیغ لیهلك من هلك عن بینة ویحیی من حی عن بینة	مجازات کی چوتھی صورت یہ ہے کہ انبیاء مبعوث ہوں، مخالفین کے شبہات دور کئے جائیں صحیح معنی میں تبلیغ ہو تاکہ جو ہلاک ہو حجت قائم ہونیکے بعد اور جو زندہ رہے وہ دلائل و براہین سے اطمینان حاصل کرے

اسوقت ہمارے عالموں کی جو حالت ہے وہ صاف بتا رہی ہے کہ ان میں یہودیوں کی مغضوبیت اور نصاریٰ کی ضلالت آ گئی ہے، کتاب اللہ ان کے وراء ظهورهم ہے، فویل لهم ثم ویل لهم۔

نہیں اسی کی طرف توجہ ہو اور اسی کے آگے دست سوال دراز ہو،
اس قدر تمہید کے بعد اب دولت کمانے کے ذریعوں کی تفصیل آتی ہے:

(۲: ۱۶۴) إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِن مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِيفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ لَآيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝

بیشک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کی آمد و شد میں اور جہازوں میں جو آدمیوں کے نفع کی چیزیں لیکر سمندر میں چلتے ہیں اور بارش میں جس کو اللہ آسمان سے نازل کرتا اور زمین کو اسکے خشک ہونے کے بعد شاداب کردیتا ہے اور حیوانات میں جو زمین میں پھیلا رکھے ہیں اور ہواؤں کے پھیرنے میں اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان گھرے رہتے ہیں غرض ان سب میں ان لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں نشانیاں ہیں۔

اسلام کی تعلیم صرف احسان و تصوف اور رہبانیت کے لئے نہیں نازل کی گئی بلکہ اس کی اصلی غرض یہ ہے کہ اس کی وجہ سے شہداء علی الناس کا درجہ حاصل ہو اور کنتم خیر امۃ اخرجت للناس کی عزت نصیب ہو، وہ صرف حکومت و سرفرازی کے لئے ہے، اس لئے دولت کمانا اس کے اصول اساسی میں سے ہے، اس نے مال کو خیر سے تعبیر کیا: یسئلونک ماذا ینفقون، قل ما انفقتم من خیر (۲: ۲۱۵) اس نے دولت کو امتوں اور ملتوں کے قیام کا باعث بتایا: ولا تؤتوا السفھاء اموالکم التی جعل اللہ لکم قیاما (۴: ۳) پھر اس نے بار بار انفاق فی سبیل اللہ و صدقات و خیرات پر زور دیا، البتہ اس کے لئے حدود اور قوانین ہیں جو اپنی جگہ پر بیان کئے گئے ہیں، ظاہر ہے کہ دولت کمانا کسی شریف انسان کا مقصد حیات نہیں ہو سکتا، بلکہ اسے ایک وقت کے [illegible] میں صرف [illegible] اس کی انتہائی غرض ہونی چاہئے۔

سب سے پہلے انسان کی صدہا ضرورتیں بتایا، [illegible] آسمان کی پیدایش اور اختلاف

لیل و نہار سے پوری ہوتی ہیں، پانی کے شیریں چشمے جنگلوں اور پہاڑوں میں تشنہ لبوں کی سیرابی کا باعث ہوتے ہیں، درختوں کی ٹہنیاں میووں کے بوجھ سے جھکی جاتی ہیں، ان چیزوں کی پیداوار میں انسانی کوشش کو دخل نہیں، بلکہ قدرت خود بخود مہیا کر رہی ہے، اور موسم کے تغیر و تبدل نے ان کے پورا کرنے کا ذمہ لے رکھا ہے۔ سورۂ نحل میں فرمایا: هوالذی انزل من السماء ماء لکم منه شراب ومنه شجر فیه تسیمون ○ ینبت لکم به الزرع والزیتون والنخیل والاعناب ومن کل الثمرات ؕ ان فی ذلك لاٰیة لقوم یتفکرون (۱۶: ۱۰ و ۱۱) وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا جس میں سے کچھ تمہارے پینے کا ہے، اور اس سے درخت پرورش پاتے ہیں جنہیں تم اپنے مویشیوں کو چراتے ہو، اسی پانی سے خدا تمہارے لئے کھیتی اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر طرح کے پھل پیدا کرتا ہے جو لوگ سوچ سمجھ کو کام میں لاتے ہیں ان کے لئے اس میں ایک نشانی ہے۔

پھر جہازوں اور کشتیوں کے لئے بحری تجارت کے راستے کھلے ہیں، سورۂ روم میں فرمایا: ولتجری الفلك بامره ولتبتغوا من فضله (۳۰: ۴۶) سورۂ جاثیہ میں آیا: الله الذی سخر لکم البحر لتجری الفلك فیه بامرہ ولتبتغوا من فضله (۴۵: ۱۲) ایک جگہ کہا: وعلی الفلك تحملون (۲۳: ۲۲) ان تمام آیات میں بتایا کہ کشتیوں کے ذریعہ تم دریاؤں اور سمندروں میں تجارت کر کے اللہ کا فضل تلاش کرو،

زمین جب امساک باراں کی بنا پر مردہ ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ بارش نازل کرتا ہے، اور مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے، والله انزل من السماء ماء فاحیا به الارض بعد موتها (۱۶: ۶۵) ایک موقعہ پر یوں ارشاد ہوا: وما انزل الله من السماء من فاحیا به الارض بعد موتها (۴۵: ۴) تو زمین کی زندگی سے مراد یہ ہے کہ لوگ اس میں کاشتکاری کر سکیں، اور وہ زراعت کے قابل بن جائے، گویا اس آیت میں بتا دیا کہ زراعت اور کھیتی باڑی بھی رزق کمانے کا ایک ذریعہ ہے۔

جانور کثرت سے زمین میں پھیلائے گئے ہیں، دوسری جگہ اس کی اغراض پر بحث کی منجملہ ان کے ایک بات یہ بھی ہے کہ۔ وتحمل اثقالکم الیٰ بلد لم تکونوا بالغیہ الا بشق الانفس (۱۶ : ۷) اور جن شہروں تک تم بے جان کاہی نہیں پہنچ سکتے، چار پائے وہاں تک تمہارے بوجھ اٹھا کر لے جاتے ہیں، علاوہ اس کے ایک مصلحت یہ بیان کی: والانعام خلقہا لکم فیہا دفء ومنافع ومنہا تاکلون (۱۶ : ۵) اور اسی نے چار پایوں کو پیدا کیا جن میں تم لوگوں کی زینت ہے، اور فائدے ہیں، اور ان میں سے تم کھاتے ہو، اس میں جانوروں کی تجارت سے فائدہ اٹھانے کی تعلیم دی۔

ہواؤں کا تغیر و تبدل خود ایک حقیقت کی طرف راہ نمائی کرتا ہے مگر صرف ارباب عقل وخرد ہی اس کی جانب توجہ کر سکتے ہیں، سورہ جاثیہ میں آیا: وتصریف الریاح اٰیت لقوم یعقلون (۴۵ : ۴) آج ہم اپنے گرد و پیش نگاہ دوڑائیں تو معلوم ہوگا کہ دنیا ہوا سے کیا کیا کام لے رہی ہے، اور علوم و معارف کے ذریعہ اس کو کس طرح اپنے تابع فرمان بنا لیا ہے۔

آسمان و زمین کے درمیان جس قدر بادل نظر آتے ہیں، وہ سب انسانوں کے مطیع و فرمانبردار ہیں کہ صاحبان دانش و بینش اٹھیں، اور ان سے قوت برقی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

اللہ تعالے نے انسانوں میں ضروریات پیدا کیں، اسی کے ساتھ ساتھ اسباب و وسائل بھی بہم پہونچا دیئے، پھر ان سے فائدہ حاصل کرنے اور ان کو اپنی ضروریات میں لانے کے لئے عقل نوازش کی، دولت کمانے کے ان قدرتی ذریعوں کو چھوڑ کر دوسری طرف متوجہ ہونا عقل والوں کا کام نہیں۔

غیر اللہ کی غلامی

(۱۶۵) وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ	اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے سوا اوروں کو بھی اس کا شریک بناتے ہیں، اور ان سے ایسی محبت رکھتے

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ط وَلَوْ یَرَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ اَنَّ الْقُوَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا لا وَّاَنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعَذَابِ۝

ہیں جیسی محبت خدا سے رکھنی چاہیے، اور جو ایمان والے ہیں انہیں اللہ کے ساتھ بہت محبت ہی، اور اگر یہ ظالم عذاب دیکھنے کے وقت جس بات کو سمجھینگے اب سمجھ جاتے کہ سب قوت اللہ ہی کی ہی، اور اللہ کا عذاب بڑا سخت ہی (تو کیا اچھا ہوتا)۔

انسان کو چاہیے تو یہ تھا کہ وہ ان خزائن قدرت میں غور کرتا، ان سے کام لیتا، اور اپنی ضروریات پوری کرتا، اگر بالفرض رزق کمانے میں کوئی دقت محسوس ہوتی، تو اُسے برداشت کرتا، مگر بعض بدبختوں کی یہ کیفیت ہوتی ہی کہ اللہ سے علاحدہ ہوکر غیروں سے اپنا رشتہ جوڑ لیتے ہیں، دوسروں کو اپنا رازق اور مربی خیال کرنے لگ جاتے ہیں، انکی غلامی و محکومی کو اپنے لئے باعث عزت سمجھتے ہیں، ان کے آگے خاک مذلت پھانکتے ہیں، اور اس طرح اپنی تمام عمر صرف کر دیتے ہیں، مگر ایک مسلمان کی شان اس سے کہیں زیادہ رفیع و بلند ہی، اس کی گردن اللہ کے سوا کسی کے آگے نہیں جھک سکتی، بلکہ اسے جس قدر تکلیف ہوگی اس کے عشق خداوندی میں اور زیادہ اضافہ ہوگا۔

ارباب ایمان اس حقیقت سے خوب واقف ہیں کہ انجام کار یہی صحیح تعلیم کام آئیگی، اور دنیا و آخرت میں صرف اسی شخص کو آرام نصیب ہو سکتا ہی جو اس قانون کا پابند ہو، یہی وجہ ہی کہ وہ تکلیفوں اور مصیبتوں کو برداشت کر لیتے ہیں مگر غیر اللہ کے آگے ان کی گردن نہیں جھکتی، البتہ جو لوگ مشرکانہ رسوم کے پابند ہیں، راہ حق میں ذراسی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتے، مگر ایک وقت ایسا آئیگا جب وہ تمام قوتیں بیکار ثابت ہونگی جن پر اُنہوں نے اعتماد کیا تھا، اس وقت انہیں معلوم ہوگا کہ ان قوتوں پر اعتماد کرنا سخت غلط کاری تھی، مگر اب یہ ندامت کس کام آئیگی۔ لمن الملک الیوم، للہ الواحد القہار، یوم لا ینفع مال ولا بنون الا من اتی اللہ بقلب سلیم، جس دن کی نسبت یہ خبر دی گئی ہی، یوم یفر المرء من اخیہ۝ وامہ وابیہ۝ وصاحبتہ وبنیہ۝

لکل امرئ منھم یومئذ شان یغنیہ ،

(۱۶۶) اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِہِمُ الْاَسْبَابُ (۱۶۷) وَقَالَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا کَرَّۃً فَنَتَبَرَّاَ مِنْھُمْ کَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ۭ کَذٰلِکَ یُرِیْہِمُ اللّٰہُ اَعْمَالَھُمْ حَسَرٰتٍ عَلَیْہِمْ ۭ وَمَا ھُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنَ النَّارِ ؀

جبکہ وہ لوگ جن کے کہنے پر دوسرے چلتے تھے ان لوگوں سے بالکل الگ ہوجائینگے جو انکے کہنے پر چلتے تھے، اور اپنی آنکھوں سے عذاب دیکھ لینگے، اور تمام باہمی تعلقات ٹوٹ جائینگے اور یہ تابع لوگ یوں کہینگے کاش ہمیں ایک دفعہ جانا مل جائے تو ہم بھی ان سے صاف الگ ہوجائینگے جس طرح یہ ہم سے الگ ہوگئے، یوں اللہ ان کے اعمال کو انہیں سراسر موجب حسرت دکھائیگا، اور اُن کو دوزخ سے نکلنا کبھی نصیب نہ ہوگا۔

دنیا کی زندگی میں بارہا تجربہ ہوتا ہی کہ ایک جھوٹے انسان کی تقلید آنکھیں بند کرکے شروع کی جاتی ہی، حکومت کے آگے اندھا دھند سجدہ کیا جاتا ہی، مگر عین وقت پر آکر انہیں سے کوئی چیز بھی کام نہیں آتی، ہر ایک اپنی برارت وپاک دامنی کا اظہار کرتا ہی، اور وہ شخص بے یار ومددگار رہ جاتا ہی، یہ تو دنیا کا حال تھا، قیامت کی کیفیت اس سے زیادہ درد انگیز ہی، جن لوگوں کو آج خدا بنایا جارہا ہی، ان کے سامنے نذر ونیاز پیش کی جاتی ہی، مرنے پر ان کی قبروں کے گرد طواف کیا جاتا ہی، اور انہیں سجدہ گاہ بنالیا جاتا ہی، وہ اس روز صاف صاف کہدینگے کہ ہم نے ان سے اپنی عبادت کے لئے کبھی نہیں کہا، جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قیامت کے روز سوال ہوگا کہ کیا تم نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اپنا معبود بنالو تو وہ جواب دینگے: ماقلت لھم الا ما امرتنی بہ ان اعبدوا اللہ ربی وربکم (۵: ۱۱۷) یہ تو ایک پیغمبر معصوم کا حال تھا، اب ان معبودان باطل کی کیفیت ملاحظہ ہو: ویوم یحشرھم وما یعبدون من دون اللہ فیقول ء انتم اضللتم عبادی ھؤلاء ام ھم ضلوا السبیل ؀ قالوا سبحٰنک ما کان ینبغی لنا ان نتخذ من دونک من اولیاء ولکن متعتھم واٰباءھم حتی نسوا الذکر ج وکانوا قوما

بو را ، (۲۵ : ۱۸ و ۱۹) اور جس دن خدا کافروں کو اور ان معبودوں کو جن کو یہ لوگ خدا کے سوا پوجتے ہیں اپنے حضور میں جمع کریگا، پھر پوچھیگا کہ کیا میرے ان بندوں کو تم نے گمراہ کیا تھا یا یہ آپ ہی رستے سے بھٹک گئے؟ ان کے معبود عرض کرینگے کہ تو پاک ہی ہم کو یہ بات کسی طرح زیبا ہی نہ تھی کہ تیرے سوا اپنے لئے دوسرے کارساز بناتے، بلکہ بات یہ تھی کہ تونے ان کے بڑوں کو آسودگیاں دیں یہاں تک کہ تیری یاد بھلا بیٹھے، اور یہ آپ ہی ہلاک ہونے والے لوگ تھے۔

جب ان مشرکین کے اسباب شفاعت ناکام ثابت ہونگے تو غصہ و انتقام کے مارے دنیا میں دوبارہ جانے کی کوشش کرینگے کہ ان معبودان باطل سے اپنی علیحدگی کا اظہار کرسکیں، مگر بے سود۔

صرف کرنے کا قانون

روپیہ کما لیا، اب بتایا جاتا ہی کہ اس کے صرف کرنے کا صحیح موقعہ و محل کونسا ہی؟

(۱۶۸) يَآيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ، (۱۶۹) اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْۗءِ وَالْفَحْشَاۗءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○	لوگو! زمین کی چیزوں میں سے جو حلال طیب ہیں کھاؤ اور شیطان کے قدم بقدم مت چلو، وہ تمہارا کھلا دشمن ہی، وہ تم کو بدی اور بیحیائی کی باتوں کی تعلیم دیگا، اور یہ چاہیگا کہ تم اپنی اللہ کی ذمہ وہ باتیں لگاؤ جن کو تم نہیں جانتے۔

مسلمانوں کو خلافت ارضی حاصل کرنا ہی اسلئے انہیں صرف اس چیز کا استعمال کرنا چاہئے، جس کی طہارت و پاکیزگی کا انہیں یقین ہو، جس کو ناجائز ذرائع سے نہ حاصل کیا گیا ہو، اور جس کی قانون الٰہی نے اجازت دیدی ہو، اس مقصد عظیم کے کسب و حصول کے لئے ضرورت ہوگی بہترین دل و دماغ کی، اور یہ ترو تازگی نہیں پیدا ہوسکتی جب تک عمدہ سے عمدہ پاکیزہ اشیاء استعمال میں نہ ہوں، پس دنیا کی ہر اچھی چیز ایک مسلمان

ہی کے لئے پیدا کی گئی ہی کہ کھائے اور حکومت کے لئے تیار رہو۔ البتہ ان چیزوں سے پرہیز لازمی ہی جو روحانی و جسمانی صحت کیلیے مضر ہوں، جن سے جذبات خبیثہ اور اخلاق فاسقہ پیدا ہونے کا اندیشہ ہو اور جن سے ارادوں میں ضعف و کمزوری آجائے، یہ خصوصیت صرف نبی کی تعلیم کو حاصل ہی کہ اس سے انسانی ارادہ میں قوت پیدا ہوتی ہی، اور شیطان ہمیشہ بیحیائی اور بد خلقی کی تعلیم دیتا ہی، جس کا انتہائی نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ نبی کی تعلیم سی نفرت ہو جاتی ہی، رسول کی شان میں گستاخانہ الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں، خواہشات نفسانی کو پورا کرنے کے لئے قانون بنایا جاتا ہی اور اس کو اللہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہی۔

(۱۷۰) وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَاۗؤُھُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَـيْــــًٔـا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (۱۷۱) وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِىْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَاۗءً وَّنِدَاۗءً ۭ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ○	اور جب ان سے کہا جاتا ہی کہ جو حکم خدا نے اتارا ہی اسپر چلو تو کہتے ہیں نہیں ہم تو اسی پر چلینگے جس پر اپنے بڑوں کو چلتے پایا، اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ عقل رکھتے ہوں، اور نہ راہ راست پر ہوں، اور ان کافروں کی مثال اس شخص کی سی ہی کہ جو ایک ایسے جانور کے پیچھے چلا رہا ہی جو سوائے بلانے اور پکارنے کے کوئی بات نہیں سنتا، یہ کافر بہرے، گونگے اور اندھے ہیں، سو کچھ نہیں سمجھتے۔

جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہی کہ صرف کرنے میں نبی کے قانون کا اتباع کرو، تو کہتے ہیں کہ ہم اپنے باپ دادا کی رسم کو کبھی نہ چھوڑینگے، اگر ان کی تقلید نہ کی تو خاندان بھر میں ناک کٹ جائیگی، حالانکہ اگر ذرا غور سے کام لیتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ ان رسموں میں نہ تو عقل و دانائی کی کوئی بات ہی، اور نہ ان سے کسی شخص کو رشد و ہدایت نصیب ہو سکتی ہی، جب وہ خود ہی فہم و تدبر سے محروم تھے تو دوسروں کو ان کی تقلید سے کیا نفع مل سکتا ہی، جو لوگ تعلیم قرآن سے اعراض کرکے ان رسوم کی پابندی کا دم بھرتے ہیں، ان جانوروں کی طرح ہیں جن کو ایک شخص پیچھے سے آواز دے رہا ہو، اور یہ سوائے آواز کے

اور کچھ نہ سمجھیں، اولئک کالانعام بل هم اضل،

نعق اس آواز کو کہتے ہیں جس سے چرواہا بکریوں کو بلاتا ہے، یہاں ناعق تو حضور اقدس ہیں اور تمام کفار جانور ہیں جو آپ کی آواز سننے کے باوجود اس میں غور سے کام نہیں لیتے۔[ل]

ل جن لوگوں نے اندھی تقلید کی زنجیریں اپنے پاؤں میں ڈال رکھی ہیں جو دنیا کو ان پابندیوں سے آزاد کرنے آئے تھے، مگر اب خود ان اغلال و سلاسل کو پہنے ہوئے ہیں، جن کے نزدیک فقہ کی چند جزئیات وحی والہام سے بڑھ کر ہیں، جو اماموں کے اقوال کے ہوتے ہوئے صحیح احادیث کو پائے استغنا سے ٹھکرا دیتے ہیں، جن کے نزدیک بیضاوی وجلالین اور دوسرے مفسرین کے اقوال کا یاد رکھنا ہی سب سے بڑی قرآن دانی اور تفقہ فی الدین ہے، جو صرف فقہا، ومشائخ کے جزئیات ہی سے استدلال کرنا اپنے لئے مایۂ ناز وسرمایہ افتخار سمجھتے ہیں، وہ ان آیات میں غور وفکر سے کام لیں، جن ائمہ عظام کی تقلید کا آج دعوی کیا جاتا ہے خود ان کی یہ کیفیت تھی کہ اپنی کورانہ تقلید سے روکتے تھے، مزنی نے امام شافعی کا قول نقل کیا ہے کہ وہ اپنی اور دوسروں کی تقلید سے روکتے تھے، امام ابوحنیفہ نے فرمایا: لاینبغی لمن لم یعرف دلیلی ان یفتی بکلامی جو شخص میرے دلائل سے واقف نہیں وہ میرے مذہب پر فتوی نہیں دے سکتا، جب کبھی امام ابوحنیفہ کوئی فتوی دیتے تو کہہ دیا کرتے کہ یہ نعمان بن ثابت کی رائے ہے، اگر کسی کے پاس اس سے بہتر جواب ہو تو وہ احق بالقبول اور اولی بالصواب ہے: وکان رضی اللہ عنہ اذا افتی یقول هذا رای النعمان بن ثابت یعنی نفسه وهو احسن ما قدرنا علیه فمن جاء باحسن منه فهو اولی بالصواب،

امام مالک کا یہ قول آب زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ: ما من احد الا وهو ماخوذ من کلامه ومردود علیه الا رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم، آپ کے سوا ہر شخص سے اسکے اقوال کی بازپرس ہوگی، حاکم اور بیہقی نے امام شافعی کا یہ قول نقل کیا ہے: اذا صح الحدیث فهو مذهبی، ایک روایت میں اسطرح آتا ہے: اذا رایتم کلامی یخالف الحدیث فاعملوا بالحدیث واضربوا بکلامی الحائط، اگر میرا کوئی مسئلہ حدیث کے مخالف ہو تو اُسے دیوار پر دے مارو اور حدیث پر عمل کرو، امام احمد فرماتے تھے: لا تقلدنی ولا تقلدن مالکا ولا الاوزاعی ولا النخعی ولا غیرهم، نہ تو میری تقلید کرو اور نہ مالک اوزاعی، نخعی اور کسی دوسرے کی تقلید کرو، امام ابوحنیفہ نے فرمایا: اذا قلت قولا وکتاب اللہ یخالفه

(۱۷۲) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ (۱۷۳) إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ ۖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○

مسلمانو! جو طیب چیزیں ہم نے تم کو دے رکھی ہیں ان میں سے کھاؤ، اور اللہ کا شکر کرو اگر تم اسی کی غلامی کرتے ہو۔ اس نے تو تم پر صرف مردہ جانور، اور خون، اور سور کا گوشت حرام کیا ہے، اور وہ جانور بھی جسکو اللہ کے سوا کسی اور کے لئے نامزد کیا گیا ہو، پھر جو شخص بیقرار ہو جائے بشرطیکہ عدول حکمی کرنیوالا اور حد سے بڑھ جانے والا نہو تو اسپر کچھ گناہ نہیں ہوتا، بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم والا ہے۔

ایک مسلمان جس نے اپنی ہر چیز خداوند قدوس کے نام پر قربان کر دی ہو، لذت طعام و شراب ہی کو اپنی زندگی کا مقصد نہیں بنا سکتا، بلکہ بہترین چیزیں کھائے، اور خدائے واحد کے سوا اور کسی کے آگے اس کی گردن نہ جھکے، پاکیزہ چیزیں تو بہت کثرت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۶) اتركوا قولي بكتاب الله فقيل اذا كان خبر الرسول صلى الله عليه وسلم قال اتركوا قولي بخبر رسول الله صلى الله عليه وسلم۔ جب میرا کوئی قول کتاب و سنت کے مخالف ہو تو میرے اقوال کو ترک کر کے کتاب و سنت کا اتباع کرو۔

یہ تصریحات ان ائمہ عظام کی ہیں جن کی کورانہ تقلید پر ناز کیا جاتا ہے، جن کے اقوال کو کتاب و سنت پر ترجیح دی جاتی ہے، وہ پکار پکار کے کہہ رہے ہیں کہ کتاب و سنت سے اعتصام و تمسک ہی نجات کا ذریعہ ہے مگر ان لوگوں نے اتخذوا احبارهم ورهبانهم اربابا من دون الله پر عمل کر کے معصوم کی تقلید کو ترک کر کے غیر معصومین کو اپنا امام و مقتدا بنا لیا ہے، دنیا میں علم ہمیشہ آزاد رہا، اور اس نے کبھی کسی کی تقلید نہیں کی، آہ! مسلمانوں نے اس کی آزادی بھی سلب کر لی، اور اپنے دماغوں کو دوسروں کا غلام بنا لیا، پھر اس تقلید کے ہوتے ہوئے نہ تو ان میں اجتہاد و فکر پیدا ہو سکتا ہے، اور نہ حریت رائے۔

سے ہیں اس لئے صرف ان اشیاء کو بیان کیا جاتا ہے جن کا استعمال ممنوع و ناجائز ہے۔

(۱) مردہ، اگر ایک جانور کا ذبح کرنا ضروری تھا اور وہ ذبح کئے بغیر مر گیا تو اس کا گوشت حرام ہوگا، ایسے وحشی جانور جن کے ذبح کرنے پر قدرت نہ ہو، اگر بسم اللہ کہکر تیر یا اور کسی تیز ہتیار سے زخمی کر دیا تو وہ حلال ہوگا، البتہ بندوق کے شکار کو ذبح کرنا ضروری ہے، ٹڈی اور مچھلی کو بغیر ذبح کئے کھانے کی اجازت ہے آپ نے فرمایا: ھوالطھور ماءہ الحل میتتہ، ٹڈی کے متعلق شیخین کی روایت ہے کہ روی عن ابن ابی اوفی قال غزونا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سبع غزوات او ستا وکنا ناکل الجراد ونحن معہ، ابن ابی اوفی کہتے ہیں کہ ہم نے آپ کے ساتھ مل کر چھ یا سات لڑائیاں لڑیں اور ان ایام میں ٹڈی کھاتے رہے۔

مردار کی حرمت پر یہود و نصاریٰ بھی متفق ہیں: اور جو کوئی کسی حیوان کو جو از خود مر گیا ہو یا اسے درندے نے پھاڑا ہو کھاوے تو وہ شخص خواہ تمہارے دیس کا ہو تو وہ پردیس کا وہ اپنے کپڑے دھووے اور پانی سے غسل کرے، اور شام تک ناپاک رہے تب وہ پاک ہوگا، (احبار ۱۷: ۱۵)

(۲) خون، ہر قسم کا خون حرام ہے، لیکن شارع نے جگر اور تلی کو مستثنیٰ قرار دیا ہے، دارقطنی میں ہے، احل لنا من الدم دمان ومن المیتۃ میتتان الحوت والجراد ومن الدم الکبد والطحال،

کتاب احبار میں ہے: اور تم کسی پرندے اور چرندے کا کچھ لہو اپنے سب مکانوں میں نہ کھائیو اور جو انسان کسی خون میں سے کھائیگا وہ اپنی قوم سے کٹ جائیگا، (احبار ۷: ۲۶، ۲۷)

(۳) سور کا گوشت: اور سور کہ کھر اس کے دو حصے ہوتا ہے اور اس کا پاؤں چرا ہے پر وہ جگالی نہیں کرتا، وہ بھی تمہارے لئے ناپاک ہے، (احبار ۱۱: ۷)

شخص نے آپ سے دریافت کیا: ای الصدقة اعظم اجرا، اجر و ثواب کے اعتبار سے بہترین صدقہ کس قسم کا ہی آپ نے فرمایا: ان تصدق وانت صحیح شحیح تخشی الفقر وتامل الغنی ولا تمہل حتی اذا بلغت الحلقوم قلت لفلان کذا ولفلان کذا، و قد کان لفلان، ایسے وقت میں تو صدقہ کرے کہ تندرست و جوان ہو، مال کی محبت دل میں اور فقر کا اندیشہ دماغ میں ہو، اگر جاں کنی کے وقت خیرات کرنی شروع کی تو اس کا کچھ فائدہ نہیں اس لئے کہ وہ خود بخود تقسیم ہو جائیگا۔ ان صدقات و خیرات کے مستحق سب سے پہلے تمہارے عزیز و رشتہ دار ہیں کہ حمیت و عصبیت قومی کی وجہ سے وہ تمہارے دست و بازو بن جائینگے، جہاں تمہارا پسینہ گریگا وہاں وہ اپنا خون بہانے کو تیار ہونگے، قران حکیم نے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کی بہت زیادہ تاکید کی ہر ایک جگہ کہتا ہی: وات ذاالقربی حقه (۱۷: ۲۸) سورہ روم میں فرمایا: فات ذاالقربی حقه والمسکین وابن السبیل ط ذلک خیر للذین یریدون وجه الله زواولئك هم المفلحون، (۳۰: ۳۷) حدیث میں آیا ہی کہ مسکین کو خیرات دینا صرف صدقہ ہی ہوگا مگر ایک رشتہ دار کو خیرات دینے میں دو حیثیتوں سے ثواب ملیگا، ایک صدقہ کے اعتبار سے، دوسرے صلۂ رحمی کی بنا پر۔

یتامیٰ ہیں جن کا کوئی نگراں کار نہیں، اگر ان کی تعلیم کا خیال نہ کیا گیا تو ناتربیت یافتہ کی کثرت قوم کو برباد کردیگی، اور ان کی تھوڑی سی مدد نہایت ہی مفید نتائج پیدا کرے گی، سورۃ الضحیٰ میں فرمایا: اما الیتیم فلا تقهر، مبلغین و دعاۃ کے لئے ضروری ہی کہ وہ سب سے پہلے ایک قوم کے یتامیٰ کو اپنے ہاتھ میں لے لیں، تھوڑی سی تربیت بے انتہا مفید ثابت ہوگی، اور لڑائیوں کی وجہ سے جس قدر یتامیٰ ہونگے قوم کے لئے بار دوش ثابت ہونے کی بجائے بہترین افراد بن جائینگے۔ ان اسرار و مصالح کی بنا پر حامل نبوت نے فرمایا: انا وکافل الیتیم کھاتین،

ان کے علاوہ مساکین، مسافر اور سائل ہیں مسکین سے مراد وہ شخص ہی کہ جو اپنی حاجت دوسروں کے پاس نہیں لیجاتا، اور اس کے ظاہری حالات فقر و تنگدستی کا اظہار کرتے ہیں بلکہ دیکھنے والوں کو اس کے دولت مند ہونے کا شبہ ہوتا ہی، حدیث میں آتا ہی: لیس المسکین الذی تردہ التمرۃ والتمرتان واللقمۃ واللقمتان ولکن المسکین الذی لا یجد غنی یغنیه ولا یفطن له فیتصدق علیه مسکین وہ نہیں جو دربدر بھیک مانگتا پھرتا ہی، بلکہ اس شخص کو مسکین کہتے ہیں جس کے پاس اتنا سامان نہیں کہ اپنی ضروریات پوری کر سکے، اور نہ لوگوں کو اس کی خبر ہی کہ صدقات و خیرات ہی کا مستحق سمجھا جاوے۔

گردنوں کے آزاد کرنے میں روپیہ صرف کرنا بھی ضروری ہی، اگرچہ عام مفسرین نے اس کے معنی کو صرف غلاموں کے آزاد کرنے تک محدود کر دیا ہی، لیکن حقیقت یہ ہی کہ اس کا مطلب عام ہی اور اس کی عمومیت میں نہ صرف غلام ہیں بلکہ وہ لوگ بھی شامل ہیں جو قرض لیکر سود در سود میں مبتلا ہیں، پھر اس سے بھی بڑھ کر اس کا اعلیٰ ترین مفہوم یہ ہی کہ ایک مسلمان جب شہداء علی الناس کی فضیلت کبریٰ کے لئے مخصوص کیا گیا ہی تو اس کا فرض ہی کہ دنیا کی ہر غلام و محکوم قوم کو آزاد کر کے اس کو حق آزادی نوازش کرے، اور یہ حق صرف مسلمان ہی کو پہنچتا ہی۔ اسی کو سورۂ بلد میں مشکل ترین گھاٹی سے تعبیر کیا: فك رقبة (۹۰: ۱۳) پھر اس سے صرف سیاسی آزادی ہی مراد نہیں بلکہ تمدنی، اخلاقی، عمرانی، اجتماعی اور علمی سب افراد غلامی اس میں شامل ہیں، اور سب سے آزاد کرنا فرزند اسلام کا فرض،

یہ نہ ہو کہ اوروں کو تیار کرتے کرتے اپنے آپ کو بھول جاؤ، اور روپیہ خرچ کرنے پر قناعت کر بیٹھو بلکہ خود بھی نماز اور زکوٰۃ کے پابند رہو تاکہ جانی و مالی قربانی کی مشق ہوتی رہے، اسی کے ساتھ پابندی عہد ضروری ہی ورنہ دوسروں کو تمہارے عہود و مواثیق پر اعتبار نہ ہوگا، قرآن نے ایفاے عہد پر بڑا انتہا زور دیا ہی، ایک جگہہ فرمایا: والذین هم لامنتهم وعهدهم راعون (۲۳: ۸) سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا: واوفوا بالعهد ان

العھد کان مسئولا (۱۷ : ۳۶) یہودیوں پر لعنت کے نزول کا سبب نقض عہد کو قرار دیا : فبما نقضھم میثاقھم لعنھم وجعلنا قلوبھم قسیۃ (۵ : ۱۶) نصاریٰ میں بغض و عداوت صرف عہد پورا نہ کرنے کے باعث پھیل گئی : ومن الذین قالوا انا نصٰری اخذنا میثاقھم فنسوا حظا مما ذکروا بہ فاغرینا بینھم العداوۃ والبغضاء الی یوم القیٰمۃ (۵ : ۱۷)

سیاست کے ابتدائی احکام میں یہ چیز بھی داخل ہے کہ خواہ فقر و تنگدستی ہو، علالت و بیماری ہو، خواہ میدان جنگ ہو اور لڑائی کی وجہ سے تکلیفوں اور مصیبتوں کا سامنا ہو، مقصد حیات کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دے، جن لوگوں نے ان فرائض کو اخلاص و حسن نیت سے ادا کیا وہی ارباب صلاح و تقویٰ ہیں، اور وہی دنیا کی امامت و پیشوائی کے مستحق۔

فوجداری قانون

یہ عمومی احکام تھے اب حکومت کی جانب توجہ ہوتی ہے، گھر ایک چھوٹی سی حکومت ہے، جس کا فرمانروا شوہر ہے، بیوی اور بچے اس کی رعایا ہیں، جب کبھی گھر میں لڑائی ہو تو شوہر کا فرض ہے کہ عدل و انصاف سے کام لے، اور اپنی اولاد کو بہترین سیاست کی تعلیم دے، ان کے مناقشات باہمی کا ایسا فیصلہ کرے کہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ملے، اگلی آیتوں میں ایسا قاعدہ کلیہ بیان کیا جاتا ہے جس سے تمام جھگڑے بآسانی طے ہو سکتے ہیں، اور پھر اسی قاعدہ کو ہم وسعت دیکر حکومت کے انتہائی فرائض میں شامل کر سکتے ہیں، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر فسادات ہوتے ہیں، اگرچہ ان کے اسباب بہت کثرت سے ہوں، مگر ان سب کی انتہا دو چیزوں پر ہوتی ہے، یا تو کسی کی عزت و حرمت برباد کرنے کے لئے اس کو ہلاک کیا جاتا ہے، یا مال و دولت کی حرص اس کا سبب بن جاتی ہے، اس لئے قرآن حکیم نے قانون کے دو حصے کر دیئے (۱) فوجداری (۲) دیوانی،

سورۂ بقرہ کے ابتدائی اوراق میں تم پڑھ آئے ہو کہ فرعون نے بنی اسرائیل کی

مختلف جماعتیں بنا دی تھیں، ان کو آپس میں لڑاتا رہتا تھا تاکہ ان کی خانہ جنگی سے اس کی حکومت اور زیادہ محکم ہو جائے، فوجی طاقت کو فنا کرنے کے لئے لڑکوں کو ذبح کرتا اور اس طرح اخلاقی قوت بھی تباہ ہو جاتی، اس صورت میں لڑکیوں کے لئے عصمت فروشی کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا، اعلیٰ سے اعلیٰ مناصب ملکی تو حکمران جماعت کے حصہ میں آتے اور تمام ذلیل ترین عہدوں پر بنی اسرائیل کو مقرر کیا جاتا۔

لیکن قرآن اس طرز حکومت کا شدید ترین دشمن ہے، اس کی تباہی و بربادی کے لئے موسیٰ عمران بھیجا جاتا ہے کہ جمہوریت صالحہ اور حکومت عادلہ کے قیام کے لئے بنی اسرائیل کو تیار کرے، اسلام چاہتا ہے جس طرح شوہر اپنے گھر والوں پر حکمرانی کرتا ہے، ان کی اصلاح و تہذیب اس کا اولین مقصد ہوتا ہے، دن رات ان کی ترقی کی فکر دامنگیر رہتی ہے، اور جب ان میں قابلیت و استعداد دیکھتا ہے تو فوراً ان کے لئے جگہ خالی کر دیتا ہے، ایسے ہی مسلمان اپنے گھروں سے باہر نکلکر قوموں اور ملکوں پر حکومت کرینگے، اس طرز حکومت کا نتیجہ یہ ہوا کہ باوجودیکہ مختلف ممالک میں اب مسلمانوں کی حکومت نہیں رہی مگر ان کا تمدن، ان کی تہذیب، اور ان کی زبان کی ہمہ گیری اب تک وہاں کے آثار باقیہ میں سے ہیں اور باوجود سخت کوشش کے کوئی ہاتھ ان کو مٹا نہ سکا۔

(۱۷۸) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى ۖ الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَىٰ بِالْأُنْثَىٰ ۚ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ۗ ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۗ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۱۷۹) وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ

مسلمانو! مقتولین کے بارہ میں تم پر مساوات لازم کر دی جاتی ہے، آزاد کے بدلے آزاد، اور غلام کے بدلے غلام، اور عورت کے بدلے عورت، پھر جس کو اس کے بھائی سے کوئی حصہ معاف کرایا جائے، تو معقول طور پر مطالبہ کرنا، اور خوبی کے ساتھ اس کے پاس پہنچا دینا، یہ تمہارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے، پھر جس نے اسکے بعد

(۴) ما اھل بہ لغیر اللہ، وہ جانور کبھی حلال نہ ہوگا جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے یا اس کے لئے نامزد کیا گیا ہو، اور اس حرمت میں صرف جانور ہی داخل نہیں ہیں بلکہ ہر نذر و نیاز جو خدا کے سوا دوسرے کے نام پر کی جائے، نووی نے شیخ ابراہیم مروزی شافعی سے نقل کیا ہے کہ اگر کسی حاکم کے آنے پر بطور بھینٹ کے کوئی جانور ذبح کیا جائے تو اگرچہ ذبح کرتے وقت اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو مگر وہ ما اھل بہ لغیر اللہ میں داخل ہو کر حرام ہو جائیگا کذا فی در المختار، تفسیر نیشاپوری میں ہے: اجمع العلماء لو ان مسلما ذبح ذبیحۃ وقصد بذبحھا التقرب الی غیر اللہ صار مرتدا وذبیحتہ ذبیحۃ مرتد، جمہور علماء کی رائے ہے کہ اگر ایک مسلمان غیر اللہ کے تقرب کی خاطر جانور ذبح کرے، تو وہ مرتد ہو جائیگا مسلم میں ہے: لعن اللہ من ذبح لغیر اللہ، اس شخص پر خدا کی لعنت جو غیر اللہ کے لئے ذبح کرے۔ شاہ عبد العزیز دہلوی سے دریافت کیا گیا کہ: کسے گاؤ یا بز یا مرغ بنام کدام شہید یا ولی ذبح نماید چہ حکم است؟ انہوں نے جواب دیا: ذبح کہ آں جانور بنام غیر خدا وند خواہ پیغمبر باشد خواہ ولی خواہ شہید خواہ غیر انسان حرام است، واگر بقصد تقرب بنام اینہا ذبح کردہ باشد، ذبیحہ آں جانور ہم حرام و مردار مے شود و ذبح کنندہ مرتد مے شود، توبہ ازیں فعل منع لازم است،

انسان بالطبع آزاد پیدا کیا گیا ہے، غیر اللہ کے نام پر جانور ذبح کرنا، اور نذر و نیاز دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ اپنی آزادی دوسرے کی خاطر بیچ رہا ہے، حالانکہ یہ حق صرف اللہ کے لئے مخصوص تھا، اللہ تعالیٰ غیور ہے وہ کبھی اس بات کو پسند نہیں کر سکتا کہ اس کا بندہ کسی اور سے بھی تعلق رکھے، اسی لئے کوئی مسلمان ایسے جانور کا گوشت نہیں کھا سکتا، آجکل پیروں اور بزرگوں کے لئے جس قدر منتیں مانی جاتی ہیں سب اسی حرمت میں داخل ہیں۔ اضطراری حالت میں ان چیزوں کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے مگر اس میں دو شرطیں لازم کردی گئی ہیں، انسان خود اس کی خواہش اور آرزو نہ کرے، قانون توڑنا اسکا مقصد

نہ ہو، اور کھاتے وقت اپنی ضرورت سے تجاوز نہ کرے، ایسی صورت میں اس پر کوئی گناہ نہ ہوگا، اور یہ اس کی رحمت ہے کہ گناہ کی چیز سے گناہ اُٹھالیا۔

(۱۷۴) اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ الۡکِتٰبِ وَ یَشۡتَرُوۡنَ بِہٖ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ۙ اُولٰٓئِکَ مَا یَاۡکُلُوۡنَ فِیۡ بُطُوۡنِہِمۡ اِلَّا النَّارَ وَ لَا یُکَلِّمُہُمُ اللّٰہُ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ وَ لَا یُزَکِّیۡہِمۡ ۚۖ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۱۷۵﴾ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اشۡتَرَوُا الضَّلٰلَۃَ بِالۡہُدٰی وَ الۡعَذَابَ بِالۡمَغۡفِرَۃِ ۚ فَمَاۤ اَصۡبَرَہُمۡ عَلَی النَّارِ (۱۷۶) ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ نَزَّلَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ ؕ وَ اِنَّ الَّذِیۡنَ اخۡتَلَفُوۡا فِی الۡکِتٰبِ لَفِیۡ شِقَاقٍۭ بَعِیۡدٍ ﴿﴾

بیشک جو لوگ اللہ کی بھیجی ہوئی کتاب کو چھپاتے ہیں اور اسکے معاوضہ میں تھوڑی سی قیمت لیتے ہیں ایسے لوگ اپنے پیٹ میں آگ کے سوا اور کچھ نہیں بھرتے، اور قیامت کے روز اللہ ان سے کلام نہ کریگا، اور نہ ان کو پاک کریگا اور ان کو دردناک عذاب ہوگا، یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت دیکر گمراہی خریدلی، اور بخشش چھوڑکر عذاب، سو دوزخ کے لئے کیسے باہمت ہیں، یہ اسلئے کہ اللہ نے کتاب کو ٹھیک ٹھیک بھیجا تھا، اور جو لوگ کتاب میں اختلاف پیدا کریں، وہ بہت دور کے خلاف میں ہونگے۔

علمار کا فرض ہے کہ وہ تدبیر منزل کے ان بنیادی اصول وعقائد کو تمام دنیا میں پھیلادیں تاکہ لوگ خانگی زندگی میں قدم رکھتے ہی صراط مستقیم پر چلنے لگیں، اور شرک وبدعت سے پرہیز کریں، لیکن جو علما ومشائخ ان تعلیمات صالحہ کی نشر واشاعت نہیں کرتے، اور مذہبی پیشوا ہوکر ان حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں اور کبھی بداخلاقی کے نتائج فاسدہ سے محفوظ نہ رہ سکیں گے، ایسے حریص طامع عالموں کی خدا کے نزدیک کوئی قدر نہ ہوگی، انہیں شرف ہم کلامی نصیب نہ ہوگا، اور انکے نیک کام، ان کی غلطیوں کا کفارہ نہ بن سکینگے، عذاب کی یہ سختی صرف اس لئے ہے کہ کتاب توعین ضرورت کے مطابق نازل کی گئی مگر انہوں نے اس کی شرح وتفسیر میں اختلافات پیدا کردیئے اور اب کوئی شخص اس سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتا، ایسا کرنے میں وہ خود بھی

راہ حق و صراط مستقیم سے دور جا پڑتے ہیں۔

قرآن حکیم نے تبلیغ و دعوت ہر مسلم کا فرض قرار دیا ہی، اور اس اُمّت مرحومہ کی خصوصیت ہی یہ بیان کی ہو کہ: کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنہون عن المنکر مگر جو لوگ تبلیغ و اشاعت سے انحراف کریں اور کتمان حق کے مرتکب ہوں، ان کو اشد شدید عذاب کا مستحق قرار دیا ہی، ایک جگہہ فرمایا: اولئك يلعنهم الله ويلعنهم اللاعنون، بنی اسرائیل کی سب سے بڑی خرابی یہی ذکر کی گئی ہو کہ وہ کتمان حق کیا کرتے تھے۔

حکومت کی قابلیت

قوموں کا ارتقا ہمیشہ تدریجی ہوا کرتا ہی، چنانچہ ابتدا میں تہذیب اخلاق کی تعلیم دی گئی بعد ازاں تدبیر منزل کے اصول اساسی بیان کئے گئے، اب ایک قدم اور آگے بڑھایا، قرآن حکیم یہ چاہتا ہی کہ ہر مسلمان کا گھر ایک مستقل درس گاہ ہو، جس میں اولاد کی تربیت اس طریق پر کی جائے کہ گھر کی چار دیواری سے باہر نکل کر حکومت کرنے کے قابل بن جائیں، تفسیر کے ابتدائی اوراق میں تم پڑھ آئے ہو کہ شارع کی زندگی میں جس قدر علمی اعزازات ملتے تھے ان کا معیار قرآن حکیم تھا چنانچہ آپ نے فرمایا: خیرکم من تعلم القران وعلمہ مگر عملی عز و افتخار کے لئے خود اس شخص کی گھر کی زندگی کو دیکھا جاتا تھا، اہل و عیال کے ساتھ وہ کس طرح پیش آتا ہی، گھر میں نظم و نسق کیسے قائم کرتا ہی اور جھگڑوں کے وقت فیصلہ کی کیا صورت ہوتی ہی، خیرکم خیرکم لاھلہ میں اسی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا، پس ایک مسلمان کا گھر چھوٹی سی سیاسی درسگاہ ہی، جس میں حکمرانی اور جہانداری کے مسائل کی تعلیم ہوتی ہی، اور جہاں سے فرمانروا بن کر نکلتے ہیں۔

(۱۷۷) لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ	یہی نیکی نہیں کہ مشرق و مغرب کی طرف اپنا منہ کر لو بلکہ نیکی یہ ہی کہ ایک شخص اللہ اور روز آخرت، اور فرشتوں اور کتابوں اور نبیوں پر ایمان لاوے اور مال کی محبت

وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ	باوجود وہ رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور
ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ	مسافروں اور سوال کرنیوالوں اور گردنوں کے آزاد کرنے
السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ	میں مال صرف کرے، اور نماز پڑھے، اور
الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ	زکوٰۃ دے، اور جب عہد کریں تو اس کو
اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ	پورا کریں، اور سختی اور تکلیف اور لڑائی کے
وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ	وقت ثابت قدم رہیں، یہی لوگ سچے ہیں
صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝	اور یہی لوگ پرہیزگار ہیں۔

تہذیب اخلاق کے باب میں صرف ذکر، شکر، صبر اور دعا پر زور دیا گیا کہ انفرادی طور پر تہذیب و شائستگی کے لئے یہی صفات حسنہ کافی تھیں، جب ترقی کر کے تدبیر منزل میں قدم رکھا تو فرائض میں بھی اضافہ ہو گیا، ابتدائی جماعتوں میں کتابیں کم ہوتی ہیں، اور طالب علم پر ذمہ داری بھی کچھ زیادہ نہیں ہوتی، مگر جب وہ ثانوی تعلیم کے لئے کسی درس گاہ میں داخل ہوگا تو اس کی ذمہ داریاں بھی بڑھ جائینگی، اس لئے کہا جاتا ہے کہ تہذیب اخلاق کے لئے تو صرف مشرق و مغرب کی طرف منہ کر لینا کافی تھا، مگر تدبیر منزل میں آکر ان پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا بلکہ فرائض میں اضافہ ہو جائیگا، اور اب ان امور میں بھی درخور وانی حاصل کرنا ہوگا۔

(۱) تہذیب اخلاق کے لئے جن امور کو ضروری قرار دیا گیا تھا، وہ اب بھی بدستور ثابت و قائم رہینگے۔

(۲) بخیل میں حاکم بننے کی قابلیت نہیں ہوتی، سموئل بن عادیا نے کیا خوب کہا ہے:

اذا المرء لم یدنس من اللوم عرضہ	فکل رداء یرتدیہ جمیل !
وان ھو لم یحمل علی النفس ضیمھا	فلیس الی حسن الثناء سبیل !

تم اپنے اندر خرچ کرنے کی عادت پیدا کرو، اور مال و دولت کی محبت پر غالب آؤ، ایک

حَیٰوۃٌ یّٰاُولِی الْاَلْبَابِ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ○ | زیادتی کی تو اسکے لئے دردناک عذاب ہے، اور اے عقلمندو! تمہارے لئے مساوات ہی میں زندگی ہے تاکہ تم متقی بن جاؤ۔

زمانہ جاہلیت میں دستور تھا کہ طاقتور قومیں کمزوروں سے معمولی قصاص لیکر بھی راضی نہ ہوتی تھیں، اور نہ قصاص دینے والے شرافت اور دیانت کا خیال رکھتے، اگر ایک آزاد اور شریف آدمی کو غلام مار ڈالتا تو وہ اس کی جگہ شریف آدمی کو قتل کرنے کی کوشش کرتے، قاتل اگر عورت ہوتی تو پھر بھی عورت کے قتل پر قناعت نہ کرتے بلکہ اس کا سلسلہ دراز تر ہوتا جاتا، اسلام نے آکر اس قسم کی تفریق کو بالکل مٹادیا اور فرمایا کہ مساوات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، قصاص کے معنی مساوات اور مماثلت فی القتل کے ہیں کما صرح بہ الخازن،

قرآن حکیم کا دستور یہ ہے کہ وہ ایک قانون کلی بیان کردیتا ہے اور عام طور پر جزئیات کو ذکر نہیں کرتا مگر چونکہ بعض اوقات قانون آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتا اس لئے اسکو اور زیادہ واضح کرنے کے لئے بعض ضروری مسائل بیان کردیتا ہے کہ کسی قسم کا خفا باقی نہ رہے چنانچہ یہاں بھی مقتولین کے بارہ میں مساوات کا قانون ذکر کرکے اس کی بعض اصولی جزئیات کو بیان کردیا کہ اگر قاتل آزاد ہے تو اسی سے قصاص لیا جائے، غلام نے قتل کیا تو وہی سزا کا مستحق ہے، اور عورت ہے تو وہی عقوبت کی مستوجب،

قانون تو وہی تھا جس کا اوپر ذکر کیا گیا، مگر بعض اوقات مقتول کے وارث اس مقدمہ کو قابل معافی خیال کرتے ہیں، یا اس جرم کو اتنا خفیف سمجھتے ہیں کہ بجائے قصاص کے صرف فدیہ پر راضی ہوجاتے ہیں تو اسلام اس وقت نرمی کرنے کے لئے تیار ہے قاتل کو خون بہا ادا کرنا ہوگا مگر اس میں شرط یہ ہے کہ فدیہ وصول کرتے وقت سختی سے کام نہ لیا جائے، اور قاتل کے لئے ضروری ہے کہ وہ شریفانہ طور پر تمام رقم ادا کردے، نہ تو مقدار میں کمی کرے اور نہ خواہ مخواہ ٹالتا رہے۔

بنی اسرائیل میں جرمانہ کا دستور نہ تھا بلکہ قاتل ہی قتل ہوتا تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے

مسلمانوں کے ساتھ لطف و نوازش کا برتاؤ کیا اور سزا میں تخفیف کردی، ورنہ سزا ئے قتل کے سوا اور کوئی صورت ہی نہ ہوتی، جرمانے سے فائدہ یہ ہوگا کہ مقتول کے وارثوں کو جس قدر نقصان پہنچا ہے اس کی ایک حد تک تلافی ہو جائیگی، اور فقر و تنگدستی سے بچ جائینگے، اگر اس قدر رعایت کے بعد بھی کسی نے ظلم و عدوان سے کام لیا، قتل کا جھوٹا دعوی کردیا یا معاف کرکے دوبارہ خون کا مطالبہ کیا تو اس سے قانونی مواخذہ ہوگا اور حکومت مداخلت کریگی۔

مسلمانوں کی ترقی کا راز اسی مساوات میں پوشیدہ ہے، جو قوم سپاہیانہ زندگی کی خوگر ہو، جسے دنیا کی امامت و پیشوائی کے لئے منتخب کیا گیا ہو، جو دنیا اور آخرت میں اعمال و اخلاق کے اعتبار سے فضیلت و برتری کے لئے چن لی گئی ہو، وہ کبھی ترقی نہیں کرسکتی جب تک اس کے تمام افراد کو برابر کے حقوق نہ دیے جائیں کہ ہر ادنی ترین مسلمان انتہائی ترقی کے لئے اپنے آپ کو تیار کرسکے، ایک دوسرے سے بڑھنے کی غرض سے بہترین اخلاق و اعمال کی عادت ڈال سکے، جب تمام افراد ملت میں یہ جوش و ولولہ عمل پیدا ہو جائیگا تو کوئی قوم ان کا مقابلہ نہ کرسکیگی۔

ضابطہ دیوانی

(۱۸۰) كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ، (۱۸۱) فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَمَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ، (۱۸۲) فَمَنْ خَافَ مِنْ مُوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا	جب تم میں سے کسی کو موت کا وقت نزدیک معلوم ہو، اور کچھ مال چھوڑنے والا ہو تو اس پر لازم ہے کہ ماں باپ اور رشتہ داروں کے لئے دستور کے مطابق وصیت کر مرے متقین پر یہ ایک قسم کا حق ہے۔ پھر جو وصیت سن لینے کے بعد اسے بدل دے، تو اس کا گناہ ان لوگوں پر ہے جو اسے بدل دیں، بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے البتہ جس شخص کو وصیت کرنیوالے کیطرف سے طرفداری

إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝	یا جرم کا اندیشہ ہو، اور وہ ان میں صلح کرا دے تو پھر اس پر کوئی گناہ نہوگا، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ نے قرآن میں جن پانچ آیتوں کو منسوخ تسلیم کیا ہے، ان میں سے پہلی یہی ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ چونکہ سورۂ نساء میں وارثوں کے حصے معین کر دیئے گئے ہیں، اس لئے وصیت کا حکم منسوخ ہو گیا، آیت یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین الخ کو ناسخ قرار دیتے ہیں، اور حدیث لا وصیۃ لوارث اس نسخ کو اور زیادہ واضح کرتی ہے، لیکن ہمارے نزدیک یہ آیت منسوخ نہیں ہو سکتی، بلکہ اب بھی واجب العمل ہے، اور اس کے لئے حسب ذیل دلائل ہیں۔

(۱) قرآن حکیم نے جن مواقع میں وارثوں کے حصے معین کئے ہیں وہاں من بعد وصیۃ کے الفاظ بھی ساتھ ساتھ آتے ہیں، دیکھئے بھائیوں کے ہوتے ہوئے جب ماں کا چھٹا حصہ مقرر کیا تو یہ شرط لگا دی کہ ان حصوں کے مطابق تقسیم اس وقت ہوگی جبکہ وصیت پر عمل ہو چکا ہوگا: فان کان لہ اخوۃ فلامہ السدس من بعد وصیۃ یوصی بھا (۴: ۱۲) اس کے بعد کی آیات بھی دیکھ لیجئے: فان کان لھن ولد فلکم الربع مما ترکن من بعد وصیۃ یوصین بھا، (۴: ۱۳) فان کان لکم ولد فلھن الثمن مما ترکتم من بعد وصیۃ توصون بھا، (۴: ۱۴) فان کانوا اکثر من ذالک فھم شرکاء فی الثلث من بعد وصیۃ یوصی بھا، (۴: ۱۵) ان تمام آیات میں حصص بیان کئے گئے ہیں، مگر ہر آیت کے آخر میں من بعد وصیۃ کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ وصیت جائز قرار دی گئی ہے۔

(۲) نزول کے اعتبار سے سورۂ مائدہ سب سے آخر میں نازل ہوئی ہے۔ اس میں فرمایا: یایھا الذین امنوا شھادۃ بینکم اذا حضر احدکم الموت حین الوصیۃ اثنان ذوا

عدل منکم او اخرانِ من غیرکم، (۵ : ۱۰۵) جب موت کا وقت آجائے اور وصیت کرنے لگو، تو دو عادل شخصوں کو اپنی وصیت کا گواہ بنا لو، اس کا مطلب یہ ہوا کہ سورۂ مائدہ نے بقرہ کے حکم وصیت کو بدستور قایم رکھا،

(۳) بخاری نے کتاب الوصایا میں سعد بن ابی وقاص سے روایت کیا ہے کہ وہ قیام مکہ کے دوران میں بیمار ہو گئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے، اور آپ اس امر کو ناپسند فرماتے تھے کہ ایک مسلمان مکہ سے ہجرت کرنے کے بعد پھر اسی جگہہ مر جائے، آپ نے سعد کے حق میں دعا کی تو سعد نے عرض کیا

یا رسول اللہ اوصی بمالی کلہ قال لا قلت فالشطر قال لا قلت الثلث قال فالثلث والثلث کثیر انک ان تدع ورثتک اغنیاء خیر من ان تدعہم عالۃ یتکففون الناس فی ایدیہم وانک مہما انفقت من نفقۃ فانہا صدقۃ حتی اللقمۃ التی ترفعہا الی فی امراتک،

سعد بار بار آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ اپنا تمام مال و متاع خدا کی راہ میں صرف کر دوں مگر آپ روکتے ہیں تا آنکہ تہائی مال کی وصیت کی اجازت مل جاتی ہے، اس کی وجہ آپ یہ فرماتے ہیں کہ وارثوں کو غریب و تنگ دست چھوڑنے سے دولتمند رہنے دینا زیادہ بہتر ہے، اس حدیث میں چند باتیں قابل غور ہیں:-

(الف) مکہ مبارکہ، ہجرت کے آٹھویں سال فتح ہوا ہے-

(ب) سورۂ بقرہ کی آیت زیر بحث، اور نساء کی آیات توریث ۸ھ سے قبل نازل ہو چکی تھیں-

(ج) فتح مکہ تک وصیت والی آیت پر مسلمان برابر عمل کرتے تھے، کوئی شخص اس کو منسوخ تسلیم نکرتا تھا، کیونکہ اگر یہ آیت اس وقت منسوخ ہو گئی ہوتی تو سب سے پہلے خود حامل نبوت، سعد کو وصیت کرنے سے روکتا کہ جب آیت وصیت منسوخ ہو چکی ہے تو تمہیں وصیت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں، مگر آپ یہ نہیں فرماتے، بلکہ آپ کا اصرار یہ ہے کہ ثلث

میں وصیت کرو کیونکہ اگر تمام مال فی سبیل اللہ خرچ کر دیا تو اہل وعیال بھوکے رہینگے۔

پس ان تمام باتوں سے معلوم ہو گیا کہ زمانہ رسالت میں یہ آیت منسوخ نہ تھی، اور تمام صحابہ کرام اس کو قابل عمل خیال کرتے تھے، البتہ اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہی کہ جب شریعت نے وارثوں کے حصے معین کر دیے ہیں تو پھر یہاں والدین اور رشتہ داروں کے ذکر کی کیا ضرورت تھی؟ بسا اوقات ایسا ہوتا ہی کہ والدین اور رشتہ داروں کو شریعت کے مطابق حصہ مل گیا، مگر وہ ان کے لئے بالکل ناکافی ہی، بڑھاپے اور ضعف کی وجہ سے کوئی کام بھی نہیں کر سکتے تو اس صورت میں اگر مرنے والا ان میں سے کسی کے لئے وصیت کر جائے تو شریعت اس کو پسند کرتی ہی، یا بعض اوقات یہ لوگ وارث نہیں بن سکتے مثلاً وہ کافر ہیں تو ایسی حالت میں بھی ان کے لئے وصیت کر جانا شرعی نقطہ نظر سے پسندیدہ ہوگا، چنانچہ ابن عباس، حسن، مسروق، طاؤس، ضحاک اور مسلم بن یسار کا یہی مذہب ہی۔

ارباب تقوی کے لئے یہی مناسب ہی کہ اپنے والدین اور رشتہ داروں کا خیال رکھیں، کوئی شخص وصیت میں تغیر و تبدل کرنے کا مجاز نہیں، البتہ اگر وصیت کرنے والے نے حق تلفی کی ہو، اور جائز وارثوں کو محروم کر دیا ہو تو حاکم اس میں مناسب تبدیلی کرنے کا حق رکھتا ہی، اگر بدلنے میں حکومت سے نادانستہ غلطی ہو گئی تو اس کو اللہ تعالی اپنی رحمت سے معاف کر دیگا، پس اگر وقف خلاف مصلحت ہی تو اس میں تبدیلی ہو سکتی ہی۔

مذہبی تعلیم کی نشر و اشاعت

تدبیر منزل کا جس قدر قانون بیان کیا گیا ہی، بظاہر اس کا تمام تر تعلق دنیا ہی سے معلوم ہوتا ہی، ممکن ہی بعض لوگ اس میں اتنا شغف اور انہماک پیدا کرلیں کہ اپنی زندگی کے اصلی مقاصد کو بالکل فراموش کر دیں، صرف اسی کو اپنا حقیقی مقصد قرار دے لیں، اور خیال یہ ہو کہ اپنے نصب العین کے کسب و حصول کی خاطر یہ تمام جد و جہد ہو رہی ہی، اس لئے ضروری ہوا کہ ان کی توجہ کو دوسری طرف پھیر دیا جائے تاکہ یہ حقیقت ان کے سامنے رہے

کہ تدبیر منزل کے ابتدائی فرائض کے علاوہ انھیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔

جب ایک شخص اپنے گھر والوں کے نان و نفقہ اور باقی تمام ضروریات زندگی کا ذمہ دار و کفیل ہے، اور اس چار دیواری میں فرماں روائی کر رہا ہے، تو اس کا صرف یہی فرض نہیں کہ اپنی اولاد کے لیے روپیہ کمائے، بلکہ اس سے یہ بھی سوال ہوگا کہ جن لوگوں کی باگ اس کے ہاتھ میں تھی، ان کی مذہبی تعلیم کا کیا انتظام کیا، اور مذہب سے دلبستگی پیدا کرنے کے لیے کونسے اسباب فراہم کیے، الا کلکم راع و کلکم مسؤل عن رعیتہ میں اسی حقیقت کو بے نقاب کیا ہے۔ آیندہ آیات میں مذہبی تعلیم کی نشر و اشاعت کی جانب توجہ دلائی جائیگی، مگر اس مبحث پر گفتگو کرنے سے قبل ان باتوں کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے:-

(الف)، ہر قوم کے لیے سال بھر میں جشن و مسرت کے اظہار کے لئے کوئی نہ کوئی دن مقرر ہوتا ہے، اس روز وہ اپنی شادمانی کا اظہار کرتی، اور ضروریات زندگی سے آزاد رہتی ہے، اس دن کو عید سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس تاریخ میں یا تو اللہ تعالیٰ نے اس پر کوئی اعلیٰ ترین نعمت نازل کی تھی، یا اسے کسی شدید ترین عذاب سے نجات دی تھی، یہود و نصاریٰ، ہنود و مجوس اور دوسرے مذاہب صرف ان ایام میں عید مناتے ہیں جب وہ کسی خاص نعمت و کرامت سے سرفراز کیے گئے ہوں۔ ایک یہودی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اگر الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی والی آیت ہم پر نازل ہوتی تو اس روز کو ہم عید مناتے، حضرت عمر نے جواب دیا کہ ہمیں وہ دن خوب یاد ہے جس روز اس کا نزول ہوا، اور وہ دن ہمارے لیے شریعت نے عید مقرر کر رکھا ہے، اور وہ یوم الجمعہ ہے۔

رمضان میں قرآن کا نزول ہوا، جس نے تمام دنیا کو امن و سلامتی اور آزادی کا پیغام دیا، جس نے دنیا و آخرت کی بادشاہی کا اعلان کیا، اور جس نے امت مسلمہ کو شہداء علی الناس کا مژدۂ جانفزا سنایا، پھر اس سے بڑھ کر مسلمانوں کے لئے اور کونسا دن مسرت و شادمانی کا ہو سکتا ہے، دنیا کے جملہ مذاہب کا روئے سخن اپنی ہی مخصوص قوموں کی طرف رہا اس لئے

ان کے پیروکار صرف ایک ہی روز عید کرتے رہے، مگر قرآن کی دعوت عالمگیر ہے، تمام اقوام عالم اس کے مخاطب ہیں، اور اس کے اتباع دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلے ہوئے ہیں اسلئے پورا ایک مہینہ عید کے لئے مقرر کیا گیا تاکہ نزول قرآن کی تذکار قائم رہے۔

(ب) ان ایام عیش و نشاط میں مسلمانوں کو زیادہ کام کرنے اور روزی کمانے کی ضرورت نہ ہوگی، بلکہ ان کا بیشتر حصہ اسی مسرت و شادمانی میں صرف ہوگا، لیکن اگر محض عید ہی رہتی تو ممکن تھا کہ لوگ افراط و تفریط میں مبتلا ہوکر بدعملی و بطالت کے مرتکب ہوتے اور آخر تمام قوم فنا ہوجاتی، اس لئے خوشی کے ساتھ ساتھ ایک عبادت بھی لازم کردی گئی، تاکہ تدبیر منزل میں مشغول ہونے کی وجہ سے ان کی ملکیت اور روحانیت میں جس قدر کمی ہوگئی ہی اس طرح پوری ہو، اور اپنی اصلی حالت پر عود کرآئے، ان ایام فراغت میں قرآن پڑھو، گھروالوں کو تعلیم دو، اور اگر اتنی قابلیت نہ ہو تو دوسروں سے سنو، اور بال بچّوں کو سننے کے لئے لیجاؤ۔

(ج) اندیشہ تھا کہ چونکہ رمضان میں ضروریات ایک حد تک خود بخود کم ہوگئی ہیں، کھانا بھی صرف دو ہی مرتبہ کھایا جاتا ہی، کہیں بخل و امساک کا مرض لوگوں میں نہ پیدا ہوجائے جس سے قومی ترقی رُک جائے گی اس لئے رمضان کے آخر میں صدقۃ الفطر لازم کردیا گیا۔

روزہ کی فرضیت

(۱۸۳) يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝	مسلمانو! تم پر روزے ایسے ہی فرض کئے گئے ہیں جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے تاکہ تم متقی بن جاؤ۔

صوم کے معنی لغت میں مطلق امساک کے آتے ہیں، خدا نے مریم کو حکم دیا کہ اگر تمہاری قوم کے لوگ تمہارے پاس آئیں، اور بات چیت کرنے کے آرزومند ہوں تو یہ جواب دینا: انی نذرت للرحمٰن صوما فلن اکلم الیوم انسیا (۱۹: ۲۷) یعنی میں نے آج کلام نہ کرنے کا روزہ رکھا ہی، مگر شریعت نے اس لفظ صوم کو بھی مخصوص معنی میں استعمال کیا ہی یعنی الصوم

فی الشرع عبارۃ عن الامساك عن الاكل والشرب والجماع فی وقت مخصوص وھو من طلوع الفجر الی غروب الشمس مع النیۃ، طلوع فجر سے غروب آفتاب تک طعام و شراب اور لذت جماع سے پرہیز کرنے کا نام روزہ ہی،

دنیا کی ہر قوم میں روزہ رکھنے کا دستور ہی، عاشورہ کے دن حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو فرعون کے پنجۂ قہر و استبداد سے نجات ملی تو یہودیوں نے اس دن کا روزہ رکھنا شروع کردیا، عیسائیوں میں روزہ رکھنے کا قانون تھا، مگر انہوں نے کفارہ کی آڑ پکڑی، اور تمام اعمال صالحہ سے الگ ہوگئے، روزوں کے متعلق کتاب مقدس کی حسب ذیل آیات ملاحظہ ہوں: اور چالیس دن اور چالیس رات فاقہ کرکے آخر کو اسے بھوک لگی، (۴: ۲) دوسری جگہ آیا: اور جب تم روزہ رکھو تو ریاکاروں کی طرح اپنی صورت اداس نہ بناؤ کیونکہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں تاکہ لوگ انہیں روزہ دار جانیں، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا اجر پاچکے، بلکہ جب تو روزہ رکھے تو اپنے سر میں تیل ڈال، اور منہ دھو، تاکہ آدمی نہیں بلکہ تیرا باپ جو پوشیدگی میں ہی تجھے روزہ دار جانے، اس صورت میں تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے تجھے بدلہ دیگا، (متی ۶: ۱۶ و ۱۷ و ۱۸) لوقا میں ہی: اور انہوں نے اس سے کہا کہ یوحنا کے شاگرد اکثر روزہ رکھتے اور دعائیں مانگا کرتے ہیں، اور اس طرح فریسیوں کے بھی، مگر تیرے شاگرد کھاتے پیتے ہیں، یسوع نے ان سے کہا، کیا تم براتیوں سے، جب تک دلہا ان کے ساتھ رہے، روزہ رکھوا سکتے ہو؟ مگر وہ دن آئینگے، اور جب دلہا ان سے جدا کیا جائیگا، تب ان دنوں میں وہ روزہ رکھینگے، (لوقا، ۵: ۳۳ و ۳۴ و ۳۵)

لعلکم تتقون میں روزہ کی حقیقت اور اس کے فلسفہ کو واضح کیا کہ اس سے صحت و تندرستی پر اچھا اثر پڑتا ہی، غریب لوگوں کی حالت سے امرا عملی طور پر باخبر ہوتے ہیں، شکم سیروں اور فاقہ مستوں کو ایک سطح پر کھڑا کردینے سے قوم میں مساوات کے اصول کو ترقی ہوتی ہی، قوائے ملکیہ میں قوت، اور حیوانی خواہشوں میں کمزوری پیدا ہوتی ہی، خدا ترسی کی

طاقت انسان کے اندر محکم و استوار ہوتی ہی، گرمی کا موسم ہی سخت پیاس لگ رہی ہی، تنہا مکان میں ٹھنڈا پانی رکھا ہی، مگر نہیں پیتا، روزہ دار کو سخت بھوک لگی ہوئی ہی، بھوک کی وجہ سے جسم میں ضعف بھی محسوس کرتا ہی، کھانا موجود ہی، دیکھنے والا کوئی نہیں، مگر نہیں کھاتا، دل پسند بیوی پاس بیٹھی ہی، محبت کے جذبات دونوں میں موجزن ہیں لیکن وہ اس سے احتراز کرتا ہی، اس لئے کہ خدا کے حکم کی عزت و حرمت اسکے دل میں گھر کر گئی ہی، اب کوئی دوسری قوت اس پر غالب نہیں آسکتی، اور جب اس نے خدا کے حکم سے جائز، حلال اور پاکیزہ خواہشات کو چھوڑنے کا اپنے آپ کو عادی بنا لیا ہی، تو حرام، ناجائز اور مکروہ عادتوں کے چھوڑنے میں اسے کوئی دقت محسوس نہ ہوگی، یہی وہ اخلاقی پاکیزگی ہی جس کا روزہ دار کے اندر پیدا کر دینا شرع کا مقصود اصلی ہی، حدیث میں آتا ہی: من لم یدع قول الزور والعمل به فلیس لله حاجة ان یدع طعامه وشرابه، اگر ایک روزہ دار جھوٹ کہنا، لغو بکنا، اور فضول کاموں کو نہیں چھوڑتا تو خدا کو اس کے کھانا پینا چھوڑ دینے کی پروا نہیں، دوسری حدیث میں آتا ہی: اذا کان یوم صوم احدکم فلا یرفث ولا یصخب فان سابه احد فلیقل انی امرء صائم جب کوئی شخص کسی دن روزہ رکھے تو نہ کوئی بیہودہ لفظ زبان سے نکالے، اور نہ شور وشغب کرے، اور اگر کوئی شخص اس کو گالی دے تو کہدے میں روزہ دار ہوں گالی دینا اور جھگڑنا مجھے شایان نہیں۔

تقوی وطہارت، ورع و پاکیزگی، اور توبہ و انابت الی اللہ کا ذریعہ یہی روزہ ہی، عزم و استقلال، صبر و تحمل، اور ثبات قدم اسی سے پیدا ہوتا ہی، جنگ میں کامیابی کا ذمہ دار یہی ہی، اور اسی لئے ہمرہان طالوت چلتے چلتے نہر کے کنارہ پر رہ گئے کیونکہ انہیں روزہ کی عادت نہ تھی، سفر کی تکالیف، بھوک اور پیاس کی شدت کو برداشت نہ کرسکے، اور اس لئے طالوت نے ان کو آگے بڑھنے سے روک دیا،

صدقۃ الفطر

(۱۸۴) أَيَّامًا مَّعْدُودٰتٍ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿﴾	وہ گنتی کے چند دن ہیں، پھر جو شخص تم میں بیمار ہو، یا سفر میں تو دوسرے دنوں سے شمار پورا کر دے، اور جو لوگ کھانا دینے کی طاقت رکھتے ہوں، ان پر ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے، اور جو شخص اپنی خوشی سے نیک کام کرے تو یہ اس کے حق میں بہتر ہے، اور تم روزہ رکھو تو یہ تمہارے لئے اور بھی بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔

وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین سے اکثر لوگ مختلف شبہات میں پڑ گئے اور غلط راہ اختیار کرلی، حالانکہ مطلب بالکل صاف تھا، اور یہ غلط فہمی اسلئے پیدا ہوئی کہ انہوں نے روزہ کی حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیا، اور یہ سمجھ گئے کہ شریعت کے احکام بغیر کسی علت اور مصلحت کے ہوتے ہیں، اس آیت میں فدیۃ طعام مسکین مبتدا موخر ہے، اور علی الذین یطیقونہ اس کی خبر مقدم، طعام مسکین، فدیۃ سے بدل واقع ہو رہا ہے، اور یطیقونہ کی ضمیر طعام مسکین کی طرف راجع ہے، مطلب یہ ہوگا کہ روزہ ایک مستقل عبادت ہے، اور اس سے مقصد یہ ہے کہ انسان کے اندر چند اخلاق فاضلہ پیدا ہوں، لیکن بالکل ممکن ہے کہ باوجودیکہ روزہ اصلی معنوں میں رکھنے کی کوشش کی جائے اور پھر بھی کسی نہ کسی قسم کی کوتاہی سرزد ہو، اور ہمیں اطلاع تک نہ ہو۔ بعض لوگوں کو یہ خیال پیدا ہو کہ روزہ کی وجہ سے ہمارے مصارف تو ویسے ہی کم ہوگئے ہیں کچھ اور زیادہ کفایت شعاری کریں، اور پھر آہستہ آہستہ بخیل بن جائیں، ان امراض کو روکنے کے لئے شریعت نے یہ لازم کر دیا کہ ارباب دولت و ثروت روزہ رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک مسکین کا کھانا بھی اللہ کے نام پر دیدیا کریں، تاکہ بخل کا مرض نہ پیدا ہو۔

لیکن اگر یہی حکم رہتا کہ ہر روز ایک مسکین کو کھانا دیدیا کرو، تو رمضان میں دگنی محنت

کرنی پڑتی، تمام دن کام میں مصروف رہنا پڑتا، اور قرآن میں غور کرنے کا موقعہ نہ ملتا، اسلئے شریعت نے یہ قانون بنا دیا کہ رمضان ختم ہوتے ہی عید کی نماز پڑھنے سے پہلے فقراء و مساکین میں تقسیم کردو۔ چاہیئے تو یہی تھا کہ ہر روزہ کے مقابلہ میں ایک مسکین کا کھانا دیا جاتا مگر شارع نے اس کثرت کا یہ علاج کیا کہ: ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرض زکوٰۃ الفطر صاعًا من تمرا و صاعًا من شعیر علی کل حرا و عبد ذکرا و انثی من المسلمین، ہر ایک صاحب استطاعت مسلمان اپنے اہل و عیال، بال بچوں، اور لونڈی غلام کی جانب سے صدقۃ الفطر ادا کرے، اس صورت میں کثرت بھی محفوظ رہی، اور فرض بھی ادا ہو گیا، قاعدہ تو یہی ہے کہ وہ صدقۃ الفطر ایک مسکین کا کھانا ہو، لیکن اگر ایک شخص اس سے زیادہ صرف کرنا چاہتا ہے تو شریعت کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں، بلکہ یہ اس کے حق میں مفید ہوگا۔

بیشک روزہ رکھنا مشکل کام ہے، مگر تمہارے لئے یہی بہتر ہے، کیونکہ جو طہارت و پاکیزگی اسلام کے پیش نظر ہے اس کے بغیر تم میں نہیں پیدا ہو سکتی، اور آئندہ ارتقائے ملت کے لئے تمہیں جس قدر تکلیفوں اور مصیبتوں کو برداشت کرنا ہوگا ان کے لئے ابتدا ہی سے تیار رہنا ضروری ہے کہ عادت پڑ جائے۔

(۱۸۵) شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۗ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۗ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ

رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے جو لوگوں کے لئے ہدایت ہے، اور ہدایت اور فرقان کی کھلی کھلی باتیں ہیں، پھر تم میں سے جو شخص اس مہینے میں زندہ ہو وہ ضرور روزے رکھے، اور جو بیمار ہو یا سفر میں ہو، تو گنتی کے دوسرے دن پورے کرے، اللہ تمہارے ساتھ آسانی کرنا چاہتا ہے اور تمہارے ساتھ تنگی نہیں کرنا چاہتا، اور تاکہ تم لوگ

تَشکُرُوْنَ ۰ | اس شمار کو پورا کرو، اور اس بات پر اللہ کی بزرگی بیان کرو کہ اس نے تم کو ہدایت دی، اور تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ۔

جس ماہ مقدس میں ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ اپنے گھروں میں مذہبی تعلیم کی نشر و اشاعت کے لئے کمربستہ ہو جاؤ، وہ یہی رمضان کا مہینہ ہے، اسی میں قرآن کا نزول ہوا، جس کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

(الف) نوع انسانی کے لئے سرچشمۂ رشد و ہدایت ہے،

(ب) ہدایت و رہنمائی کے وہ اصول و ضوابط جو نظر و فکر کے محتاج ہیں، قرآن حکیم نے ان کو اس طرح کھول کھول کر بیان کیا ہے کہ بدیہی معلوم ہونے لگتے ہیں، اور ہر شخص آسانی سے ان کو سمجھ لیتا ہے۔

(ج) جو لوگ اس کتاب عزیز کے درس و مطالعہ میں مصروف ہوں، ان کی قوت فیصلہ اور زیادہ زبردست ہو جاتی ہے، حق و باطل میں تمیز کرنے لگ جاتے ہیں، علمائے سو اور جاہل صوفیوں کے دھوکے میں نہیں پھنستے۔

یہ ماہ مقدس قرآن حکیم کے نزول کی سالگرہ کا مہینہ ہے، دوسری جگہ آیا: انا انزلنٰہ فی لیلۃ القدر (۹۷: ۱) سورۂ دخان میں اس کی نسبت فرمایا: انا انزلنٰہ فی لیلۃ مبٰرکۃ انا کنا منذرین ۰ فیھا یفرق کل امر حکیم (۴۴: ۲ و ۳) ان دونوں آیتوں سے مراد یہی ہے کہ رمضان میں قرآن کا نزول ہوا اس لئے ہر وہ مسلمان جو اس مہینہ میں زندہ ہو ضرور روزہ رکھے کہ جشن و مسرت کا اظہار ہو، البتہ مرض اور سفر کی حالت میں رخصت دی جاسکتی ہے کہ بعد کو اس کمی کو پورا کر لیا جائے، ایک طالب علم کا فرض تو یہی ہے کہ باقاعدہ کالج میں حاضر ہو، لیکن اگر کسی ضرورت سے نہ آسکے تو اسے گھر پر سبق کو تیار کرنا ہوگا تاکہ باقی طالب علموں کے ساتھ درس میں شریک ہو سکے، اللہ تعالیٰ تمہیں کسی تکلیف میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ بلکہ وہ تمہاری سہولت و آسانی کو ہمیشہ پیش نظر رکھتا ہے، یہی وجہ ہے

کہ اس نے سفر اور مرض میں رخصت دیدی، اگر غور سے کام لو تو یہ حقیقت تم پر واضح ہو جائیگی کہ تمہاری انفرادی و اجتماعی زندگی کے لئے اس سے بہتر کوئی دوسرا قانون نہیں ہو سکتا، تم اس پر عمل کرکے دائمی زندگی حاصل کر لوگے، اس تکلیف کے برداشت کرنے سے تمہارے لئے صدہا سہولتوں اور آسائیوں کے دروازے کھل جائینگے پس اس کو تکلیف کون کہیگا جس کا نتیجہ فضیلت علی العلمین اور خلافت ارضی ہو، یہ ایک ایسی نعمت ہے جو صرف تمہارے لئے مخصوص کردی گئی ہے، اور اس پر تم جس قدر بھی اس کی تمجید و تقدیس بیان کرو کم ہے۔

اس قانون پر عمل کرنے کا ایک نتیجہ یہ نکلیگا کہ تم میں عملی قوت پیدا ہو جائیگی، تمہاری مخفی قوتیں منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہونگی، جوش و ولولہ عمل پیدا ہوگا، قرآن کو اپنے ہاتھ میں لیکر دنیا بھر میں اس کی نشر و اشاعت کروگے، اور کوئی بڑی سے بڑی قوت تمہاری راہ میں مزاحم نہ ہوگی۔

ممکن ہے دن بھر روزہ رکھنے کی وجہ سے قرآن کی تلاوت نہ ہو سکے، اس لئے شارع نے رات معین کردی کہ کھانے پینے سے طبیعت سیر ہو جائیگی، دن بھر جس قدر قوتیں مضمحل ہو چکی ہیں عود کر آئینگی، اور رات کو اطمینان کے ساتھ پڑھ سکینگے، آپ نے فرمایا: من قام رمضان ایمانا واحتسابا غفرله ما تقدم من ذنبه، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ رمضان کے ایام میں جبرئیل کے ساتھ قرآن کا دور کیا کرتے تھے، اور وفات کے قریب آپ نے دو مرتبہ دور کیا، گویا اگر ایک شخص رمضان میں ایک مرتبہ قرآن سن لے تو اس نے نصاب پورا کرلیا۔

روح مذہب کی پابندی

(۱۸۶) وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَـ…	اور جب میرے بندے تم سے میرے متعلق دریافت کریں تو میں ان کے قریب ہی ہوں جب کبھی مجھے کوئی دعا کرے تو ہر دعا کرنیوالے کی درخواست قبول

یُرْشِدُوْنَ ○ | قبول کرتا ہوں، پس انہیں چاہیے کہ میرے احکام مانیں، اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ وہ رشد و ہدایت حاصل کریں۔

گزشتہ آیات میں قانون کی ظاہری شکل و صورت پر زور دیا گیا کہ اس کی پابندی کے بغیر کوئی جذبہ صادقہ نہیں پیدا ہو سکتا، اب اس کی حقیقت و اصلیت کی طرف توجہ کی جاتی ہے کیونکہ اگر محض اشکال و صور پر نظر ہو، اور مقصد کی جانب سے غفلت و بے اعتنائی اختیار کی جائے تو نتائج و ثمرات کے نکلنے کی کوئی توقع نہیں ہو سکتی، اگرچہ قرآن نے اس موضوع پر مختلف درس دیے ہیں مگر سورۂ تکاثر ایک جامع و حاوی درس ہے، لن ینال اللہ لحومها ولا دماؤها ولکن يناله التقوى منكم میں اسی طرف اشارہ ہے۔

مذہب کی روح و حقیقت یہ ہے کہ انسان سب سے کٹ کر صرف ایک اللہ کا ہو رہے، اسی سے اپنی ہر مراد مانگے، اور اسی کے آگے دست سوال دراز کرے، وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون، (۵۱: ۵۶) اس کی زندگی اور موت، اس کا اقدام وادبار، اس کی عبادت اور قربانی اسی کے لیے ہو، ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین لا شریک له وبذلك امرت وانا اول المسلمین (۶: ۱۶۳) ایام رمضان میں نزول کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ چونکہ ان ایام میں قرب الٰہی کی راہیں کھل جاتی ہیں، اس لیے تم خدائے واحد سے دعا کرو، تنزل الملئكة والروح فيها باذن ربهم من كل امر ہ سلٰم ہی سورۂ دخان میں اسی لیلہ مبارکہ میں قرآن حکیم کے نزول کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: رحمة من ربك انه هو السميع العليم، (۴۴: ۵) حدیث میں آتا ہے: ینزل ربنا کل لیلة الی السماء الدنیا حین یبقی ثلث اللیل الاخر فیقول من یدعونی فاستجیب له من یسالنی فاعطیه ومن یستغفرنی فاغفرله، ہر شب کے آخری ثلث میں خداوند قدوس آسمان دنیا پر نزول اجلال فرما کر اعلان کرتا ہے کوئی مانگنے والا ہے کہ اس کی دعا کو استجابت بخشوں، سوال کرنے والا کہ اس کو نوازش کروں، اور طلب

مغفرت کے لئے کوئی مضطرب روح کہ اس کو تسکین دوں۔

تمام مذاہب وادیان کی اصل واساس یہی دعا ہی، ہر ملک اور ہر زمانہ کے نیک لوگوں اور راست بازوں نے اپنے مقاصد مہمہ محض اس دعا کی بدولت حاصل کئے ہیں، جب تمام ظاہری اسباب ووسائل ناکام رہے تو دعا نے گرہ کشائی کی، اور ان کی تمام تکالیف ومصائب دور ہوگئیں، انبیائے کرام کی کامیابی کا راز اسی میں پنہاں تھا، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الدعاء مخ العبادة، دعا حاصل عبادت اور عصارۂ بندگی ہی، دوسری روایت میں آیا کہ الدعاهو العبادة، مگر اس کے متعلق حسب ذیل امور کا پیش نظر رکھنا ضروری ہی:

(الف) دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ہم اسباب ووسائل سے فائدہ اُٹھاتے ہیں، دعا بھی ان میں سے ایک سبب ہی، اس کی بدولت بعض ایسے آسان وسہل ترذریعوں کی اطلاع ہوجاتی ہی جو اب تک ہم پر مخفی تھے۔

(ب) ہم اللہ کو حاکم علی الاطلاق تسلیم کرکے دعا مانگتے ہیں، اس لئے ضروری نہیں کہ ہر دعا قبول ہو کیونکہ بالکل ممکن ہے کہ اس دعا کی قبولیت ہمارے حق میں مضر ہو، ایک جگہہ فرمایا: بل ایاہ تدعون فیکشف ما تدعون الیہ ان شاء (۶: ۴۱) حدیث میں آتا ہی، مامن احد یدعو بدعاء الا اتاہ اللہ ما سأل او کف عنہ من السوء مثلہ مالم یدع باثم او قطعیة رحم، جب تک ایک شخص کسی گناہ یا قطع رحم کی دعا نہ کرے، اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول کرتا ہی، جو مانگتا ہی اس کو دیتا ہی یا اس سے کسی برائی کو روکتا ہی۔ ابوداؤد نے سلمان سے روایت کیا ہی، ان ربکم حی کریم یستحی من عبدہ اذا رفع الیہ یدیہ ان یردھما صفرا خائبین، اللہ تعالیٰ اس درجہ باحیا اور کریم ہی کہ وہ کسی دعا کرنے والے کو خالی ہاتھ واپس نہیں کرنا چاہتا، مگر قبولیت دعا کے لئے شرط یہ ہی کہ قلب غافل اور بے پروا دل نہ ہو، ترمذی نے ابوہریرہ سے روایت کیا ہے،

ادعوا اللہ وانتم موقنون بالاجابتہ، واعلموا ان اللہ لا یستجیب دعاء من قلب غافل لاہ، ایک اور حدیث میں آیا ہی، یستجاب لاحدکم مالم یعجل یقول دعوت فلم یستجب لی۔

(ج) بعض دعاؤں کے قبول نہ ہونے کی وجہ سے یہ کہنا غلط ہی کہ دعا کا کوئی فائدہ نہیں، ہم حالت مرض میں دوا کا استعمال کرتے ہیں، بسا اوقات دوا مفید نہیں ہوتی مگر علاج ترک نہیں کرتے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ دعا قبول نہ ہونے پر اس کو ترک کر دیا جائے، ترمذی میں ابوہریرہ روایت کرتے ہیں، من لم یسال اللہ یغضب علیہ

(د) اگر ہم کسی کو بتانا چاہیں کہ کھیتی کس طریق پر ہوتی ہی؟ اور پودے کس طرح پھل دیتے ہیں؟ تو اس کو مخصوص موسم ہی میں دکھائینگے، ایسے ہی دعا کے بھی آداب و مراسم اور خاص مواقع ہیں جن میں اس کو شرف اجابت بخشا جاتا ہی، گزشتہ روایات میں بعض شرطوں کا تذکرہ آگیا ہی، اسی ذیل میں ایک اور حدیث بھی پیش نظر رکھ لیجیے!

من سرہ ان یستجیب اللہ لہ عند الشدائد والکرب فلیکثر الدعاء فی الرخاء، جو شخص تکالیف و مصائب کے وقت اجابت دعا کا آرزومند ہی وہ فراخی و فارغ البالی کے ایام میں خوب دعا کرے۔ اس آیت کے آخری ٹکڑے نے بتا دیا کہ ہمارے قانون کی کامل فرماں برداری کروگے تو دعا ضرور قبول ہوکے رہیگی۔

اتباع قانون

روزہ کے دو مقاصد کا تذکرہ گزشتہ آیات میں کیا گیا ہی، اب تیسرے مقصد قانون کی پابندی پر بحث کی جاتی ہی، جو قانون صحیح اس کو دیا جاسے، بلاچون وچرا اس پر عمل کرنے کو تیار رہو تاکہ بدنظمی نہ ہونے پائے، اس جذبہ کی تربیت اور تکمیل حسب ذیل احکام سے کی جائیگی:

(۱۸۷) اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ | روزہ کی شب میں اپنی بیویوں سے مشغول ہونا تمہارے

إِلَىٰ نِسَآئِكُمْ ط هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ
لِبَاسٌ لَّهُنَّ ط عَلِمَ اللّٰهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ
تَخْتَانُوْنَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَ
عَفَا عَنْكُمْ ج فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ
وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَ
كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ
الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ
مِنَ الْفَجْرِ ص ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ
إِلَى الَّيْلِ ج وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ
وَأَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ ط
تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ط
كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ
لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ٥

لئے حلال کیا گیا، وہ تمہارا اوڑھنا بچھونا ہیں، اور تم
ان کے لئے لباس ہو، اللہ اس بات کو جانتا تھا کہ تم
اپنے آپ کو خیانت میں مبتلا کرتے تھے، تو اس نے
تم پر مہربانی کی، اور تمہارے گناہ کو معاف کردیا، تو
اب ان سے مباشرت کرو، اور جو خدا نے تمہارے
لئے مقدر کردیا ہی اس کو تلاش کرو، اور جب تک
تمہیں سفید خط صبح سے سیاہ خط سے متمیز ہو جائے،
اس وقت تک کھاؤ اور پیو، پھر رات تک روزہ پورا
کیا کرو، اور جس زمانہ میں تم مسجدوں میں اعتکاف
کر رہے ہو اس وقت اپنی بیبیوں سے مت ملنا،
یہ اللہ کی حدیں ہیں، ان کے قریب بھی نہ جانا،
اسی طرح اللہ اپنے احکام لوگوں کے لئے بیان
کرتا ہی تاکہ وہ پرہیزگار بن جائیں۔

اگر روزوں میں مشکل ترین احکام کی پابندی کا اپنے آپ کو عادی بنا لیا، تو پھر خواہ کیسا ہی سخت سے سخت اور دقت طلب قانون دیا جائے کوئی تکلیف محسوس نہ ہوگی، مسلمانوں کو دنیا بھر میں حق و صداقت کی نشر و اشاعت کرنی ہی، ہر قوم ان کی مخالفت کریگی، اور ان کے فنا کرنے کی فکر میں رہیگی، ان مخالفین و معاندین کے تباہ و برباد کرنے کے واسطے خود مسلمانوں کو بھی تیار رہنا ہوگا، اس جنگی جذبہ کو بھڑکانے اور تیز کرنے کے لئے کھانے پینے کی ضرورت ہوگی کہ خوب موٹے تازے ہوں اور تنومند سپاہی بن جائیں، لیکن اگر قوت پیدا ہوگئی اور نکاح نہ کیا تو شدید ترین خرابیوں کے پیدا ہونیکا اندیشہ ہی، زنا اور لواطت کی طرف رخ کرینگے، یا یہود و نصاریٰ کی طرح رہبانیت کو

اختیار کرینگے، اور ان میں سے ہر ایک چیز مسلمانوں کے لیے تباہ کن ہی، اس لیے فرمایا کہ ماہ رمضان میں شب کے وقت تم اپنی عورتوں کے پاس جاسکتے ہو، اس سے ایک تو تمہارے اخلاق پر بُرا اثر نہ پڑیگا، اور دوسرے اپنی ظاہری وجاہت اور زیب و زینت کو محفوظ رکھ سکوگے۔

جب تک اللہ کی طرف سے کوئی حکم نازل نہ ہوتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہل کتاب کا اتباع کیا کرتے تھے، چنانچہ نزول رمضان سے قبل، مدینہ میں آپ عاشورہ کا روزہ رکھتے تھے، نصاریٰ کا روزہ آٹھ پہر کا ہوتا تھا اس زمانہ میں مسلمانوں کی عادت تھی کہ عشاء کی نماز تک کھا پی لیتے، اور عورتوں کے پاس بھی چلے جاتے تھے، اس کے بعد وہ ان تمام چیزوں کو حرام سمجھتے مگر یہ حکم نہ تھا، اس لیے اللہ نے ان کی طرف نظر رحمت کی، اور کھول کر فرمادیا کہ رات کو کھانا پینا، اور عورتوں کے پاس جانا جائز ہی، اور اس مباشرت سے مقصد یہ ہی کہ اولاد پیدا کرو تاکہ مسلمانوں کی جماعت میں ترقی ہو، اور تمہارے مقاصد حیات کی تکمیل۔

آگے چل کر کھانے پینے کے اوقات معین کردیے، اور بتادیا کہ طلوع فجر سے غروب آفتاب تک ان میں سے کوئی چیز استعمال نہیں کرسکتے، عدی بن حاتم کہتے ہیں کہ یہ آیت نازل ہوئی تو میں نے سفید اور سیاہ رنگ کی رسیاں لیکر اپنے تکیہ کے نیچے رکھ لیں کہ جب دونوں ایک دوسرے سے ممتاز نظر آنے لگینگی تو سمجھ لونگا کہ وقت ہوگیا، آپ نے فرمایا کہ اس سے تاریکی شب اور سپیدۂ صبح مراد ہی، انما ذالك سواد الليل وبياض النهار، البتہ ایام اعتکاف میں رات کے وقت بھی عورتوں کے پاس نہیں جاسکتے۔

یہ حدود اللہ ہیں، ان کے قریب جانے کا خیال بھی دل میں نہ آئے، کیونکہ بالکل ممکن ہی کہ ان کا قرب و اتصال بتدریج حدود کے توڑنے کی دعوت دے، اور تم گناہ

میں مبتلا ہو جاؤ، اس لئے دور ہی رہنا اسلم واحوط ہے، حدیث میں آتا ہے: ان لکل ملک حمی وان حمی اللہ محارمہ فمن رتع حول الحمی یوشک ان یقع فیہ، ہر بادشاہ کی حمی ہوتی ہے، اللہ کی حمی[1] وہ فواحش ومنہیات ہیں جن کے ارتکاب سے اس نے منع فرمایا ہے، جو شخص اس کے گرد پھر گیا عجب نہیں کہ اس میں داخل بھی ہو جائے۔ اللہ نے ان قوانین کو شرح وبسط سے بیان کیا کہ لوگوں میں صلاح وتقویٰ پیدا ہو، اور قوم بدعملی وبدکرداری سے محفوظ رہے۔

---
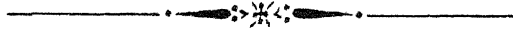
[1] سلاطین وامرا کا دستور ہے کہ وہ شکار کی خاطر جنگل کے ایک حصہ کو اپنے لئے مخصوص کر لیتے ہیں، اس میں کسی دوسرے شخص کو شکار کی اجازت نہیں ہوتی، اسی مخصوص رقبہ کو عربی میں حمی کہتے ہیں۔

معاملات

تدبیر منزل میں صرف ایک گھر کی اصلاح پیش نظر تھی، لیکن انسان کبھی اکیلا نہیں رہ سکتا، وہ فطرۃً مدنی الطبع پیدا کیا گیا ہے، ملکر رہنا اس کا طبعی تقاضا ہے، جب چند آدمی مل کر رہینگے تو تقسیم عمل کے اصول کے مطابق ہر شخص اپنی اپنی طبیعت کے مناسب کام اختیار کریگا، اور اس طرح ایک دوسرے کی ضروریات میں مدد دینگے، آپس میں مبادلۂ اشیاء کرینگے، اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ معاملات باہمی اور لین دین کے متعلق ایک قاعدہ کلیہ بیان کردیا جائے جو زندگی کے ہر شعبہ میں دلیل راہ و مشعل ہدایت کا کام دے سکے، فرمایا:

(۱۸۸) وَلَا تَأْكُلُوٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ٥	اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ اور ان کو حکام کے پاس اس لئے نہ لیجاؤ کہ لوگوں کے مالوں کا ایک حصہ جان بوجھ کر گناہ کے ذریعہ کھاؤ۔

قانون بنانے کے دو ہی مقصد ہو سکتے ہیں:۔

(الف) جھگڑے کثرت سے پیدا ہوں، عدالت کو مداخلت کا موقع ملے، اور حکومت کی جانب مرافعہ کرنے کے لئے لوگ مجبور ہوں، اس سے حکومت کی آمدنی میں اضافہ ہو جاتا ہے، خدع و فریب کا دروازہ کھل جاتا ہے، کذب آفرینی میں ترقی ہوتی ہے، اور

جھوٹے مقدمات سے عدالت کو فرصت نہیں ملتی۔[۵]

(ب) جہاں تک ممکن ہو لوگوں میں جھگڑے کم ہوں، اس کے لئے بہترین صورت یہ ہی کہ پہلے قوم کے اندر صحیح کیرکٹر پیدا کیا جائے، ہر شخص اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتا ہو، اور احتساب اعمال کا خوف دل میں ہو، اس صورت میں ہر معاملہ کا فیصلہ ان کی دیانت اور امانت پر چھوڑ دیا جائیگا، حکومت کو صرف خاص خاص حالتوں میں مداخلت کرنے کی ضرورت محسوس ہوگی، قرآن حکیم یہی چاہتا ہی، اور اس کا قانون یہی مقصد عظمیٰ پیش نظر رکھتا ہے۔

اس ایک آیت میں قرآن نے دراصل تمام ان مباحث اور فقہی مسائل کو بیان کردیا جو کتب فقہ کے صدہا اوراق میں بھی نہ سما سکے، قرآن نے روزوں کو فرض کیا کہ اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے وہ حلال چیزوں کو ترک کرنے کی اپنے اندر عادت پیدا کریں تاکہ آئندہ ناجائز طریق سے حاصل کیا ہوا مال ان کے نزدیک حرام ہو، اور اس سے پرہیز کریں۔

مبادلہ اشیا رہونے لگے، اور خرید و فروخت کی صورت ہو تو ظلم و جور سے کسی کا مال کھانے کی کوشش نہ کرنا۔ اکل المال بالباطل کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں، لوٹ مار کرکے وصول کرنا، قمار بازی، گانے بجانے کی اجرت شراب کی قیمت، اور کھیل کود سے روپیہ حاصل کرنا، رشوت لینا اور جھوٹی گواہی دینا، امانت میں خیانت کرنا اور اسی قسم کی صورتیں بیان کی جاسکتی ہیں، ام سلمہ کہتی ہیں کہ ایک مرتبہ آپ نے اپنے حجرہ کے دروازہ کے قریب لوگوں کو جھگڑتے سنا تو آپ باہر تشریف لائے اور فرمایا:

انما انا بشر وانہ یاتینی الخصم فلعل بعضھم الحن بحجتہ من بعض فاحسب انہ

---

[۵] یورپین اقوام کا طرز حکومت اسی قسم کا ہی، جہاں ان کا قدم جاتا ہی، ہر قسم کی بداخلاقی وہاں نشوونما پاتی، اور رعایا کو تباہ کرتی ہی۔

صادق فاقضی لہ فمن قضیت لہ بحق مسلم فانما ھی قطعۃ من النار فلیحملھا اویذرھا

میرے پاس مقدمہ آتا ہی، مدعی اپنی چرب زبانی سے دعویٰ ثابت کر دیتا ہی حالانکہ حق دوسری جانب ہوتا ہی، میں اس بیان کے مطابق اس کے حق میں فیصلہ نافذ کرتا ہوں، مگر وہ یہ سمجھ لے کہ ایک مسلمان کا مال ناجائز طریق سے لینا، آگ کو لینا ہی، اب وہ آزاد ہی، اسے قبول کرے، یا چھوڑ دے۔ قاضی شریح نے فرمایا: انی لا اقضی لک وانا لا اظنک ظالما ولکن لا یسعنی الا ان اقضی بما یحضرنی من البینۃ وان قضائی لا یحل لک حراما، شہادت کی بنا پر میں تمہارے حق میں فیصلہ کرتا ہوں، مگر اس بات کو خوب ذہن نشین کر لو کہ میرے حلال کرنے سے وہ چیز حلال نہ ہوگی، جب حرام ہے تو حرام ہی رہیگی۔

تدلوا بھا الی الحکام سے مراد یہ ہی کہ رشوت دیکر کسی کا مال نہ کھاؤ، جھوٹے مقدمے نہ بناؤ اور جھوٹی گواہی نہ دو،

قمری حساب ہو

(۱۸۹) یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ وَلَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰی ۚ وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○

اور تم سے چاند کے بارے میں سوال کرتے ہیں، کہدو کہ لوگوں کے معاملات اور حج کے اوقات اس سے معلوم ہوتے ہیں اور گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آنا نیکی نہیں بلکہ نیکی یہ ہی کہ ایک شخص تقویٰ اختیار کرے اور دروازوں سے ہو کر گھروں میں آئے، اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

تدبیر منزل کے احکام بیان کر دیے گئے، فصل خصومات کا قانون بھی مرتب ہو گیا، لیکن سوال یہ ہی کہ تبادلہ اشیاء اور لین دین کے جس قدر معاملات ہونگے ان کا حساب

کتاب کن مہینوں کے مطابق ہوا کریگا شمسی یا قمری؟ اس کا جواب یہ ہی کہ شمسی حساب میں بڑی دقتوں اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہی، وہ ایک ہی حالت میں رہتا ہی، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، اگر طلوع وغروب کے لحاظ سے اس میں معمولی سا تغیر ہوتا ہی تو عام نظریں اس کو محسوس نہیں کرسکتیں، اس کے لئے اعلیٰ ترین محاسبوں کی ضرورت ہی، جنتریوں کے بغیر کام نہ چل سکیگا، اور ایسے دیہات وقصبات بکثرت ملینگے جہاں کے لوگ تہذیب و تمدن کے نام سے نا آشنائے محض ہونگے، وہاں عمدہ ترین حساب دانوں کا ملنا تکلیف سے خالی نہ ہوگا، اس لئے مسلمانوں کے واسطے قمری حساب مناسب رہیگا، ان کا مذہب عالمگیر ہی، اور تمام اقوام عالم کی طرف اس کا روئے سخن ہی، چاند کی شکلوں میں جلد جلد تغیر ہوتا رہتا ہی، ہر تعلیم یافتہ اور جاہل اس فرق کو دیکھ کر اوقات معین کرسکیگا، وہی تغیرات ضبط اوقات کا کام دینگے، چنانچہ امت مسلمہ کے موسس اوّل ابراہیم نے قمری حساب کے مطابق حج کے ایّام مقرر کئے ہیں۔

اگر حساب شمسی ہوتا تو اس میں یہ بھی ایک تکلیف رہتی کہ رمضان وحج کے جو اوقات مقرر ہوجاتے وہی رہتے ان میں تغیر وتبدل نہ ہوسکتا، اگر ایک قوم اس دوام کی وجہ سے آرام میں ہوتی، تو دوسری کو مصیبت برداشت کرنی پڑتی، اب قمری حساب سے بموجب سال بھر کے مختلف موسموں میں ان فرائض کو ادا کرنے کا موقع ملیگا، اور ہر قوم ان سے بہرہ اندوز سعادت ہوسکیگی۔

زمانہ جاہلیت میں دستور تھا کہ احرام حج باندھنے کے بعد گھر میں جانا ممنوع خیال کیا جاتا تھا، اس لئے پشت کی جانب سے نقب لگا کر اندر آجاتے اور اس کو باعث ثواب خیال کرتے خدا نے کہا یہ لغو اور مہمل حرکت ہی، بہتر یہ ہی کہ تمام محرمات الٰہیہ سے پرہیز کرو، خدا کا خوف دل میں رکھو، اور پھر اگر تم دروازہ ہی سے گھر کے اندر آگئے تو گناہ کی بات نہیں۔

قرانِ حکیم کا قاعدہ یہ ہی کہ وہ ایک مثال بیان کرکے اس سے مختلف قسم کے قوانین وضوابط کا استنباط کرتا ہی، سورہ آل عمران میں غزوہ احد کا تذکرہ کرکے صدہا مسائل کا استخراج کیا، انفال میں صرف غزوہ بدر کو پیش نظر رکھکر پورا قانون جنگ مرتب کردیا، اس سے مقصد یہ ہوتا ہی کہ جو لوگ اُن قاعدوں کو اچھی طرح ضبط نہ کرسکیں، وہ اس مثال کو خوب ذہن نشین کرلیں، پھر قوانین خود بخود سمجھ میں آجائینگے۔

شریعت نے جو قانون بنایا ہی اسے گھر تصور کیجئے اب دستور یہی ہے کہ اس میں داخل ہونے کے لئے جو دروازہ بتایا گیا ہی، اسی میں سے ہوکر اندر جانا چاہیے" اگر ایک شخص اس کو بدلنے کی کوشش کرتا ہی اور دیوار پھاند کر اندر داخل ہونا چاہتا ہی تو گویا وہ مقصد اصلی کو فوت کررہا ہی، ابراہیم علیہ السلام نے حج کے لئے جو ایّام مقرر کئے وہ قمری مہینوں ہی میں آتے ہیں، اور ان کا منشا یہی ہی کہ مسلمان اپنا تمام حساب کتاب چاند پر رکھیں، اب جو لوگ اس میں ردّوبدل کی کوشش کرتے ہیں، وہ دراصل قوم کے نظام صالح کو برباد کرنا اور شریعت کی بلند عمارت کو گرانا چاہتے ہیں۔ کوئی عقلمند اسے نیکی کے نام سے تعبیر نہیں کرسکتا کہ قانون کے اصول اساسی فنا ہوں، اس کی اصلی شکل و صورت میں تغیر آجائے، بلکہ بر و احسان، اور تقویٰ و طہارت یہی ہی کہ اپنے تعلقات الٰہیہ کو درست کرلو، امام ملت نے جو قانون بنادیا ہی، اس کو مضبوطی سے پکڑلو، اگر تم نے اللہ کے قانون کی پابندی کی اور مذہب تمہاری زندگی کی ہر شاخ میں کارفرما رہا تو یقیناً علو و رفعت اور برتری تمہارے ہی لئے ہی، کیونکہ اوائل عمر ہی سے گھروں میں ایسی تعلیم دیجائیگی جس سے ایک طرف تو مذہبی جذبات و عواطف فرزندان اسلام میں راسخ ہوتے جائینگے، اور اسکے ساتھ ساتھ تدبیر منزل کے قانون پر عمل کرکے ملکوں اور قوموں کی باگ اپنے ہاتھ میں لے سکینگے، لیکن یہ نتائج و ثمرات صرف اسی صورت میں حاصل ہوسکتے ہیں جبکہ قانون الٰہی میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے، اور ادخلوا فی السلم کافۃ پر پورا پورا عمل ہو۔

باب ۶

سیاست مدن

گزشتہ اوراق میں جس قدر قوانین وضوابط بیان کئے گئے ہیں، ان کا تمام تر تعلق مسلمانوں کی تمدنی اور معاشرتی زندگی سے ہے کہ ان کی داخلی اصلاح ہر اعتبار سے مکمل ہو، جب ہم سب ملکر ایک جگہہ رہتے ہیں، اور ہماری ضروریات زندگی برابر پوری ہوتی رہتی ہیں تو ہمیں اپنا مقصد حیات بھی معین کرلینا چاہیئے اس لئے کہ مقصد کے بغیر انسان کی تمام زندگی بالکل بیکار جاتی ہے گزشتہ تعلیم نے ہم میں حس وبیداری پیدا کردی ہے، اخلاق فاضلہ اور جذبات صادقہ نے ہماری حیات انفرادی واجتماعی کو مہذب وشائستہ بنا دیا ہے، تدبیر منزل کے بنیادی اصولوں نے ہمارا رشتہ خدائے واحد کے ساتھ جوڑ دیا ہے، فوجداری اور دیوانی قانون نے اصول مساوات کی بنا پر ہمارے لئے ترقی کی تمام راہیں کھولدی ہیں، پس جو قانون اس قدر زندگی بخش ہو، کیوں نہ اسی کی نشر واشاعت، اور تبلیغ ودعوت کو اپنی غایۃ الغایات بنالیا جائے۔

تمام دنیا جہالت وتاریکی میں مبتلا ہے، اوہام ووساوس کے پنجہ میں گرفتار ہے، اصنام وطواغیت، اور دجاجلہ کفر وشیطنت کے آگے سرنگون ہے، خدائے واحد کو چھوڑ کر معبودان باطل، اور ارباب متفرقون کو اپنا خدا مانتی ہے، پس تم مسلمان اس قانون الٰہی کی نشر واشاعت کے لئے ہر کیف کوشش کرو، اعلائے کلمۃ اللہ تمہارا مقصد حیات ہو، اسی کی سرفرازی وسربلندی کے لئے اپنی ہر متاع عزیز قربان کردو کہ دنیا میں پھر ایک مرتبہ

حق کی روشنی پھیل جائے، اور لوگ خدائے واحد کے پرستار بن جائیں۔

فصل اوّل

جہاں گیری

کوئی مقام مستثنےٰ نہیں

(۱۹۰) وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ۝

جو لوگ تم سے جنگ کریں تم بھی ان سے اللہ کی راہ میں لڑو، اور زیادتی نہ کرو، اور اللہ زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

تمام دنیا مسلمانوں کی جولانگاہ ہے، کرۂ ارضی کے گوشہ گوشہ میں انہیں اسلام کی نشر و اشاعت کرنی ہے کہ خیر امۃ اخرجت للناس کے مصداق حقیقی بن جائیں، مگر جس وقت حق و صدق کی دعوت کے لئے نکلینگے تو دوسری قومیں ضرور ان کی راہ ترقی میں رکاوٹ پیدا کرینگی کہ ہر ایک میں اپنی زندگی کا عشق اور بقا کی محبت رکھی گئی ہے تنازع للبقا کا قانون کائنات ارضی کی ہر چیز میں موجود ہے، دنیا میں زندہ رہنا صرف ایک مسلم ہی کا حق ہے اس لئے کہ وہ اصلح و امثل ہے، پس مخالفین کو اتنی مہلت ہی نہ دیجائے کہ وہ مبلغین اسلام کے فنا کرنے کی تیاریاں کریں، بلکہ واعدوالھم ما استطعتم من قوۃ پر عمل پیرا ہو کر انہیں فوراً کچل دیا جائے۔

لیکن یہ تمام تر جنگ و جدل صرف کلمہ حق کی خسروی و نفوذ، اور سچائی کی بادشاہت کے لئے ہو، قانون الٰہی کی نشر و اشاعت، اور اس کی تمکین فی الارض غایت الغایات ہو، نہ تو حمیت قومی اس کا سبب ہو، اور نہ شہرت و ناموری کی بنا پر اس قدر خونریزی کی جائے

دوسری جگہہ آیا: وقتلوھم حتی لا تکون فتنۃ و یکون الدین للہ (۲: ۱۹۲)

ابو موسیٰ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ سے دریافت کیا کہ بعض لوگ غنیمت کی خاطر جنگ کرتے ہیں، بعض کا مطمح نظر شہرت و ناموری ہوتا ہے، کسی کا مقصد عزت و مرتبت ہوتا ہے، ان میں سے فی سبیل اللہ کون ہے، آپ نے فرمایا فی سبیل اللہ اس شخص کو کہا جائیگا جو صرف اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے لڑتا ہے۔ جاء رجل الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال الرجل یقاتل للمغنم والرجل یقاتل للذکر والرجل یقاتل لیری مکانہ فمن فی سبیل اللہ قال من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ۔

ابو داؤد نے ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے: ان رجلا قال یا رسول اللہ رجل یرید الجھاد فی سبیل اللہ وھو یبتغی عرضا من عرض الدنیا فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا اجر لہ۔ ایک نے آپ سے سوال کیا کہ ایک شخص جہاد فی سبیل اللہ میں شریک ہوتا ہے مگر دنیا کی عزت و کرامت اور جاہ و حشمت کا طالب ہے، آپ نے فرمایا کہ اسے ذرّہ برابر بھی اجر نہ ملیگا۔

کائنات خلت حضرت ابراہیم کے مقامات ذہاب الی اللہ میں تم پڑھ آئے ہو کہ انہوں نے قوم اور وطن کو توحید خالص کے لئے قربان کیا تو پیشوائی عالم کے لئے چن لئے گئے، پس یہ تمام تصریحات واضح کرتی ہیں کہ جہاد کی اصلی غرض وغایت صرف اعلائے کلمۃ اللہ ہو، مگر جنگ صرف ان لوگوں سے ہو، جن سے مخالفت کا اندیشہ ہے یا جو اسلام کو تباہ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں، ایسے لوگوں کو فوراً قتل کر دینا چاہیے، اگر انہیں مہلت دی، اور وہ اس درمیان میں آلات حرب سے مسلح ہو گئے تو پھر کامیابی کی کوئی صورت نہ ہوگی، البتہ ان لوگوں سے تعرض کرنے کی ضرورت نہیں جو خطرۂ جنگ کرنے سے عاجز ہیں، ان میں لڑنے کی استعداد و قابلیت ہی نہیں، اور نہ وہ کسی قسم کی تیاری کر سکتے ہیں، اگر ان سے بھی جنگ شروع کر دو گے تو ہماری برکتوں کا سلسلہ بند ہو جائیگا، حدیث میں آتا ہے کہ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو قتل نہ کرنا چاہیے، ہاں اگر ان میں سے کوئی

امام کی حیثیت رکھتا ہو، اور اس کے وجود پر فتح وشکست کا دارومدار ہو تو اس کا قتل کرنا سیاسی مصالح کی بنا پر ضروری ہوگا: نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن قتل النساء والصبیان، ابن عباس نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہی ولا تقتلوا النساء والصبیان والشیوخ والرھبان ولا من القی الیکم السلام،

یہودیوں میں بچے، عورتیں، اور بوڑھے سب کے سب تہ تیغ کردیے جاتے بلکہ جانوروں تک کو مار ڈالتے، کھیت باغات اور گھروں کا تمام مال ومتاع آگ کی نذر ہوتا، یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہی کہ وہ عین انتہائی جوش وغضب کے موقع پر بھی اعتدال کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا، اور بار بار تقوی وطہارت اور عفو ودرگزر کی تعلیم دیتا ہی مکہ کی فتح اور حضرت عمر کا داخلہ بیت المقدس صدہا امثال ونظائر میں سے دو ہیں۔

(۱۹۱) وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ۭ كَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝	اور ان کو جہاں پاؤ قتل کرو، اور جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہی، وہاں سے تم انہیں نکال دو، اور فتنہ قتل سے بڑھ کر ہے، اور جب تک وہ لوگ تم سے مسجد حرام کے پاس جنگ نہ کریں تم بھی اس جگہ ان سے نہ لڑو، لیکن اگر وہ تم سے لڑیں تو تم بھی ان سے لڑو، کافروں کی یہی سزا ہی،
(۱۹۲) فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝	پھر اگر باز آجائیں تو بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہی۔

ایسے مخالفین ومعاندین اسلام کو، جو ہر وقت تمہارے فنا کرنے کی تیاریاں کرتے رہتے ہیں، جہاں پاؤ قتل کردو، ان کو چھوڑ دینا، اور مخالفت کا موقع دینا ہرگز قرین عقل وانصاف نہیں، جب وہ تمہارے قتل کے لئے ہر مناسب موقع کی تلاش میں رہتے ہیں تو تم انہیں کیوں چھوڑتے ہو، ایک جگہ آیا: لا یرقبون فی مومن الا ولا ذمہ (۹: ۱۰) ایک دوسرے مقام پر یوں ارشاد ہوا: الا تقاتلون قوما نکثوا ایمانہم وھموا

باخراج الرسول وھم بدؤکم اول مرۃ ط (۹ : ۱۳)
بیت اللہ الجلیل کے اصلی وارث مسلمان تھے اس لئے کہ یہی ابراہیمی ملت کے
پابند تھے : ان اولی الناس بابراھیم للذین اتبعوہ وھٰذا النبی والذین اٰمنوا ط
(۳ : ۶۱) مگر کفار نے ان کو وہاں سے نکال دیا، اور خود اس پر غاصبانہ قبضہ کرلیا، اب
مسلمانوں کا فرض ہی کہ اس مرکز سے ان کو الگ کردیں، اور اس جگہہ کو واپس لے لیں،
مگر مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ صرف بیت اللہ پر قبضہ کرکے ان کا فرض نہیں ختم ہوجاتا،
وہ شھداء علی الناس کے درجہ پر فائز کئے گئے ہیں، وما ارسلنٰک الا کافۃ للناس بشیرا
ونذیرا ان کا طغرائے امتیاز ہی، خیر امۃ اخرجت للناس ان کی خصوصیت کبریٰ ہی،
دنیا میں جس قدر انبیاء علیہم السلام آئے، ان کے وارث اصلی اب مسلمانوں کے سوا اور
کوئی نہیں، ان رسولوں نے اپنی اُمتوں کے لئے مرکز قائم کئے مگر کچھہ مدت کے بعد
ناخلف ان پر قابض ہوگئے، اس لئے بیت اللہ کو اپنے قبضہ میں لینے کے بعد ان کا دوسرا
فرض یہ ہوگا کہ دنیا بھر میں جس قدر مذہبی مرکز ہیں ان پر بھی قبضہ کرلیں تاکہ صحیح معنی
میں شھداء علی الناس کے مصداق بن سکیں،

آگے چل کر اس حکم کی علت بتادی کہ بلاشبہ یہ جنگ قتل ہی، اور انسانی قتل بہت
بڑی برائی ہی، لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ کتنی بڑی خرابی ہی کہ لوگ اپنی اپنی آبادیوں
اور حکومتوں پر قناعت نہیں کرتے، دوسروں کے حقوق آزادی وحریت اور حکومت
وفرماں روائی چھینا چاہتے ہیں، توحید کی جگہہ کفر وشرک کے ماتحت مسلمانوں کو لانا
چاہتے ہیں، اگر اس کے دفع کا انتظام نہ کیا جائے، تو پھر دنیا میں کوئی قوم زندہ نہیں
رہ سکتی، پس ایک بڑی برائی کے دور کرنے کے لئے چھوٹی برائی اختیار کرلینی چاہیے
یہ خود قدرت کا عالمگیر قانون اور کارخانہ قدرت کا دائمی عمل ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو
خدا کبھی جنگ کا حکم نہ دیتا۔

اتاہ رجلان فی فتنۃ ابن الزبیر فقالا ان الناس صنعوا وانت ابن عمر وصاحب النبی صلی اللہ علیہ وسلم فما یمنعک ان تخرج فقال یمنعنی ان اللہ حرم دم اخی فقال الم یقل اللہ فقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ، فقال قاتلنا حتی لم تکن فتنۃ وکان الدین للہ وانتم تریدون ان تقاتلوا حتی تکون فتنۃ ویکون الدین لغیر اللہ۔

عبداللہ بن زبیر کے فتنہ میں دو شخص ابن عمر کے پاس آئے اور کہا، لوگوں نے کیا کچھ کیا ہی، آپ عمر کے صاحبزادے، اور رسول علیہ السلام کے صحابی ہیں کیوں نہیں نکلتے، اُنہوں نے جواب دیا، مجھے یہ بات منع کرتی ہی کہ اللہ نے میرے بھائی کا خون حرام کر دیا ہی، اُنہوں نے عرض کیا کیا اللہ کا یہ حکم نہیں فقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ، ابن عمرؓ نے کہا ہم نے جنگ کی یہاں تک کہ فتنہ فرو ہو گیا، اور صرف اللہ کا دین ہو گیا، اور تم اس لئے جنگ کرتے ہو کہ فتنہ پیدا ہو اور غیر اللہ کیلئے دین ہو جائے۔

دونوں روایات کے ملانے سے اس آیت کے معنی خود بخود صاف ہو جاتے ہیں کہ تم برابر جنگ کرتے رہو تا آنکہ فتنہ و فساد کے اجزاء و عناصر محو و باطل ہو جائیں کلمۃ اللہ اور قانون الٰہی بلند و برتر ہو، کسی شخص کو خدائی قانون کی خلاف ورزی کی طاقت نہ ہو اور اگر کوئی شخص اس کی توہین کرے تو حکومت اس کو فوراً سزا دے۔ اسلام اس امر کا آرزو مند ہی کہ قانون الٰہی عام ہو جائے، جملہ مذاہب امن و اطمینان سے اس کے ماتحت زندگی بسر کرسکیں، مذہبی مقامات، گرجے، عبادت گاہیں اور مسجدیں بدکار لوگوں کی دست بُرد سے محفوظ رہیں، اسلام کی راہ ترقی میں رکاوٹ نہ پیدا کریں، خود آپس میں لڑنے نہ پائیں، جب کبھی ان میں سے کوئی اسلام کے قانون کی علی الاعلان توہین کرے تو اس سے مواخذہ کیا جائے، اور سلطنت جس قانون کے بقاء و استحکام کو اپنی غایت الغایات بنالے وہ قرآن حکیم تسلیم کیا جائے۔

صرف یہی ایک صورت ہی جس سے دنیا میں امن قائم رہ سکتا ہی، ورنہ فتنہ ہمیشہ

سر اُٹھاتا رہیگا، اور لوگ کبھی چین سے زندگی بسر نہ کرینگے، اگر یہ لوگ اسلام کی مخالفت سے باز آجائیں، اور اس کی صرف دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں:

(الف) جس وقت مسلمانوں نے ان کو اسلام کی دعوت دی، ان کے شبہات و شکوک کو دور کر دیا تو وہ لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

(ب) اسلام قبول کرنے کو تیار نہیں، مگر اس کی مخالفت نہ کرنے کا بھی عہد کرتے ہیں، اور لوائے توحید کے ماتحت رہنا پسند کرتے ہیں، تو شوق سے رہیں مگر انہیں جزیہ ادا کرنا ہوگا۔

اگر ان دو باتوں میں سے کوئی بھی ان کو اسلام کی مخالفت سے باز نہ رکھ سکے، اللہ کے قانون کی خلاف ورزی کرتے رہیں، اور برابر اسلام کی تباہی کے لئے تدبیریں سوچتے رہیں، تو پھر ان کی سزا قتل ہوگی، اور انہیں کبھی معاف نہیں کیا جائیگا۔

کوئی وقت مستثنیٰ نہیں

(۱۹۴) اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ۭ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ؀	ادب والے مہینوں کا معاوضہ ادب والے مہینے ہیں، اور ادب کی تمام چیزوں میں مساوات ہی توجو تم پر زیادتی کرے تو جس قدر زیادتی اس نے تم پر کی ویسی ہی زیادتی تم بھی اس پر کر لو اور اللہ سے ڈرو، اور یہ جان لو کہ اللہ ڈرنیوالوں کے ساتھ ہے

اشہر حرم، جن میں جنگ کرنے کی ممانعت ہے چار ہیں، رجب، ذی قعد، ذی الحجہ اور محرم، ان مہینوں کا احترام زمانہ جاہلیت میں کیا جاتا تھا، جنگ بند کر دی جاتی، راستے کھل جاتے، اور تجارت شروع ہو جاتی، مسلمانوں کو اب بھی یہی حکم ہے کہ ان مہینوں میں جنگ نہ کریں، لیکن اگر کفار کی طرف سے ابتدا ہو تو ان کو جواب دینا مسلمانوں کا اوّلین فرض ہے۔

مگر اس کا بہترین جواب یہ ہوگا کہ چونکہ کفار و مشرکین نے ہمارے مہینوں کی حرمت کو برباد کیا ہی، اس لئے ہم ان کے پاک مہینوں میں ان پر حملہ کریں، اور اس طرح ان کو ذلیل و رسوا کردیں، جب انہوں نے ہماری عزت و حرمت کا خیال نہیں کیا تو ہم کیوں ان کی پروا کریں؟ یہی قصہ باقی قابل احترام چیزوں کا ہی، اگر وہ تمہاری مسجدوں کو شہید کریں تو تم ان کی عبادت گاہوں کو زمین کے برابر کردو، اگر وہ تمہاری عورتوں کی عصمت و آبرو برباد کریں تو تم ان کی عورتوں کو لونڈی بنالو کہ یہ اس سے بھی زیادہ ذلت و رسوائی ہی، یہ مساوات کا سلوک ہی، ان کی بداخلاقی کی سزا صرف اسی صورت میں ہوسکتی تھی۔

کسی قوم پر اللہ کا سب سے بڑا انعام یہ ہوتا ہی کہ اس کے ارادہ میں جزم و استحکام پیدا ہو، ہمت بلند، اور عزم و استقلال پورا ہو، مسلمانوں کا فرض ہی کہ وہ اپنے ارادوں کو مضبوط رکھیں، اللہ کے قانون کی عزت و حرمت ان کے پیش نظر رہے، ایسے لوگوں کی ہر موقع پر دستگیری کی جائیگی۔

جہاد ہی میں زندگی ہی

جہاد فی سبیل اللہ کے لئے قدم قدم پر روپیہ کی ضرورت ہوگی، اگر ہر ایک مسلمان لڑنے کے لئے تیار ہوگیا، اور حکومت کے پاس روپیہ نہ ہوا تو سخت دقتیں پیدا ہوں گی، سامان حرب کی خریداری نہ ہوسکیگی، پھر اس کے علاوہ سلطنت کے اور سینکڑوں کام ہیں، جو روپیہ کے بغیر پورے نہیں ہوسکتے، خصوصًا ایسے وقت میں تو روپیہ کی اور بھی زیادہ ضرورت ہی جبکہ دشمن نے مسلمانوں کا نام و نشان مٹانے کی ٹھان لی ہو، اسلئے فرمایا:

(۱۹۵) وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَی التَّهْلُكَةِ ۛ وَاَحْسِنُوْا ۛ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۝	اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو، اور اپنے تئیں اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو، اور قانون کی پابندی اچھی طرح کرو، اللہ اچھی طرح قانون کی پابندی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہی۔

اس آیت کا مفہوم سمجھنے میں اکثر لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے، حالانکہ اس کے الفاظ اپنا مفہوم ادا کرنے میں بالکل صاف اور غیر مشتبہ ہیں، ابو ایوب انصاری کی روایت اس کی بہترین تفسیر ہے، وہ فرماتے ہیں:

نزلت هذه الآية فينا معشر الانصار لما اعز الله الاسلام وكثر ناصروه، قال بعضنا لبعض سرا، ان اموالنا قد ضاعت وان الله اعز الاسلام، فلو اقمنا في اموالنا فاصلحنا ما ضاع منها، فانزل الله علينا يرد علينا ما قلنا، وانفقوا في سبيل الله ولا تلقوا بايديكم الى التهلكة، فكانت التهلكة الاقامة على الاموال واصلاحها وتركنا الغزو، ہم انصاریوں کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی، جس وقت اللہ نے اسلام کو عزت دی، اور اس کے مددگار بہت ہو گئے، تو ہم میں سے بعض نے خفیہ طور پر کہا کہ ہمارے اموال برباد ہو گئے، اب جبکہ اسلام کو اللہ نے غالب کر دیا ہے اگر ہم اپنی زراعت کا خیال کریں، اور زمین کو درست کر لیں تو برباد شدہ حصہ ٹھیک ہو جائیگا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اپنی زمین پر جاکر اقامت گزین ہوتا، اسکو درست کرنا اور جہاد ترک کرنا ہلاکت تھا۔

مذکورۃ الصدر روایت نے بتا دیا کہ جہاد ترک کر دینا تباہی و بربادی ہے، صرف روپیہ دیکر اپنی جان چھڑا لینا کافی نہیں، بلکہ روپیہ دینے کے ساتھ ساتھ خود جنگ کی تیاری اور جہاد میں شرکت ضروری ہے، ایسے موقع پر جبن اور بخل سے کام لینا، اپنے آپ کو ضعیف و کمزور، اور مخالف کو قومی و طاقتور بنانا ہے، پس جان اور مال، دونوں کو حاضر کرو، وجاهدوا باموالكم وانفسكم، اور جو قانون تم کو دیا گیا ہے، نیک نیتی سے اس کی پابندی کرو، اللہ تمہاری نصرت و دستگیری کریگا، البتہ جن لوگوں کی نیت صالح نہیں ہوتی، اور صرف لوگوں کو دکھانے کے لئے قانون پر عمل کرتے ہیں، اللہ کے نزدیک ان کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔[۱]

(صفحہ ہذا کا حاشیہ صفحہ ۳۲۲ پر ملاحظہ فرمائیے)

فریضۂ حج

جہادِ فی سبیل اللہ کے مسائل بیان کرتے کرتے درمیان میں قرآن نے حج بیت اللہ الحرام کا تذکرہ شروع کر دیا، اور کچھ دور تک اس کا ضابطہ بیان کیا، اس سے فارغ ہونے کے بعد پھر جہادِ فی سبیل اللہ کی طرف توجہ کی گئی، اگر ماقبل و مابعد میں درس و فکر سے کام لیا جائے تو فوراً معلوم ہو جائیگا کہ قتال فی سبیل اللہ اور حج بیت اللہ میں نہایت ہی اعلیٰ درجہ کا ربط و تعلق ہے، مگر اس ربط کو معلوم کرنے سے قبل تمام اعمال اسلامی پر نظر ڈال لیجئے:۔

نماز ہر مسلمان مرد و عورت پر لازم کر دی گئی کہ جنگی خدمت ہر فرزند اسلام کے لئے ادا کرنا ضروری ہی، بیک وقت ایک لشکر جرار تیار ہو، جس کے اندر قربانی کا جذبہ صادقہ، اور اپنے امیر کی اطاعت راسخ ہو، اور جو ہر قسم کی تکلیف و مصیبت برداشت کر سکے۔

زکوٰۃ، اپنی آمدنی کا چالیسواں حصہ فقرا و مساکین کو دے کہ ایک طرف تو اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی عادت ہو، تاکہ جب خلافت اسلامی کو اس کی دولت کی ضرورت ہو تو اپنی تمام جائداد راہ حق میں لٹا سکے[1] اور ایک کوڑی بھی اپنے پاس نہ رکھے، اور دوسری جانب ابنائے جنس کے ساتھ ہمدردی و رحم پیدا ہو جو ایک جذبہ فطری ہی، بخل و امساک کے عیوب سے پاک رہے، اور قوم بھیک مانگنے سے بچ جائے۔

رمضان کے روزوں سے غرض یہ بھی کہ مسلمان اپنے اندر بھوک، پیاس، اور دوسری تکلیفوں کے برداشت کرنے کی عادت پیدا کریں، اور اگر کبھی انھیں مخالفین و معاندین اسلام کے مقابلہ میں مصائب و شدائد کا سامنا ہو تو ہمت نہ ہار دیں۔

(حاشیہ صفحہ ۳۲۱) [1] آج ہندوستان کے مسلمانوں کا سب سے بڑا فرض یہی ہی کہ وہ اپنی تمام جائداد اللہ کی راہ میں قربان کر دیں، یورپ نے انکے فنا کرنے کا عزم کر لیا ہی، ہم لوگ اگر بدبختانہ شمشیر کا قبضہ ہاتھ میں لینے کی طاقت نہیں رکھتے تو کیا ہوا، ہماری جیبیں تو سونے کے سکوں سے بھرپور ہیں، کیوں نہ انہیں کو خلافت اسلامی کی بقا و قیام کیلئے کھولدیں، یہ کیا مصیبت ہی کہ ترکوں کے سینے تو گولیوں سے چھلنی ہوں، اور ہم سے اتنا بھی نہو کہ ایک وقت صرف خشک روٹی ہی پر قناعت کرلیں۔

ایک فوج کے لئے جن امتیازات وخصائص کی ضرورت ہی، اور جن کے بغیر کوئی لشکر کامیاب نہیں ہوسکتا، وہ تو یہی ہیں، عام مسلمانوں نے ان کی پابندی کرلی، مگر ابھی یہ دیکھنا باقی ہے کہ ان میں کتنوں نے صرف ظاہری صورت کی پرستش کی، اور حقیقت سے بالکل غافل رہے، اور وہ کس قدر ہیں جو مشکل سے مشکل کام میں بھی ہاتھ ڈال سکتے ہیں اور ہر کٹھن منزل میں قدم رکھنے کے قابل ہیں، اس لئے کام شروع کرنے سے قبل ان کا امتحان ضروری ہی، وہ امتحان یہی فریضۂ حج ہی تاکہ مضبوط اور توانا سپاہیوں کا انتخاب ہوسکے۔

اسلام ایک پیغام محبت ہی جو بچھڑے ہوؤں کو ملاتا، بیگانوں کو اپنا، اور آشناؤں کو صدیق حمیم بنا دیتا ہی۔ اہل محلہ میں محبت دیگانگت پیدا کرنے کے لئے پنجگانہ نمازوں کے وقت محلہ کی مسجد میں جمع ہونا واجب کیا گیا، شہر والوں کے تعلقات کو محکم و استوار کرنے کے لئے ہفتہ میں ایک مرتبہ مسجد جامع میں نماز جمعہ ادا کرنا ضروری ٹھیرایا گیا، اہل شہر اور قرب وجوار کے دیہات کے رہنے والوں میں تعارف اور شناسائی کو پیدا کرنے کے لئے سال میں دوبار عید کی نماز قائم کی گئی، اور آخرکار عالم اسلامی میں رابطۂ دین ومذہب مضبوط تر کرنے کی خاطر، مختلف قوموں، مختلف نسلوں، مختلف زبانوں، مختلف رنگتوں، اور مختلف ملکوں کے رہنے والوں پر عمر بھر میں ایک دفعہ حج بیت اللہ فرض کیا گیا کہ دین واحد کی وحدت میں سب کے سب شامل ہوسکیں۔

حج کے احکام ملاحظہ ہوں ان کو جنگ کے ساتھ کس قدر شدید مناسبت ہی:۔

(۱) تمام حاجیوں کو سادہ بن سلا لباس پہننا پڑتا ہی، جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہی کہ ایک ہی رسول، ایک ہی قرآن، اور ایک ہی کعبہ پر ایمان رکھنے والے، ایک ہی صورت، ایک ہی لباس، اور ایک ہی سطح پر نظر آئیں، چشم ظاہر بین کو ان اتحاد معنوی رکھنے والوں کے اندر کوئی ظاہری اختلاف محسوس نہ ہو، یہ اللہ کا لشکر ہے،

اور سب کے سب ہیں، فوج میں یونیفارم ہونا ضروری ہے۔

(۲) ان لوگوں کو ایک خاص قانون کی پابندی کرنی پڑتی ہے، سر منڈانا، ناخن کتروانا، شکار کرنا، اور عورتوں سے مباشرت کرنا ممنوع ہے، اگر کوئی شخص ان کا مرتکب ہو تو اسے جرمانہ ادا کرنا پڑیگا کہ حاکم علی الاطلاق کی اطاعت راسخ ہو، اور اس کے احکام ہماری مصلحتوں کے خواہ کیسے ہی مخالف ہوں، مگر ہماری گردنیں ان کے آگے جھک جائیں

(۳) ایک شخص نے حضور اقدس سے دریافت کیا کہ حج کسے کہتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ عرفات کے میدان میں جانے کا نام حج ہے، جو شخص تمام ارکان حج ادا کرے، اور میدان عرفات میں حاضر نہ ہو تو اس کا حج نہ ہوگا، گویا جس طرح آج تم خدائے واحد کی غلامی کا اظہار کرنے کے لئے اس میدان میں آئے ہو، آئندہ جب کبھی مسلمانوں کے خلیفہ کو کسی میدان جنگ میں اعلائے کلمۃ الحق کی خاطر تمہارے اجتماع کی ضرورت ہو تو اسی طرح عزیزو قریب، وطن (دیار) اور مال (جائداد) کو چھوڑ کر حاضر ہو جانا، اس میدان کی حاضری ایک طرح کی فوجی نمایش ہوگی کہ کس قدر لوگ جنگ کے لئے تیار ہوئے ہیں۔

(۴) ہر حاجی کے لئے ضروری ہے کہ جب حج کو روانہ ہو تو اپنا زادراہ لیکر جائے تاکہ دوسروں کے لئے باردوش نہ بن جائے، ایسے ہی ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ جہاد کی تیاری میں مصروف رہے، اور ہر قسم کا ضروری سامان حرب اپنے پاس رکھے۔

(۵) ارکان حج سے فارغ ہو کر اپنی طاقت کے مطابق جانور ذبح کرے تاکہ معلوم ہو کہ ہم خود بھی خدائے قدوس کے نام پر قربان ہونے کو تیار ہیں، لن ینال اللہ لحومہا ولا دماءھا ولکن ینالہ التقوی منکم۔

(۶) حج میں تین چیزوں کی ممانعت ہے: (۱) بیحیائی کی باتیں اور ناشائستہ کلام (۲) ناشائستہ باتوں سے اپنے بھائیوں کو مخاطب کرنا (۳) لڑنا، جھگڑنا، اس میں تعلیم دی کہ جب مسلمانوں کا لشکر ایک جگہہ پر جمع ہو تو اسے ان باتوں سے پرہیز کرنا چاہیے تاکہ

آپس میں اختلاف و منازعت نہ ہونے پائے۔

(۷) ایک مرکز پر اجتماع سے مقصد یہ تھا کہ ان میں عالمگیر اتحاد و اشتراک پیدا ہو، شوکت اسلام کا اظہار ہو، بحری اور برّی سفر کے فوائد حاصل ہوں، اللہ کے بندوں کا عظیم الشان دربار منعقد ہو، فوجی نمایش ہو، عالمگیر اتحاد اسلامی کا سالانہ جلسہ ہو، آثار قدیمہ کے جویا، صنادید عالم کے متلاشی، عالمان طبقات الارض، واقفان علم الالسنہ، اور محققین تاریخ اقوام و جغرافیہ عالم اپنی علمی تحقیقات کو فروغ دیں۔

(۸) جب فرزندان اسلام ان تکالیف و شدائد کو برداشت کریں گے تو کوئی قوم ان کا مقابلہ نہ کر سکے گی، وہی حزب اللہ ہوگی جس کی فلاح و کامرانی کا وعدہ لسان الٰہی نے بار بار دیا ہے: ان حزب اللہ ہم المفلحون، وان جندنا لہم الغٰلبون

(۹) حج اگر مقصد اصلی ہو اور پھر تجارت بھی کرلے تو جائز ہے ایسے ہی جہاد فی سبیل اللہ میں قانون الٰہی کی بلندی و برتری تو اصلی مقصد ہو، اس کے بعد اگر مال غنیمت بھی مل جائے تو کوئی حرج کی بات نہیں۔

(۱۰) حج کے بعد دو قسم کے آدمی فوراً ممتاز ہو جائیں گے، ایک وہ جن کے سامنے دنیا اور اس کی مالوفات ہیں، من یقول ربنا اٰتنا فی الدنیا وما لہ فی الاٰخرۃ من خلاق، (۲ : ۲۰۰) اور دوسرے وہ جو دنیا اور آخرت دونوں کے طالب ہیں ومنہم من یقول ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الاٰخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار۔ یہی دوسری جماعت جنگ میں کام کرنے کے قابل ہوگی، تلک عشرۃ کاملۃ۔

حج کے احکام

(۱۹۶) وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ۭ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ	اور حج و عمرہ کو اللہ کے لئے پورا کرو، اور اگر محصور ہو جاؤ تو جیسی کچھ میسر آئے قربانی کرو، اور جب تک قربانی اپنے ٹھکانے نہ پہنچ جائے اپنا سر نہ منڈاؤ پھر

مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ۥ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۵

جو شخص تم میں بیمار ہو، یا اسے سر کی طرف سے تکلیف ہو، تو بدلہ ہے روزے یا خیرات یا قربانی پھر جب با امن ہو جاؤ، تو جس قدر قربانی میسر آئے، اور جس کو میسر نہ ہو تو زمانہ حج میں تین دن کے روزے رکھے، اور جب واپس آؤ تو سات، یہ پورے دس ہوگئے، یہ قانون اس شخص کے لئے ہے جس کے گھر والے مسجد حرام کے پاس نہ ہوں اور اللہ سے ڈرو، اور اس بات کو جانے رہو کہ اللہ سخت عذاب والا ہے۔

مسلمانوں کو مضبوط اور طاقت ور سپاہی بنانے کے لئے حج و عمرہ کا حکم دیا جاتا ہے، حج کے مقامات حسب ذیل ہیں: (۱) بیت اللہ جس کا طواف کیا جاتا ہے (۲) صفا اور مروہ کی پہاڑیاں جو بیت اللہ الجلیل کے پاس ہیں، عمرہ میں صرف بیت اللہ کا طواف کیا جاتا ہے، اور ان دو پہاڑیوں کے درمیان دوڑا جاتا ہے، (۳) شہر سے مشرق کی جانب تین میل کے فاصلہ پر منیٰ ہے، (۴) منیٰ سے آگے بڑھ کر تین میل پر مزدلفہ ہے (۵) مزدلفہ سے تین میل پر عرفات کا میدان ہے، فریضہ حج تین طریق پر ادا کیا جاتا ہے:-

(الف) افراد، ایّام حج میں صرف حج ہی ادا کیا جائے، اس سے فارغ ہونے پر عمرہ کا احرام باندھے۔

(ب) تمتع، حج کے مہینوں میں عمرہ کا احرام باندھے، اس کے تمام ارکان پورے کرے، اور پھر اسی سال حج بھی کرے، تمتع کے معنی فائدہ اُٹھانے کے ہیں، ایک شخص عمرہ سے فارغ ہو کر احرام کھول دیتا ہے اور اپنے وقت پر حج کر لیتا ہے، اس درمیانی وقت میں وہ ان چیزوں سے فائدہ حاصل کرتا ہے، جو احرام کی حالت میں ناجائز تھیں، گویا عمرہ

کی وجہ سے حج کے لئے تمتع کرتا ہی، اس لئے اس کو متمتع کہا گیا۔

(ج) قِران، حج کے مہینوں میں حج اور عمرہ، دونوں کی یکجائیت کرے، اور دونوں کے لئے احرام باندھ لے، دوسری صورت یہ ہی کہ موسم حج میں صرف عمرہ کا احرام باندھے، مگر اس کا احرام کھولنے سے قبل حج بھی ساتھ ہی ملالے۔

چونکہ حج اور عمرہ کا مقصد فوجی تربیت کی تکمیل ہی، اس لئے بہتر یہی ہی کہ مسلمان دو جداگانہ سفر کریں، ایک حج کے لئے دوسرا عمرہ کے لئے، اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ عمرہ کے ایام میں مکہ مبارکہ کے تمام ضروری حالات سے واقفیت ہو جائیگی، اس لئے حج کے موقع پر اس امر کے لئے آسانی پیدا ہو جائیگی کہ امت مسلمہ کے بہترین دل و دماغ سے تبادلہ افکار و خیالات کرے، ان کی صحبت و ہم نشینی سے فیضیاب ہو، اور دنیا بھر کے مسلمانوں کے نشو و ارتقت اور حیات اجتماعی پر غور کرے۔

البتہ اگر کوئی شخص راہ کی بدامنی یا بیماری کی وجہ سے رک گیا، اور حج و عمرہ کے لئے نہ جاسکا، تو اپنی استطاعت کے مطابق قربانی کا جانور وہاں بھیجدے، یا کسی معتبر آدمی سے کہدے کہ قربانی کے روز میری طرف سے بھی وہاں ایک جانور ذبح کر دینا، جب اسے گمان غالب ہو کہ میرا جانور ذبح ہو گیا ہوگا، تو احرام کھولدے، اس سے قبل سر منڈانے، یا بال کتروانے اور احرام کھولنے کی اجازت نہ ہوگی، اس سے معلوم ہوتا ہی کہ حج کی صورت مقصود نہیں بلکہ قربانی کا جذبہ پیدا کرنا منظور ہی، کیونکہ اگر صرف صورت ہی پیش نظر ہوتی تو جب تک حج ادا نہ ہوتا، احرام کھولنے کی اجازت نہ ہوتی، سر منڈانے کی اجازت حالت احرام میں اس شخص کو مل سکتی ہی، جو بیمار ہو جائے، اس کے سر میں جوئیں پڑجائیں، یا اور کوئی مرض ہو، مگر باوجود اس کے اسے جرمانہ ادا کرنا ہوگا، جرمانہ ادا کرنے کی تین صورتیں ہیں:-

(۱) سر منڈا کر تین دن روزے رکھے۔

(۲) چھ مسکینوں کو صدقۃ الفطر کی مقدار کے مطابق الگ الگ گیہوں دیدے یعنی فی مسکین پونے دو سیر۔

(۳) بکری ذبح کرکے فقرا میں تقسیم کردے۔

ان میں سے جونسی صورت چاہے اختیار کرسکتا ہی۔

جب دشمن کا خوف دامن گیر نہ ہو، اور چاروں طرف امن قائم ہو جائے تو جو شخص تمتع یا قران کے طریق پر حج ادا کرے، اُسے ایام حج میں حرم کے اندر ایک جانور ذبح کرنا ہوگا، اور اگر قربانی کی طاقت نہ ہو تو اس کے عوض میں دس روزے رکھنے پڑینگے، تین دن کے روزے نویں ذی الحجہ سے قبل اور باقی حج سے فارغ ہو کر وطن میں آکر رکھ لے۔

حج افراد تو ہر شخص کرسکتا ہی مگر تمتع اور قران کی صرف ان لوگوں کو اجازت ہی، جو دور و دراز کے رہنے والے ہوں، اور میقات کی حدود میں ان کے گھر نہ ہوں، میقات کے اندر رہنے والوں کو صرف افراد کی اجازت ہوگی، میقات سے مراد وہ جگہ ہے، جہاں سے احرام باندھ کر مکہ میں داخل ہونا پڑتا ہی خواہ عمرہ کی نیت ہو یا حج کی۔

یہ اعلیٰ ترین قانون ہی اس کی پابندی کرو، تمہاری حیات قومی کا دارومدار اسی پر ہی کہ تمام دنیا کے مسلمان ایک مرکز پر جمع ہوں، ان میں اتحاد و یگانگت پیدا ہو، ایک دوسرے کے دُکھ درد میں شریک ہوں، اور جسم واحد بن جائیں، اگر تم نے اس کو ترک کردیا تو اللہ تعالیٰ سخت عذاب میں مبتلا کریگا، تمہاری وحدت و جمعیت جاتی رہیگی، اور اختلاف پیدا ہونے کی وجہ سے تم پر غیروں کو مسلط کردیا جائیگا۔

(۱۹۷) اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۗ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۗ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ

اور حج کے چند مہینے معلوم ہیں، پس جس نے انہیں حج کو لازم کرلیا، تو پھر ایام حج میں نہ کوئی فحش بات ہی، اور نہ بے حکمی، اور نہ نزاع، اور جو کچھ نیکی تم کروگے، اللہ اس کو جان لیگا، اور زاد راہ لیا کرو،

التَّقْوٰی ز وَاتَّقُوْنِ یٰاُولِی الْاَلْبَابِ ○	بیشک بڑا فائدہ خرچ کرنیمیں بچا ہی اور اے عقلمند و مجھ سے ڈرتے ہو۔

حج کے لئے تین مہینے مقرر ہیں، شوال، ذیقعدہ اور ذی الحجہ کے دس ایام، ان دنوں میں حسب ذیل چیزوں کی ممانعت ہی:۔

(الف) رفث، فحش باتوں سے پرہیز کرنا، حدیث میں آتا ہی: اذا کان یوم صوم احدکم فلا یرفث یومئذ ولا یصخب، تمام لغو اور فضول باتیں جو حج سے پہلے حرام تھیں، اب ان میں اور زیادہ حرمت آجائیگی، اپنی بیوی سے بے حجابی کی باتیں کرنا قبل از حج جائز تھا مگر ان دنوں وہ بھی حرام ہوگا،

(ب) فسوق، اس میں ہر قسم کا گناہ شامل ہی، ابن عباس، طاؤس، حسن، سعید بن جبیر، قتادہ، زہری، ربیع، اور قرظی کی بھی یہی رائے ہی، خوشبو لگانا، بال کتروانا بھی جائز نہیں۔

(ج) جدال، رفیقوں سے لڑنا جھگڑنا، گالی گلوج دینا، اور ناشائستہ الفاظ سے خطاب کرنا بھی ممنوع ہی۔

ایّام حج میں صرف یہ تین باتیں ناجائز ہیں، ان کو ترک کرکے جو اچھا کام ہو شوق سے کرو، اس کی ضرور جزا ملیگی، اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہی کہ ہر شخص اپنا زاد راہ لیکر جائے، دوسروں کے لئے بار دوش نہ ہو، یمن کے لوگوں کا دستور تھا کہ سفر خرچ لیئے بغیر گھروں سے حج کے لئے نکل کھڑے ہوتے، وہاں جاکر بھیک مانگتے، چوریاں کرتے، اور دوسروں کا مال غصب کرنے کی فکر میں رہتے، بظاہر ان کا مقصد صبر و توکل پیدا کرنا تھا، مگر تقویٰ و طہارت حاصل کرنے کا یہ طریق نہیں، اس کی بہترین صورت یہ ہی کہ انسان اپنا زاد راہ ہمراہ لیکر نکلے، اس طرح ایک تو سوال کرنے سے بچ جائیگا، دوسرے صدہا گناہوں سے محفوظ رہیگا۔

ارباب عقل و خرد تو وہی ہیں جو خدا کی یاد میں اپنا تمام وقت صرف کرتے ہیں، اور اُن کے پیش نظر ہر وقت خدا کے نام پر قربان ہونیکا خیال رہتا ہی، مگر جو لوگ دنیا سے علیحدگی اختیار کر کے بھیک مانگنا شروع کر دیتے ہیں، انھیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

جب مسلمان حج کے زمانہ میں ان خصلتوں کے عادی بن جائینگے تو انھیں زمانۂ جنگ میں شریفانہ طور پر رہنا آسان ہوجائیگا، اور یہ ایک خصوصی امتیاز ہوگا اسلامی لشکر کا کہ اس میں فسق و فجور اور تمام فواحش و منہیات کا ارتکاب نہیں ہوتا، جبکہ دوسری قوموں کے لشکر ہر قسم کی بدکاری کے مرتکب ہوتے ہیں۔

تجارت بھی جائز ہی

(۱۹۸) لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّکُمْ ؕ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪ وَاذْکُرُوْہُ کَمَا ھَدٰىکُمْ ۚ وَاِنْ کُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِہٖ لَمِنَ الضَّآلِّیْنَ ○	تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو تو تم پر کچھ گناہ نہیں، پھر جب تم عرفات سے لوٹو تو اللہ کو مشعر الحرام کے پاس یاد کرو، اور اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے تم کو بتایا ہی، اور بیشک اس سے پہلے تم ناواقف تھے۔

ابن عباس کہتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز منڈیاں تھیں، حج کے ایام میں یہاں خوب تجارت ہوا کرتی تھی، اسلام قبول کرنے کے بعد لوگوں نے اس کو مناسب خیال نہ کیا کہ حج کے دنوں میں تجارت کی جائے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ جب مقصود اصلی محض حج بیت اللہ ہی، اور اس ذیل میں اگر تجارت بھی کر لی تو کوئی گناہ کی بات نہیں، البتہ یہ ضروری ہی کہ تجارت حقیقی غرض نہ بن جائے فضل کے معنی

رزق ہیں، چنانچہ سورہ جمعہ میں فرمایا: فاذا قضیت الصلوٰۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ، (۶۲: ۱۰) ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہوا: یضربون فی الارض یبتغون من فضل اللہ، (۷۳: ۲۰) آل عمران میں آیا: فانقلبوا بنعمۃ من اللہ

وفضل (۳ : ۱۶۸)

۹ ذی الحجہ کو عرفات کے میدان میں تمام حاجیوں کو قیام کرنا پڑتا ہی، دنیا بھر کے عالموں کی کانفرنس باہمی مشورہ کرکے چند امور کا فیصلہ کرتی ہی، جو تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے ناگزیر و ضروری ہوں، امیر حج ایک خطبہ دیتا ہی، اس میں ان امور کا اعلان کیا جاتا ہی جو اجتماعی حیثیت سے دنیاے اسلام کے واسطے مفید و نافع ہوں، اور بتایا جاتا ہی کہ سال نو میں فرزندان اسلام کا پروگرام یہ ہوگا، جو شخص اس روز عرفات کے میدان میں موجود نہ ہوگا وہ ان تعلیمات سے محروم رہیگا، اور حج سے جو اصلی غرض بھی فوت ہو جائیگی، اس لئے شارع نے فرمادیا کہ الحج عرفۃ۔

عرفات کو جاتے ہوئے رستہ میں منیٰ اور مزدلفہ کے پاس سے گزرنا پڑتا ہی، جب میدان عرفات سے فراغت ہوگی، تو واپسی کے وقت دسویں رات کو مزدلفہ میں ٹھیرنا ہوگا، مغرب اور عشا کی دونوں نمازوں کو عشا کے وقت میں یکجا پڑھنا پڑیگا، مشعر حرام اسی مزدلفہ میں ایک پہاڑ ہی، عند المشعر الحرام سے مراد تمام مزدلفہ ہی وہاں رہ کر اللہ کا ذکر کرنا ہوگا۔

اسلام سے قبل جتنے مذاہب تھے، ہر ایک کا روے سخن اپنی اپنی قوم کی طرف تھا، یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہی کہ اس کی دعوت عالمگیر، اور اس کے مخاطب تمام ادیان و مذاہب ہیں، ایسا قانون نوازش کیا گیا ہی جس سے مسلمان تمام دنیا پر فضیلت و برتری حاصل کرسکتے ہیں، نزول قرآن سے پہلے عرب میں حکومت و جہانداری کی قابلیت نہ تھی، اور نہ اس قسم کا کوئی قانون ان کے پاس موجود تھا، پس اس موہبت کبریٰ اور نعمت عظمیٰ پر جس قدر ممکن ہو خداے برتر کی حمد و تقدیس بیان کریں۔

اتحاد عمل شرط ہی

(۱۹۹) ثُمَّ اَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ	پھر جہاں سے دوسرے لوگ چلیں تم بھی اسی جگہ سے چلو،

اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○	اور اللہ سے مغفرت طلب کرو، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں قریش بیت اللہ کے مجاور ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو حمس کہتے تھے، زمانۂ حج میں عام لوگ عرفات کے میدان میں جاکر قیام کرتے مگر یہ مزدلفہ ہی تک رہتے کیونکہ وہ حرم کی حد میں ہے، اور عرفات اس سے باہر، انہیں خیال تھا کہ حدود حرم سے باہر جانا ان کی شرافت و وجاہت اور عزت کے خلاف ہے، اور عوام الناس سے ملنا تقدس مذہبی کے منافی، قرآن حکیم نے اس آیت میں دو عظیم الشان غلطیوں کو دور کیا جن میں دنیا ہمیشہ سے مبتلا رہی ہے، اور آج بھی باوجود تمدن و تہذیب میں انتہائی ترقی حاصل کرنے کے اس کا قدم اسی جگہہ پر ہے:۔

(الف) اللہ کے نزدیک قومی امتیازات و خصائص کوئی چیز نہیں، بلکہ اس کی نظر میں سب یکساں ہیں، وہاں اگر کسی چیز کی پرسش ہے تو ورع و تقوی کی: ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم، اس لئے نسل انسانی میں حقیقی مساوات ہونا ضروری ہے، اور یہ نہیں ہوسکتا جب تک تمام امتیازات قومی مٹا نہ دیئے جائیں۔

(ب) قوموں کی تباہی و بربادی کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ اور عوام الناس میں تعلقات و روابط قائم نہ رہیں، اور ایک دوسرے سے ملنا ترک کردیں، بہترین دل و دماغ کو دست و بازو کی تلاش و جستجو رہتی ہے، جب عام لوگوں سے میل جول نہ رہیگا تو اعوان و انصار کا فقدان ان کی فنا سامانی کا باعث بن جائیگا، عوام الناس کو قدم قدم پر راہ نما اور مصلح کی ضرورت رہتی ہے، جب انہیں راہ حق و حریت بتانے والا کوئی نہ ملیگا تو روز بروز ضلالت و گمراہی میں بڑھتے جائینگے تا آنکہ ان میں اور حیوانوں میں کوئی فرق و امتیاز باقی نہ رہیگا،

ان دونوں خرابیوں کو دور کرنے کے لئے اللہ نے کہا کہ کوئی شخص مزدلفہ میں

نہیں ٹھیر سکتا بلکہ سب کے سب عرفات میں قیام کریں، اور اسی جگہہ سے ان کی واپسی ہو، اب تک جو کچھہ ہو گیا، اس کو صرف اس بنا پر نظر انداز کیا جاتا ہے کہ اس کا اعادہ نہ ہو۔

شریف النسب کو دعوت اسلام دو

(۲۰۰) فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ط	پھر جب حج کے ارکان پورے کر چکو، تو جس طرح تم اپنے باپ دادا کے ذکر میں لگ جاتے تھے، ویسا بلکہ اس سے بڑھکر خدا کا ذکر کرو۔

جاہلیت میں دستور تھا کہ حج سے فارغ ہو کر منی کے میدان میں تین دن تک مجالس و مجامع منعقد کرتے، اور ان میں اپنے باپ دادا کے مفاخر و فضائل بیان کرتے، قرآن نے اس بیہودہ رسم کی اصلاح کی، اور حکم دیا کہ اس کی جگہہ پر اللہ کا ذکر ہونا چاہیئے، جو خود بڑا ہے، اور دوسروں کو بڑائی بخشتا ہے، باپ دادا کی بزرگی بیان کرنے سے کچھہ فائدہ نہ ہوگا۔

باپ دادا کا ذکر وہی لوگ کرتے ہیں، جو شریف اور خاندانی ہوں، جن کا ماضی مشہور آفاق ہو، جن میں درخشندگی اور تابناکی کے سوا کچھہ نہ ہو، اور جنہوں نے جوانمردی و شجاعت، فیاضی و سخاوت، اور مہماں نوازی و صلہ رحمی کے عظائم امور انجام دیئے ہوں، ادنی درجہ کے لوگوں کی نہ کوئی حیثیت ہوتی ہے، اور نہ وہ اپنے بزرگوں پر کسی قسم کا فخر کر سکتے ہیں، پس اس آیت سے ضمناً یہ بات بھی سمجھ میں آگئی کہ ہر مسلمان کا یہ اولین فرض ہونا چاہیئے کہ جس وقت تبلیغ و دعوت اسلام کے لئے میدان میں قدم رکھے تو اس کا روئے سخن شریف اور خاندانی لوگوں کی طرف ہو، ان کو وہ مذہب کی طرف متوجہ کر دے، ان میں اعلیٰ ترین اخلاق، اور شریفانہ جذبات پہلے سے موجود ہوتے ہیں صرف راستہ دکھانا باقی رہتا ہے، گویا بارود تیار ہے شتابہ دکھانے کی دیر ہے خود بخود بھڑک اٹھیگی، جب ان لوگوں کے سامنے اسلام کی تعلیم پیش کی جائیگی تو ان کے لئے سونے پر سہاگہ کا کام دیگی، اور بہترین خدمات مذہبی انجام دینگے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الناس معادن کمعادن الذهب

والفضۃ، لوگ بھی سونے اور چاندی کی کانوں کی مانند ہیں، سونے کی کان سے سونا ہی نکلیگا، اور چاندی کی کان سے چاندی، یہی حال خاندانوں اور قبیلوں کا ہی۔ ایک دوسری حدیث میں آتا ہی: خیارکم فی الجاھلیۃ خیارکم فی الاسلام اذا فقھوا، جو شخص زمانہ جاہلیت میں اچھا تھا، اس کی اچھائی اسلام قبول کرنے کے بعد بھی باقی رہیگی، بلکہ جس وقت وہ قرآن میں درس و فکر کریگا تو اس کی شرافت کو چار چاند لگ جائینگے[1]۔

دو قسم کے آدمی

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (۲:۱۴۱) وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ	پھر لوگوں میں کچھ ایسے ہیں جو دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں دنیا ہی میں سب کچھ دیدے، اور اُن کے لئے آخرت میں کوئی حصّہ نہیں، اور

[1] ہندوستان کے طول و عرض میں بیشمار عربی درس گاہیں مصروف تعلیم ہیں، مگر جو لوگ وہاں سے فارغ ہوکر نکلتے ہیں عام طور پر ملک و ملت کے لئے عضو معطل ثابت ہوتے ہیں، اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہی کہ عربی تعلیم حاصل کرنے کے لئے وہی لوگ آتے ہیں جو بیکار اور معذور ہوں، گھر کا کام کاج نہ کرسکیں، ادنی خاندانوں کے ہوں، فہم و فراست سے کورے، اور بلید الذہن ہوں۔

مگر جب انگریزی درس گاہوں کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہی کہ قوم کا بہترین ذخیرہ یہاں تعلیم حاصل کررہا ہی، خاندانی روایات اور ظاہری وجاہت کے اعتبار سے وہ کسی سے کم نہیں ہوتے، دل و دماغ اور عقل و دانائی میں کامل ہوتے ہیں، یہی وجہ ہی کہ تمام تحریکات قومی میں یہی لوگ پیش پیش ہوتے ہیں، لیکن مذہب سے بعد و ہجر، ان کے محاسن و فضائل کے آئینہ کو گرد آلود اور مکدر کردیتا ہی، تعلیم یافتہ طبقہ میں بہترین جذبات ہوتے ہیں، مذہبی جوش، حمیت وطن، اور خدمت اسلام میں وہ کسی سے پیچھے نہیں ہوتے، مگر ان کی اکثر کوشش بے موقع صرف ہوتی ہی، اس غلط کاری کو دور کرنے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہی اور وہ یہ ہی کہ ان کی تعلیم و تربیت کے لئے صرف قرآن کی تعلیم کو عام کردیا جائے، اور انگریزی خوانوں کے کان اسکی آیات سے آشنا ہوجائیں، تو انشاء اللہ تمام خرابیاں دور ہو جائینگی، پھر یہی نوجوان جسقدر جوش و ولولہ کا کام کرینگے، علماء ان کی گرد کو بھی نہیں پاسکینگے۔

فِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ٥ (۲۰۲) أُولٰئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ط وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ٥

لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو دعا مانگتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی خیر و برکت دے، اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا، یہی وہ لوگ ہیں، جن کو ان کے کئے کا حصہ ہے، اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

تعلیم حاصل کرلی، مذہبی اعمال کے پابند بن گئے، مگر مقاصد و اغراض کے اعتبار سے جس قدر باہمی فرق مراتب ہوتا ہے اس کا ظہور نہ ہوا، بعض لوگ محض دکھانے کی غرض سے ان تمام تکالیف کو برداشت کر رہے تھے، اور بعض کے پیش نظر مقاصد عالیہ اور مصالح شرعیہ تھے، اس امتحان گاہ میں آتے ہی دونوں جماعتوں میں فرق و امتیاز ہوگیا، اور ایک کی صف دوسرے سے جداگانہ قائم ہوگئی، منافقین پکار پکار کے اپنے کفر و نفاق باطنی اور الحاد فی العمل کا اظہار کر رہے تھے، اور مومنین قانتین کا خلوص و ایثار اپنا رنگ الگ دکھا رہا تھا، اور یہ تفریق اس لئے ضروری تھی کہ حج سے فارغ ہوتے ہی جہاد فی سبیل اللہ کا حکم دیا جائیگا، اگر ارباب عمل اور نااہل لوگوں میں علیحدگی نہ کی جاتی تو میدان جنگ میں شدائد و تکالیف کا سامنا کرنا پڑیگا، پس مناسب یہی تھا کہ ان کو پہلے سے جدا کر دیا جائے۔

منافقین کی کیفیت یہ تھی کہ وہ بہانگ دہل کہہ رہے تھے کہ: ربنا اٰتنا فی الدنیا، ان کے سامنے دنیا تھی، اس کا عیش و آرام، قدر و منزلت، اور عزت و اکرام تھا، شہرت و ناموری ان کی غایت الغایات تھی، نہ تو اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ ان کے پیش نظر تھے، اور نہ انھیں اپنی اصلاح و درستی کا خیال تھا، اس لئے وہ دنیا ہی میں اپنی کوششوں کی تمام ثمرات و نتائج حاصل کرنا چاہتے تھے، مگر ایک دوسرا گروہ بھی تھا جو اپنے جذبۂ نوع پرستی کی وجہ سے تمام دنیا کی فلاح و بہبود کا اپنے آپ کو ذمہ دار گردانتا تھا، جس کی اعلیٰ ترین غرض یہی تھی کہ ہر انسان صرف خدائے واحد کا غلام ہو، سب کی اسرد تعبد کی

بیڑیاں کٹ جائیں، اور کرۂ ارضی عدل و انصاف سے معمور ہو جائے، اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام دنیا و آخرت پر حاوی ہیں، اس لئے اس کی دعا یہ تھی!

ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الاخرۃ حسنۃ و قنا عذاب النار ایسں کام کرنے کے لئے یہی لوگ زیادہ مفید و نافع ثابت ہونگے، اور پہلے گروہ کو فوراً الگ کر دیا جائیگا تاکہ اس کی صحبت و ہم نشینی دوسروں پر بُرا اثر نہ ڈالے۔

مقطع سخن

(۲۰۳) وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝

اور گنتی کے ان چند دنوں میں اللہ کو یاد کرتے رہو، پھر جو دو ہی دن میں جلدی چلا گیا تو اس پر کچھ گناہ نہیں، اور جو ٹھیرا رہا اس پر بھی کچھ گناہ نہیں، یہ اس کے لئے ہی جو ڈرے، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور اس بات کو جان لو کہ تم اسی کے پاس جمع کئے جاؤ گے۔

فریضہ حج کے قریباً تمام ضروری احکام آگئے، اب صرف ایک مسئلہ کو بیان کرکے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا جاتا ہی کہ حج کا مقصد اصلی کیا ہی، اور یہ عظیم الشان اجتماع کس غرض کے لئے کیا گیا ہی تاکہ لوگوں میں تنبہ و اعتبار پیدا ہو، اور ہر شخص آنکھیں کھول کر دیکھے۔

قربانی سے فارغ ہونے کے بعد قاعدہ یہ ہی کہ حاجی تین دن تک منیٰ میں ٹھیرے، ان دنوں کو ایام تشریق کہا جاتا ہی، ان میں ذکر کی صورت یہ ہوتی ہی کہ دسویں تاریخ کو بڑے پتھر جمرۂ عقبیٰ پر سات کنکریاں مارے، اور ہر کنکری کے ساتھ اللہ اکبر کہتا جائے، کنکریوں کے مارنے کا وقت صبح صادق کے طلوع سے شروع ہوتا ہی، گیارہ اور بارہ تاریخ کو تینوں پتھروں پر سات سات کنکریاں مارے، مگر ان دونوں پر زوال آفتاب کے بعد ماری ہونگی، اور اس کے بعد مکہ جانے کی اجازت ہی، اور اگر وہاں تیرہویں تاریخ کی صبح ہو گئی، تو پھر تینوں پتھروں کو طلوع فجر کے بعد کنکریاں

مارنی پڑیگی۔

اصلی مقصد قربانی کا جذبہ صادقہ پیدا کرنا ہی، جب یہ حقیقت طاری ہوگئی تو خواہ اب دو دن کا قیام ہو یا تین دن کا، قانون الٰہی کی پابندی الزم اللوازم ہی، اس بات کو خوب ذہن نشین کرلو کہ جس طرح آج اللہ کے حکم سے اس میدان میں اپنا اپنا زاد راہ لیکر آگئے ہو، آیندہ بھی وہ تم کو خلفائے اسلام کی معرفت جا فی سبیل اللہ کے لئے میدان جنگ میں آنے کی دعوت دیگا کہ اس کا قانون بلند و برتر ہو، اور دنیا میں فساد نہ ہونے پائے، اس وقت تمہارا فرض ہوگا کہ اپنا اپنا سامان جنگ لیکر میدان حرب میں حاضر ہوجاؤ۔

(۲۰۴) وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ (۲۰۵) وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ (۲۰۶) وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝	اور بعضا آدمی ایسا ہی کہ دنیا کی زندگی میں تم کو اسکی بات پسند آتی ہی، اور جو کچھ اسکے دل میں ہی اس پر اللہ کو گواہ لاتا ہی، حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہی، اور جب لوٹ کر جاتا ہی تو دوڑتا پھرتا ہی تاکہ ملک میں فساد پھیلائے، اور کھیتی اور نسل کو تباہ کرے، اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا، اور جب اس سے کہا جاتا ہی کہ اللہ سے ڈرو تو غرور اس کو گناہ پر آمادہ کرتا ہی، پس اسکے لئے دوزخ کافی ہی، اور وہ واقعی برا ٹھکانا ہی۔

شریعت نے چند اعمال ہر مسلم پر لازم کردیے ہیں کہ ان کی پابندی سے اخلاق فاضلہ اور جذبات صادقہ پیدا ہوں، اللہ کی نظر ہمیشہ ان اخلاق پر ہوتی ہی، اور اس کے نزدیک وہی اعمال معتبر ہوتے ہیں جن کا اثر اخلاق پر پڑے، جو لوگ ان اعمال شرعیہ کے مقاصد کو فراموش کردیتے ہیں ان کی محنت رائگاں جاتی ہی، گزشتہ آیات میں دو قسم کے آدمی بیان کیے گئے، اب ان کے خصائص و امتیازات پر اور زیادہ روشنی ڈالی جاتی ہی تاکہ اہل و نااہل میں تمیز ہوجائے، اور وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) دنیاوی امور میں نہایت ہی دور بینی اور حزم واحتیاط کا اظہار کرتے ہیں، مصلحت اندیشی اور عاقبت بینی کے پیکر مجسم ہوتے ہیں، حب قومی، جوش ملی اور ولولہ دینی ان کے فقرے فقرے سے ٹپکتا ہے، فداکاری اسلام اور سرفروشی ملت ان کا دعوے ہوتا ہے۔

(۲) عام مجامع میں قسمیں کھا کھا کر اپنے مذہبی جوش کا اعلان کرتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہوتا ہے کہ ان کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، ان کے اعمال حیات ہی ان کی پردہ دری کر دیتے ہیں، اور دنیا جانتی ہے کہ: چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند۔

(۳) جب ان کی غداری اور ملّت فروشی کا اظہار ہوتا ہے، اور لوگ ان سے احتساب کرتے ہیں تو اپنی غلط کاری تسلیم کرنے کی بجائے جھگڑا کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

(۴) اس قسم کے بدبخت جب مسلمانوں سے الگ ہوتے ہیں تو ملک میں فتنہ وفساد کی آگ بھڑکاتے ہیں، ہنگامہ آرائی ان کا کام ہوتا ہے، اور قوم کو مختلف گروہوں میں تقسیم کرنا ان کا مقصد، تاکہ لوگ ان کی طرف متوجہ ہوں، اور روپیہ وصول ہو۔

(۵) عورتوں سے قانون کے خلاف فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں، اور زنا کے مرتکب ہوتے ہیں، اس طرح کھیتوں کی تباہی عمل میں آتی ہے۔

(۶) لڑکوں کے ساتھ بدکاری کرتے ہیں، اور لواطت کے ذریعہ اپنی نسل بھی برباد کرتے ہیں۔

یہ لوگ ذبح کرنے کے قابل ہیں، اور ان کو دنیا و آخرت میں ہرگز عزت نصیب نہ ہوگی، اگر قوم ان کو ان کی غلط کاریوں پر متنبہ کرتی ہے، اور اس کا مطالبہ ہوتا ہے کہ تعلیم صحیح کے مقاصد سامنے رکھو، ورنہ مسند امامت سے الگ ہو جاؤ تو گھبرا کر ناراضی کا اظہار کرتے ہیں، ان کو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر ہم نے اپنا طریق عمل بدل دیا، اور قوم کی متفقہ آواز کے آگے اپنی گردن جھکا دی تو دنیا بھر میں ذلت و رسوائی ہوگی، اس لئے عزت

اسی میں ہے کہ مستبدانہ کارروائی کریں تاکہ کوئی بازپرس نہ کرسکے، اس قسم کے بدکار دوزخ کا ایندھن بنیں گے، اور کبھی ان کا نام روشن نہ ہوگا۔

(۲۰۷) وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ط وَ اللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ ٥	اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کی رضاجوئی کیلئے اپنی جان دیدیتے ہیں، اور اللہ بندوں پر بڑی شفقت رکھتا ہے۔

اصلی معنی میں قوم کے راہ نما یہ لوگ ہیں جو اعمال کی صورت کے ساتھ مقاصد کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں، خداوند قدوس کی رضاطلبی ان کی غایۃ الغایات ہوتی ہے، اگر آج انہیں مکہ میں جمع کیا گیا ہے تو کل خلیفہ اسلام کے حکم پر چین میں جاسکتے ہیں، قربانی کا جذبہ کامل طور سے ان میں پیدا ہوچکا ہے، اللہ اپنی رحمت سے ان کی کوششوں کو ضائع نہیں کریگا۔

پورے پورے مسلم بن جاؤ

(۲۰۸) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ص وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ط اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ○	مسلمانو! اسلام میں پورے پورے داخل ہوجاؤ، اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو، بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے، پھر اس کے بعد کہ تمہارے پاس
(۲۰۹) فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○	نشانیاں آچکیں اگر تم نے لغزش کی تو جان رکھو بیشک اللہ زبردست حکمت والا ہے۔

جس طرح اخلاص و حسن نیت کے ساتھ تم نے احکام حج ادا کیے ہیں، ایسے ہی تم میں سے ہر شخص جہاد فی سبیل اللہ میں شریک ہو، اور آئندہ تمہیں جو حکم دیا جائے اس کو پوری پابندی کے ساتھ ادا کرو، اسلام یہی نہیں کہ نماز و روزہ ادا کردیا اور مطمئن ہوگئے بلکہ تمام احکام کا پورا کرنا اور ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین، کی حقیقت کو اپنے اوپر طاری کرلینا اسلام ہے، اس کے وجود سے دنیا میں ہر نیکی کا قیام ہو اور برائی دور ہو، عیش پرستی اور آرام طلبی شیطان کی تعلیم ہے، اور تباہی و بربادی کا

پیش خیمہ، اس کی ہمیشہ یہی کوشش رہتی ہے کہ تم مسلمان اللہ کی راہ میں قربان ہونے سے پرہیز کرو، مگر تمہیں ان باتوں کا خیال نہ کرنا چاہیئے، تمہاری حیات قومی اور اجتماعی زندگی کے لیے بہترین قانون نوازش کیا گیا ہے، جس کا ایک مرتبہ تجربہ بھی ہو چکا ہے کہ شتر بانی سے جہانبانی تک پہنچ گئے، اس حقیقت صادقہ کے بعد اگر تم نے قرآن چھوڑ دیا تو اللہ اپنے غلبہ واقتدار سے کام لیکر تمہیں فنا کر دیگا، اور یہی اس کی حکمت کا تقاضا ہوگا۔

(۲۱۰) هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا أَن يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلَائِكَةُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ	کیا وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ اللہ فرشتوں کیساتھ سایۂ ابر میں ان کے پاس آئے، اور قصہ طے کر دیا جائے اور سب کام اللہ ہی کی جانب لوٹائے جاتے ہیں۔

اعلیٰ ترین قانون تمہارے پاس ہے، اس پر عمل کرکے نتائج بھی سامنے آگئے اب کیوں نہیں اس پر عمل کرتے اور کس انتظار میں ہو؟ کیا یہ چاہتے ہو کہ اللہ خود نزول اجلال کرے، ملائکہ اولی اجنحہ کا لشکر جرار اس کی جلو میں ہو، اور بایں شان و شوکت تم سے آکر کہے کہ یہ میرا حکم ہے اسے مانو اور اس پر عمل کرو، تمہارے لیے اتنا بس کرتا ہے کہ نبی عربی نے اس قانون کی تبلیغ کر دی، عمل کرنا تمہارا فرض ہے، اور اگر باوجود ان دلائل واضحہ کے تمہیں یقین نہیں تو انتظار کرو اللہ کا عذاب آکر تمہاری بیخ کنی کر دیگا، عذاب کے فرشتے تمہیں نیست و نابود کر دینگے، اور دنیا سے تمہارا نام و نشان مٹ جائیگا، جب تمہیں صاف صاف کہہ دیا کہ تمہاری زندگی کا راز جہاد فی سبیل اللہ میں پوشیدہ ہے اسلئے اس کے بعد کس دلیل و برہان کی ضرورت ہے؛

آفتاب آمد دلیل آفتاب
گر دلیلے بایداز وے رخ متاب!

جہاد سے منہ موڑوگے تو فنا ہو جاؤگے، اور یہ بات ہو کر رہیگی کیونکہ زمین و آسمان کے تمام امور کا نظم و نسق خود اللہ ہی کرتا ہے۔

(۲۱۱) سَلْ بَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ○	بنی اسرائیل سے پوچھ لو ان کو ہم نے کتنی کچھ کھلی نشانیاں دیں، اور جو شخص اس کے بعد کہ اللہ کی نعمت اسکے پاس پہنچ چکی ہو، بدلتا ہی، تو بیشک اللہ سخت عذاب والا ہی۔

اگر تمہیں کسی قسم کا شک و اشتباہ ہو کہ یہ قانون کس طرح ایک قوم کے لئے زندگی بخش ہو سکتا ہی، اور محض جہاد فی سبیل اللہ پر کیسے حیات قومی کا انحصار ہی، تو بنی اسرائیل سے پوچھ لو ان کو توراۃ دی گئی کہ اس کے ذریعہ سے دنیا میں ترقی کر سکیں، اور جہاد فی سبیل اللہ ان پر فرض کیا گیا، جب تک وہ ان دونوں کے پابند رہے، خلافت ارضی ان کے پاس تھی، اور جہاں انہوں نے ان سے بعد و ہجر اختیار کیا، فنا ہو گئے، ان کے تنزل و انحطاط کے اعظم ترین اسباب یہی دو تھے :-

(الف) کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا : نبذ فریق من الذین اوتوا الکتٰب کتٰب اللہ وراء ظھورھم (۲ : ۹۵)

(ب) جہاد فی سبیل اللہ کو چھوڑ بیٹھے : فلما کتب علیھم القتال تولوا الا قلیلا منھم (۲ : ۲۴۵)

حقیقت یہ ہی کہ ان سے بڑھ کر بنی اسرائیل کے لئے اور کونسی نعمتیں ہو سکتی تھیں، مگر انہوں نے قدر نہ کی، ایسے ہی تم مسلمانوں کو دو چیزیں نوازش کی گئی ہیں :

(۱) قرآن حکیم، "لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ" (۴۱ : ۴۲)

(۲) جہاد فی سبیل اللہ، "وجاھدوا فی اللہ حق جہادہ" (۲۲ : ۷۷)

اگر تم بھی ان کو چھوڑ بیٹھے تو تمھیں سخت عذاب دیا جائیگا، اور تم پر فنا طاری ہوگی۔

جہاد فی سبیل اللہ کی غرض

اللہ کی راہ میں لڑنے کا حکم دیا گیا، ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

دریافت کیا: ای الاعمال افضل، آپ نے ارشاد فرمایا: الصلوٰۃ لوقتہا، مگر جس وقت صحابہ کرام کو احب الاعمال الی اللہ کی تلاش ہوئی تو اس کے جواب میں سورہ صف نازل کی گئی: ان اللہ یحب الذین یقتلون فی سبیلہ صفا کانہم بنیان مرصوص صرف قتال فی سبیل الحق والحریت ہی اللہ کو محبوب ہے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ آپ سے سوال کیا گیا: ای الاعمال افضل قال الایمان باللہ ورسولہ قیل ثم ماذا قال الجہاد فی سبیل اللہ قیل ثم ماذا قال حج مبرور، درصل ان تمام روایات میں کوئی اختلاف نہیں اس لئے کہ ہر جگہ فضیلت کا معیار جداگانہ ہے، پہلا سوال انفرادی حیثیت رکھتا تھا، فرداً فرداً بہترین اعمال نماز ہی ہے کہ یہی عماد الدین ہے، اور اسی پر آگے چل کر دین کی عمارت محکم واستوار ہوگی، لیکن جب احب الاعمال الی اللہ کا سوال کیا گیا تو اس کا منشا یہ تھا کہ قومی نقطۂ نگاہ سے افضل ترین اعمال ارشاد ہوا جس کا نتیجہ اعلائے کلمۃ اللہ اور ظہور شعائر الہیہ ہو، تو وہ یقیناً جہاد فی سبیل اللہ ہی ہو سکتا ہے کہ اسی پر قومی زندگی کا دار و مدار ہے، ایک شخص نے آپ سے پوچھا، ذروۃ الاسلام، یعنی اسلام میں چوٹی کا عمل کیا ہے، تو جواب یہی تھا کہ الجہاد فی سبیل اللہ، اگلی آیات میں جہاد کے اغراض و مقاصد بیان کئے جاتے ہیں:۔

(۲۱۲) زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ اٰمَنُوا ۘ وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝	کافروں کے لئے دنیا کی زندگی عمدہ کر دکھائی گئی ہے اور وہ مسلمانوں کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں، اور جو لوگ پرہیزگار رہیں وہ قیامت کے روز درجہ میں ان سے اوپر ہونگے اور اللہ جسکو چاہتا ہے بیحساب روزی دیتا ہے۔

جو لوگ مذہب کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، جب ان کے سامنے صحیح تعلیم پیش کی جاتی ہے تو اس کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں، اس لئے کہ ان کے سامنے صرف یہی چند روزہ عیش و نشاط زندگی ہے، اگر یہ اسی پر قناعت کرتے تو بھی ایک بات تھی،

مگر وہ ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں، مسلمانوں کے ساتھ تمسخر و استہزا کرتے ہیں، اور ان پر آوازے کستے ہیں، حالانکہ قیامت کے روز فرزندان اسلام ہی مدارج عالیہ کے مالک ہونگے، کیونکہ وہ اخلاق فاضلہ کے طالب ہیں، دولت کی انہیں پروا نہیں۔

مجاہدین فی سبیل اللہ کا اوّلین فرض یہ ہوگا کہ ان کفار کو اتنا ذلیل و رسوا کر دیں کہ آیندہ انہیں سر اوٹھانے کا موقع نہ ملے، اور ہمیشہ کے لئے غلامانہ زندگی بسر کریں، اسلئے کہ اگر انہیں کھلے بندوں چھوڑ دیا تو قانون کا احترام جاتا رہیگا، کسی شخص کے دل میں اس پر عمل کرنے کا شوق پیدا نہ ہوگا، آنے والی نسلوں کے لئے صحیح راہ گم ہو جائیگی، اور بہت جلد یہ دستور العمل مٹ جائیگا۔

جب ارباب اخلاق و اعمال قیامت میں مناصب جلیلہ پر فائز ہونگے تو ضروری ہے کہ دنیا میں بھی وہ اعلیٰ ترین زندگی بسر کریں، تاکہ ارادۂ خداوندی پورا ہو کر رہے، جس وقت بھی مسلمان اس فرض جلیل کے لئے اٹھ کھڑے ہونگے، اور بالفرض نہ تو سامان حرب ہوگا، اور نہ جنگ کرنے کے لئے سپاہی، اللہ ضرور ان کی دست گیری کریگا، ان کو کامیاب کرکے تمسخر کرنے والوں کو ذلیل و رسوا کر دیگا، ضرورت ہے آگے بڑھنے کی جب عزم صمیم مستقل ارادہ، استقلال و ثبات قدم، اور توکل و اعتماد علی اللہ ہے تو کامیابی قطعی و یقینی ہے۔

(۲۱۳) كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۭ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ۭ	تمام لوگ ایک جماعت تھے، پھر اللہ نے نبیوں کو بھیجا جو خوش خبری دینے والے، اور ڈرانے والے تھے، اور انکی معرفت سچی کتابیں بھیجیں تاکہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کرتے ہیں ان میں کتاب الٰہی فیصلہ کر دے، مگر انہی لوگوں نے آپس کی ضد سے کتاب میں اختلاف کیا جن کو کتاب دی گئی تھی، اور ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں آچکی تھیں، اللہ نے اپنی مہربانی سے وہ راہ حق مسلمانوں کو

وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝	دکھادی جس میں وہ اختلاف کرتے تھے، اور اللہ جس کو چاہے سیدھی راہ دکھائے۔

تمام انسانوں کو ایک ہی فطرۃ صالحہ پر پیدا کیا گیا تھا: ولقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم، اور کل مولود یولد علی الفطرۃ سے یہی مراد ہی، اور اس لئے وہ امت واحدہ ہی تھے، اسی پر ثابت و قائم رہنے کے لئے اللہ اپنے انبیا و رسل بھیجتا رہا کہ الست بربکم کے جواب میں جو بلیٰ کہا تھا اس کی یاد دل میں برابر تازہ رہے، اور قلب سلیم کے ساتھ اس کے حضور میں حاضر ہوں، اسی کی حفاظت و نگرانی دنیا و آخرت میں ہر قسم کی ترقی کی ذمہ دار و کفیل ہوگی، انبیا کا کام یہ تھا کہ مومنین کی ہمتیں بڑھائیں، اور مخالفین میں ضعف و کمزوری پیدا کریں۔

چونکہ نبی ہمیشہ زندہ نہیں رہتا اس لئے ساتھ ہی کتاب بھی نازل کر دی کہ آنے والی نسلیں اس سے فائدہ اٹھائیں، اور اپنے اختلافات باہمی کا فیصلہ اسی کے مطابق کریں آفتاب کے غروب ہونے پر چاند کی روشنی اندھیرے گھروں کا اجالا بن جاتی ہے، باوجودیکہ ان لوگوں کو منشاء الٰہی معلوم تھا مگر پھر بھی انہوں نے اختلاف کیا، اور یہ جو کچھ ہوا صرف ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر ہوا، گزشتہ امتیں تو اختلاف کا شکار بن گئیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ایک جدید قومیت صالحہ پیدا کی، اور امت مسلمہ کو ان اختلافات کی حقیقت واضح کرکے صحیح راہ دکھادی، کیونکہ شہداء علی الناس ہونے کی وجہ سے صراط مستقیم پر چلنے، اور دنیا بھر کی راہ نمائی کی قابلیت صرف مسلمانوں ہی میں تھی، سورہ مائدہ میں ہی کہ ہم نے توراۃ نازل کی جو یکسر ہدایت و نور تھی، مگر ان لوگوں نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا، پھر انجیل ان خصوصیات کے ساتھ اتری، لیکن بیکار، اختلاف بڑھتا گیا، یہاں تک کہ قرآن کے نزول کی ضرورت محسوس ہوئی: وانزلنا الیک الکتب بالحق مصدقا لما بین یدیہ من الکتب و مهیمنا علیہ، (۵:۵۲)

جہاد فی سبیل اللہ کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ ان لوگوں کو مٹا دیا جائے جو کتاب الٰہی میں اختلاف پیدا کرنے کی کوشش کریں، عام طور پر دنیا میں دو ہی قسم کے آدمی نظر آتے ہیں، (۱) کتاب الٰہی کے ساتھ تمسخر و استہزا کرنے والے (۲) قرآن میں اختلاف کرنیوالے، ان دونوں گروہوں کو ذلیل کرنا، اور ان کی نقل و حرکت کی نگرانی مسلمانوں کا فرض ہوگا، تاکہ پھر کبھی ان کے دل میں قانون الٰہی کی مخالفت، اور اس سے تمسخر و استہزا کرنے کا خیال نہ پیدا ہو، اگر ان کو مقہور و ذلیل نہ کیا گیا تو دنیا میں قانون الٰہی کی عزت باقی نہ رہیگی، اور اس کا رعب و دبدبہ جاتا رہیگا۔ دنیا کی ہر سلطنت اپنے قانون کا احترام و اکرام کرتی ہے، اگر کوئی اس کی توہین کرے تو اسے فوراً سزا دی جاتی ہے، یہی اسلام کا مقصد ہے کہ اس کے قانون کی اہانت نہ ہو۔

اس قسم کے لوگ دنیا کے مختلف گوشوں میں چھپتے پھرینگے، اور ہر وقت موجود رہینگے، اس لئے ہمیشہ کے واسطے مسلمانوں کو تمام دنیا کے لوگوں سے جنگ کے لئے تیار رہنا پڑیگا کیونکہ کوئی زمانہ ان بدبختوں سے خالی نہ ہوگا، اسی حقیقت کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا: ولایزالون یقاتلونکم حتی یردوکم عن دینکم ان استطاعوا (۲ : ۲۱۷) اور اسی لئے شارع نے فرمایا کہ الجہاد ماض الی یوم القیٰمۃ، جہاد کا سلسلہ قیامت تک رہیگا تا آنکہ ویکون الدین کلہ للہ کی پیشین گوئی صادق ہو۔

تکالیف کا آنا ضروری ہے

(۲۱۴) اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ	کیا تم خیال کرتے ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ تم کو ان لوگوں کی سی حالت پیش نہیں آئی جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں، ان کو سختیاں بھی پہنچیں، اور تکلیفیں بھی، اور جھڑ جھڑائے بھی گئے، یہاں تک کہ پیغمبر اور ایمان والے جو ان کے ساتھ تھے پکار اٹھے

نَصْرَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ ○ | کہ اللہ کی مدد کب آئیگی، سن لو، اللہ کی مدد قریب ہے۔

تم دنیا کے اختلافات مٹانے کے لئے آئے ہو، اور تمہیں خلافت ارضی کے لئے چن لیا گیا ہے، مگر کیا اس بہشت زار ارضی میں بغیر کسی محنت و تکلیف کے داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی ان مشکلات و موانع کی ابتدا بھی نہیں ہوئی جو انبیاء و رسل کو راہ حق و صدق میں پیش آتی ہیں، تاریخ شاہد ہے کہ ان ارباب صدق و صفا کو چاروں طرف سے مصیبتوں نے گھیر لیا، غنیم کی فوجیں محاصرہ کئے ہوئے تھیں، قدم قدم پر دشمن کا خوف دامن گیر تھا، جان کے لالے پڑے ہوئے تھے، سامان خوراک کے تمام ذرائع و وسائل مسدود تھے، بھوک اور پیاس کے مارے تڑپ رہے تھے، یہ تو بیرونی تکلیفوں کی حکایت تھی، ادھر گھر میں اختلاف پیدا ہو گیا، پریشانی و اضطراب کی وجہ سے کم ہمتوں میں بزدلی اور نامردی کے آثار ظاہر ہونے لگے، اور ان میں باہمی منازعت شروع ہو گئی آپس میں لڑنے جھگڑنے کی وجہ سے سب کے سب مبتلائے مصیبت ہو گئے، مگر باوجود ان روح فرسا حالات اور الم ناک حوادث کے رسول اور اس کے اعوان و انصار اپنے فرائض کے ادا کرنے میں برابر مصروف رہے، جب ان کی تمام سعی و کوشش ختم ہو گئی، اور انہوں نے کام کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی، ادھر خارجی اعانت کی بھی کوئی توقع نہ رہی تو نہایت ہی الحاح و تضرّع کے ساتھ پکار اٹھے کہ خداوندا! اب تیری مدد کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں، تو اپنا دست اعانت دراز کر، اور ہمارے مخالفین کو تباہ کر، اس وقت چارہ ساز حقیقی نے ان کی دست گیری کی، اور انہیں کامیاب کر دیا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو مختلف اصول بیان کئے ہیں، پہلا قاعدہ یہ ہے کہ راہِ حق میں تکالیف کا آنا ضروری ہے اس کے بغیر کامیابی نہیں ہو سکتی، سورۂ عنکبوت میں فرمایا:

احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا امنا وھم لا یفتنون ○ ولقد فتنا الذین من قبلھم فلیعلمن اللہ الذین صدقوا ولیعلمن الکذبین ○ (۲۹ : ۱ و ۲) ایک

جگہ آیا: ان اللہ اشتری من المؤمنین انفسہم واموالہم بان لہم الجنۃ ط یقاتلون فی سبیل اللہ فیقتلون ویقتلون، (۹: ۱۱۲) دوسرے یہ حقیقت واضح کردی کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت کس وقت نازل ہوا کرتی ہے؟ جب تک ایک شخص اپنی تمام قوتوں کو اس کی راہ میں وقف نہ کردے، مدد نہ آئیگی، اسی قانون کی طرف سورۂ یوسف میں اشارہ کیا: حتیٰ اذا استایئس الرسل وظنوا انہم قد کذبوا جاء ھم نصرنا، (۱۲: ۱۱۰) سورۂ آل عمران کے آخر میں گناہوں کے کفارہ کی نسبت فرمایا کہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ راہ حق میں ہر چیز قربان کردیتے ہیں: فالذین ھجروا واخرجوا من دیارھم واوذوا فی سبیلی وقتلوا وقتلوا لاکفرن عنہم سیاتہم (۳: ۱۹۴)

پس فرزندان اسلام کے لئے ضروری ہے کہ وہ محض دعا کے بھروسہ پر قناعت نہ کر بیٹھیں، بلکہ زور بازو سے بھی کام لیں، لوگوں کے جھوٹے وعدوں پر نہ جائیں، اپنی قوت کا اظہار کریں اس لئے کہ دنیا میں اسی قوم نے دائمی زندگی حاصل کی ہے جس نے اپنے ہاتھ پاؤں سے کام لیا ہو، قدرت بھی اسی کو زندہ رکھتی ہے جو اصلح و امثل ہو۔

کہاں روپیہ صرف کریں؟

(۲۱۵) یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ط قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَ الْاَقْرَبِیْنَ وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ط وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ○	تم سے پوچھتے ہیں کہ کہاں خرچ کریں، کہدو کہ جس قدر مال تم خرچ کرو، وہ تمہارے ماں باپ، اور رشتہ داروں، اور یتیموں، اور محتاجوں اور مسافروں کا حق ہے، اور تم جو کچھ بھلائی کروگے، اللہ اُسے جانتا ہے۔

مقصد نہایت ہی بلند ہے، اس کے لئے خود تو تیار ہونا پڑیگا، مگر اس کے ساتھ ان لوگوں کو بھی تیار کرنا ہوگا جو غربت و افلاس کی بنا پر سامان حرب نہیں خرید سکتے، اور اگر بالفرض ان لوگوں نے تمہارے روپیہ کو جہاد فی سبیل اللہ کے لئے صرف نہ کیا، تو اس کے

متعلق تم سے باز پرس نہ ہوگی، تمہیں اس سخاوت و فیاضی کا اجر مل جائیگا۔

جہاد کب تک رہیگا؟

(۲۱۶) كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ	تم پر جہاد فرض کیا گیا، اور وہ تمہیں گراں گزرتا ہے، اور عجب نہیں کہ تم ایک چیز کو گراں سمجھو اور وہ تمہارے لئے بہتر ہو، اور عجب نہیں کہ تم ایک چیز کو پسند کرو، اور وہ تمہارے حق میں بری ہو، اور اللہ جانتا ہی اور تم نہیں جانتے۔

جب تیاریاں اس زور شور سے ہوں تو خود بخود سوال پیدا ہوتا ہی کہ جنگ کب تک جاری رہیگی، اور یہ قتل و قتال کب ختم ہوگا؟ اس کے جواب میں فرمایا کہ لڑنے بھڑنے میں تکلیف تو ضرور ہوتی ہے، بال بچوں سے دور رہنا پڑتا ہی، اور چین سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوتا مگر یاد رہے کہ جس چیز کو تم اپنی کوتاہ بینی سے باعث تکلیف خیال کر رہے ہو وہی تمہارے لئے خیر و برکت کا سبب ہی اس لئے کہ تم زندہ رہوگے اور تمہاری قوم کو دائمی زندگی نصیب ہوگی، آرام طلبی اور عیش پرستی بظاہر دلفریب ہیں مگر ان کا انجام تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں، خدا خوب جانتا ہی کہ تمہاری انفرادی و اجتماعی حیات کا راز اسی میں پوشیدہ ہی، سورہ انفال میں اس کی نسبت فرمایا: یایھا الذین اٰمنوا استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم ج (۸: ۲۴)

(۲۱۷) يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ ۖ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ ۖ وَصَدٌّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِندَ اللَّهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۗ وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّىٰ يَرُدُّوكُمْ عَن دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا ۚ	تم سے حرمت کے مہینوں میں لڑائی کرنے کی بابت پوچھتے ہیں، کہدو کہ اس میں لڑنا گناہ ہی، اور اللہ کی راہ سے روکنا، اور اس کا کفر کرنا، اور مسجد حرام سے روکنا، اور اس کے لوگوں کو وہاں سے نکال دینا، اللہ کے نزدیک اس سے بڑھکر ہے، اور فساد، مار ڈالنے سے بھی بڑھ کر ہے، اور یہ ہمیشہ تم سے جنگ کرتے

وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ (۲۱۷) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

رہینگے یہاں تک کہ اگر قدرت پائیں تو تم کو تمہارے دین سے لوٹا دیں، اور تم میں سے جو اپنے دین سے پھر جائیگا اور پھر وہ کفر ہی کی حالت میں مرجائیگا تو ان لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت جائیں گے، اور یہی دوزخ میں ہمیشہ رہنگے جو لوگ ایمان لائے اور اُنہوں نے ہجرت کی، اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، وہ اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

ان آیات میں بتا دیا کہ مخالفین اسلام ہمیشہ بغض و عداوت کا اظہار کرتے رہیں گے، اور ان کی برابر یہ کوشش رہیگی کہ تم کو دین حق سے برگشتہ کردیں، اس لئے مسلمانوں کو بھی جنگ کے لئے ہمیشہ تیار رہنا پڑے گا، پس معلوم ہوگیا کہ جنگ ہمیشہ رہیگی، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ الجہاد ماض الی یوم القیمۃ، اگر تم نے جہاد ترک کردیا، تو پھر ارتداد کا اختیار کرنا ہوگا، اور اگر اسی کفر کی حالت میں مر گئے تو تمہارے اعمال صالحہ کا کوئی اعتبار نہ ہوگا، جو شخص تمام عمر وفادار رہ کر آخر وقت میں بغاوت کرے اس کی یہی سزا ہے۔ اللہ کی رحمت واسعہ کے صرف وہی لوگ امیدوار ہوسکتے ہیں جو اعلائے کلمۃ اللہ کو اپنی زندگی کا مقصد وحید بنالیں، اسی کی خاطر ترک وطن کے لئے تیار ہوں، اور اسی کے لئے اپنی ہر چیز قربان کردیں، ان لوگوں کی تمام غلطیوں کو نظر انداز کیا جائیگا، اور انھیں ہمیشہ کامیابی نصیب ہوگی۔

قرآن حکیم میں دوسری جگہہ آیا کہ جنگ ختم ہونے کا وقت یہ ہے، حتی تضع الحرب اوزارھا (۴۷: ۵) لڑتے رہو یہاں تک کہ لڑائی موقوف ہوجائے، یعنی جب تک جنگ کرنے والی ظالم و حریص قوتیں باقی ہیں، عالمگیر صلح و امن کے حصول کی کوئی توقع نہیں،

اس لئے پہلے ان قوموں کو پامال کردو، دوسری جگہہ آیا کہ حتی اذا اثخنتموھم (۴۷: ۵) یہاں تک لڑو کہ جنگ آزما دشمن چور چور ہوجائیں، قاتلوں کا جب تک خون نہ بہایا جائے گا، مقتولوں کا خون بہنا بند نہ ہوگا، پس جب تک دنیا جنگ اور بواعث جنگ سے باز نہ آئیگی، مسلمانوں کو بھی جنگ کرنی پڑیگی، جنگ صرف اسی وقت ختم ہوگی جب تمام دنیا اسلام کی دعوت امن واخوت کے آگے جھک جائیگی: ھوالذی ارسل رسوله بالھدی ودین الحق لیظھرہ علی الدین کله ولو کرہ المشرکون' (۶۱: ۹)

ناجائز ذرائع کا استعمال حرام ہے

(۲۱۹) يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۭ

شراب اور قمار بازی کے متعلق تم سے دریافت کرتے ہیں، ان سے کہدو کہ ان دونوں چیزوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے کچھہ فائدے بھی ہیں، مگر ان کے نفع سے ان کا نقصان بڑھ کر ہے۔

گزشتہ آیات نے بتا دیا کہ جہاد قیامت تک جاری رہیگا جس کے لئے ہر مسلمان کو تیاری کرنی پڑیگی، لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ فوج کم ہے، روپیہ بھی کافی نہیں، مخالف دونوں اعتبار سے بڑھ چڑھ کر ہے، کیا اس حالت میں شراب اور قمار بازی کی اجازت ہوسکتی ہے؟ عرب کے لوگ عام طور پر ان امراض میں مبتلا تھے، جنگ کے لئے جوا کھیلنا ان کی عادت تھی، آج کل یورپ بھی ان دونوں سے کام لیتا ہے، لڑائی کے سپاہیوں کو شراب پلادی جاتی ہے کہ بے باکانہ دشمن پر حملہ کریں، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس سے مصنوعی دلیری پیدا ہوتی ہے، شراب پی کر جائز حدود سے دور جا پڑتے ہیں، اور جہاں نشہ اترا، اور طبیعت اصلی حالت پر آگئی، تو اور زیادہ ضعف وکمزوری محسوس ہونے لگتی ہے، شجاعت کا حقیقی جوہر فنا ہوجاتا ہے، اور مختلف امراض کا شکار ہونے لگتے ہیں، اس لئے شریعت نے شراب اور قمار بازی، دونوں کی ممانعت کردی، اور ساتھہ ہی ممانعت کا سبب بھی بیان کردیا

کہ اس میں نقصانات بہت زیادہ ہیں، دوسری جگہ اس کو اور واضح کر دیا۔

یاایها الذین امنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطٰن فاجتنبوه لعلکم تفلحون ○ انما یرید الشیطٰن ان یوقع بینکم العداوة والبغضاء فی الخمر والمیسر ویصدکم عن ذکر الله وعن الصلوٰة ج فهل انتم منتهون ○ (۵ : ۹۲ و ۹۳)	مسلمانو! شراب اور جوا اور بت اور پاسے، ان میں کا ہر ایک کام بس ناپاک شیطانی کام ہے تو اس سے بچتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ شیطان تو بس یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کی وجہ سے تمہارے آپس میں دشمنی اور بغض ڈلوا دے اور تم کو یاد الٰہی سے اور نماز سے باز رکھے، تو کیا شیطان کے مکر پر اطلاع پائے پیچھے اب بھی تم باز آؤ گے یا نہیں۔

ان آیات میں بیان کر دیا کہ شراب ام الخبائث ہے، اور جوا تباہی و بربادی کا پیش خیمہ

حدیث میں آیا ہے: لعن رسول الله صلی الله علیه وسلم فی الخمر عشرة، عاصرها و معتصرها وشاربها وساقیها وحاملها والمحمولة الیه وبائعها ومبتاعها وواهبها واکل ثمنها،

کتنا خرچ کریں؟

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ۥ قُلِ الْعَفْوَ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۙ (۲۲۰) فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ	اور تم سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں، ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضرورت سے زائد بچ جائے اسی طرح الله اپنے احکام تمہیں کھول کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ تم دنیا اور آخرت کے معاملہ میں غور و فکر کرو۔

ناجائز ذرائع کا استعمال حرام قرار دیا گیا تو اس کے بعد یہ سوال پیدا ہونا ضروری تھا کہ کتنا روپیہ الله کی راہ میں خرچ کیا کریں، اس لئے فوراً بعد فرما دیا کہ تمہاری ضرورت سے جس قدر بچ جائے سب جہاد فی سبیل الله کے لئے وقف کر دو، اسی سے تمہارے جوش دینی

اور ولولۂ مذہبی کی حقیقت آشکارا ہوجائیگی، اگر تمہیں خدمت ملّت اور ارتقائے اسلام کا خیال ہوگا تو خود بخود اپنی ضروریات کو کم کرلوگے، اور اگر صرف لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے ملک اور قوم کا نام لیتے ہوگے تو اپنی ضروریات کا دائرہ اتنا وسیع کرلوگے کہ ایک کوڑی بھی باقی نہ رہیگی، خدا نے اپنے احکام کھول کر بیان کردیئے ہیں تاکہ تمہیں اس بات کا یقین ہوجائے کہ دنیوی اور اخروی زندگی کے لئے اس سے بہتر کوئی قانون نہیں۔

یتامیٰ کی تربیت

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○	اور تم سے یتیموں کے بارہ میں دریافت کرتے ہیں ان سے کہہ دو کہ ان کے لئے بہتری کا کام کرنا اچھا ہے، اور اگر تم ان سے مل جل کر رہو تو وہ تمہارے بھائی ہیں، اور اللہ بگاڑنے والے اور سنوارنے والے، دونوں کو جانتا ہے، اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو مشکل میں ڈال دیتا، بیشک اللہ

زبردست حکمت والا ہے۔

لڑائیوں کی کثرت کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ یتیم بہت زیادہ ہوں، اس لئے ایک قانون کی ضرورت محسوس ہوئی، مگر اس میں کسی مستقل ضابطہ کو بیان نہیں کیا، اس لئے کہ شریعت اس سے پہلے مسلمانوں میں صحیح کیرکٹر پیدا کرچکی ہے، وہ چاہتی ہے کہ لوگ خود فیصلہ کرلیں، شارع نے اس کے لئے ایک اصل واساس معین کردی کہ الاثم ما حاك في نفسك گناہ وہ ہی جو تیرے دل میں کھٹکے، ایسی قوم کو قوانین وضوابط میں جکڑنا مصلحت کے خلاف ہے، پس قرآن نے صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا کہ وہ تمہارے بھائی ہیں، جیسے اپنے بھائیوں کا خیال رکھو گے، اور ان کی غور وپرداخت کروگے، ایسے ہی ان یتیموں کا خیال رکھنا، اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ کس کے پیش نظر اصلاح ہے، اور کون اس یتیم کی دولت برباد کرنے کی غرض سے اس کی دولت کو اپنے مال کے ساتھ ملا رہا ہے، خداوند قدوس اگر چاہتا تو اس کے لئے

ایک ضابطہ معین کر دیا، مگر اس نے تمہیں تکلیف میں ڈالنا پسند نہ کیا، باوجود اس قدر سہولت اور آسانی کے تم نے اب بھی ان کے مال میں خیانت کی تو کبھی ترقی نہ کر سکو گے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس سے بہتر کوئی دوسرا قانون نہیں ہو سکتا، جب جنگ میں جانے والوں کو اس امر کا یقین ہوگا کہ اگرچہ ہم لڑائی میں مارے جائیں، ہماری اولاد پر کوئی برا اثر نہیں پڑیگا، کیونکہ مسلمان ان کو اپنے بھائیوں کی طرح رکھینگے، اور بیٹوں کی مانند پرورش کرینگے، یہ خیال ان میں اور زیادہ جوش و ولولہ پیدا کریگا، اور بالکل بے فکر ہو کر داد شجاعت دینگے۔

یتامی کے متعلق بحث کرنے سے قبل فرمایا تھا کہ جس قدر روپیہ تمہاری ضرورتوں سے بچ جائے اسے جہاد فی سبیل اللہ کے لئے خلافت کی نذر کر دو، یہ فیصلہ کرنا کہ اصلی ضرورتیں کونسی ہیں، اور غیر ضروری کونسی، ان کو ایک مثال سے واضح کر دیا کہ یتامی کے لئے تمہاری کوشش ہمیشہ یہ رہیگی کہ ان کا روپیہ صرف ضروری مواقع پر صرف ہو، اور کہیں ضائع نہ ہونے پائے پس جو احتیاط اور دور اندیشی تم یتامی کے معاملہ میں برتوگے ویسی ہی کفایت شعاری اور عاقبت اندیشی اپنے مال کے صرف کرنے میں ملحوظ رکھو۔

فصل ثانی

جہاں داری

توطیہ و تمہید

ہر قوم اپنی جداگانہ تہذیب رکھتی ہے، وہ اپنے تمدن کے پھیلانے میں کوشاں رہتی ہے، آج تک بیشمار قوموں کا ظہور ہوا، اور ہر ایک نے اپنی شائستگی اور حضارۃ کو رواج دیا،

اگر آپ ان تمام تہذیبوں کے اجزائے ترکیبی کو الگ کر کے صرف قدر مشترک کی تلاش کریں، تو سب میں یہی چیز نظر آئیگی کہ فطرۃ انسانی میں جس قدر اوصاف و کمالات اور محاسن و فضائل رکھے گئے ہیں، ان کی تولید و تربیت، اور نشو و ارتقا ہو، کوئی تعلیم صحیح ان فطری جذبات کو بدلنا نہیں چاہتی، بلکہ ان کی تکمیل اس کے پیش نظر رہتی ہے، اگر انسان کو مطلق تعلیم نہ دی جاتی، اور کسی تہذیب سے اس کو آشنا نہ کیا جاتا، پھر بھی ایک مدت کے بعد اس کے اندر سے ایک صدا بلند ہوتی، اور جذبہ فطری سے متاثر ہو کر وہ قدم آگے بڑھاتا، البتہ اتنا فرق ضرور رہتا کہ اسے راہ نما نہ ملنے کی وجہ سے دیر لگتی، اور دوسرے لوگ تعلیم و تربیت کی وجہ سے منازل مختلفہ کو جلد طے کر لیتے۔

جنگل میں ایک شخص زخمی ہو گیا، کوسوں تک انسانی آبادی دکھائی نہیں دیتی، طبی مدد کا پہنچنا غیر ممکن اور محال ہے، اس کی طبعی آرزو ہے کہ زخم اچھا ہو، اس لئے وہ صحرا میں تگ و دو کریگا تا آنکہ مختلف اشیاء کے استعمال سے اس کا زخم مدت ہائے دراز کے بعد اچھا ہو جائیگا، یہ تمام سعی و کوشش اور بھاگ دوڑ صرف اس جذبۂ فطرت کی تکمیل کے لئے کی گئی، اگر اس وقت جبکہ وہ زخموں سے چور چور ہو رہا تھا، اور یار و مددگار نہ ہونے کی وجہ سے کراہ رہا تھا، طبی اعانت میسر آجاتی، تو بہت تھوڑی دیر میں اس کا زخم اچھا ہو جاتا، پھر دیکھئے کہ اس کی مسرت و شادمانی کی کوئی انتہا نہ رہتی، اور وہ طبیب کے لئے یکسر تشکر و امتنان بن جاتا۔

یہی حال تہذیب و شائستگی کا ہے، وہ انسان کے فطری جذبات و احساسات کو کم از کم وقت میں اعلیٰ ترین معیار پر پہنچا دیتی ہے، اور یہ کسی کی طاقت نہیں کہ کوئی انسانی تہذیب اور داعیۂ فطرت کو بدل سکے، رسول علیہ السلام نے فرمایا: اذا سمعتم بجبل زال عن مکانہ فصدقوہ واذا سمعتم برجل زال عن خلقہ فلا تصدقوہ، پہاڑ اپنی جگہ سے ہل سکتا ہے، سمندروں کی روانی بند ہو سکتی ہے، اور دریا اپنا راستہ چھوڑ سکتے ہیں، مگر یہ کبھی نہیں

ہوسکتا کہ ایک انسان اپنی فطرت کو چھوڑدے۔

نکاح کی غرض

مرد و عورت کو دیکھیے، ان میں فطرت نے ایک ربط و تعلق قائم کر دیا ہے، اب آپ ان کو الگ رکھنے کی لاکھ کوشش کیجیے، مگر وہ ضرور کسی نہ کسی طرح اپنے تعلقات قائم کرکے خواہشات طبعی کو پورا کرینگے، فرض کیجیے ایک لڑکا اور ایک لڑکی آج پیدا ہوتے ہیں، دونوں کو ایک ایسے جزیرہ میں بند کیا جاتا ہے جہاں انسانی آبادی کا نام و نشان تک نہیں، انہیں تعلیم سے بے بہرہ رکھا جاتا ہے، اور مرد و عورت کے تعلقات کا نمونہ ان کے سامنے نہیں پیش کیا جاتا، مگر آپ دیکھیں گے کہ نوجوان ہوتے ہی جب ان کے قوائے شہوانیہ میں جوش و ہیجان پیدا ہوگا تو ان کی فطرت خود اندر سے پکار اٹھیگی، اور مجبور ہونگے کہ دونوں مل کر رہیں، ایک دوسرے کے ہم خیال ہوں، ہر ایک کے رنج اور خوشی میں شریک ہوں، تمام کام مشورہ سے کریں، کبھی ایک دوسرے سے ناراض نہ ہوں، ایک ہی جسم کے اجزا ہوں، اولاد ہو جوان کے بعد ان کے فرائض کی تکمیل کرسکے۔ جو قانون ان تعلقات و روابط کو مضبوط و محکم تر بناتا ہے اس کو اصطلاح میں تدبیر منزل کہتے ہیں، انسان مدنی الطبع ہے، وہ مل کر رہیگا، اس وقت جو قانون اس کے لیے مفید و نافع ہوگا وہ یہی ہے۔

سورۂ بقرہ کے ابتدائی اوراق میں تم پڑھ آئے ہو کہ تہذیب اخلاق کے بعد تدبیر منزل کا قانون دیا جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں عام طور پر انتظامی مادّہ پیدا ہو، گھر کی چار دیواری سے بہتر اور کوئی درس گاہ نہیں ہوسکتی، گھر میں خاوند، بیوی، اور تمام بچے ہوتے ہیں، خاوند حاکمانہ زندگی بسر کرتا ہے، بیوی ہر بات میں اس کو مشورہ دیتی ہے، دونوں ملکر گھر کا انتظام کرتے ہیں، بچوں کی تعلیم و تربیت ان کے پیش نظر رہتی ہے، اور ان کو بد اخلاقی سے بچاتے ہیں، اولاد کی حیثیت رعایا کی ہوتی ہے، اگر خاوند اور بیوی میں اختلاف رائے ہو تو خاوند کی رائے کو ترجیح ہوتی ہے۔

انون کی عمومی حیثیت تھی، اب جو لوگ اس قانون کی مزید تعلیم کے آرزو
ئے گھر کی چار دیواری سے قوموں اور ملکوں پر حکومت کرنا اپنا مقصد
نزل کا خصوصیت سے مطالعہ کرینگے، اسی کو آگے چلا کر سیاست مدن
پر محمول کر لینگے، اور انہیں مسائل سے استنباط و استخراج نتائج کر کے
پر حکومت کرنے کے قابل بن جائینگے۔
ق ضرور ہوگا کہ یہاں جو قانون تھا وہ صرف ایک مرد اور عورت کے
گے بڑھے تو اسی کو ایک ملک اور ایک قوم پر پھیلا دیا، مرد و عورت کے
حاکم و محکوم کے روابط کے ساتھ ملا دیا، کہ دونوں کا انداز ایک اور طریق
ہی، بہت سے گھروں کے مجموعہ کا نام، پس جو قانون ایک گھر کے لئے
ی بہت سے گھروں کے لئے بھی کفایت کریگا، اور جو ضابطہ ایک گھر کا نظم و
یں کامیاب ہو جاتا ہے، اور خاوند اور بیوی میں کشیدگی نہیں ہونے دیتا،
، اور حاکم و محکوم پر چسپاں ہو سکیگا۔ اگر گھر میں اس کو تدبیر منزل کہینگے
ں میں سیاست مدن اور خلافت کبریٰ کے نام سے تعبیر کرینگے۔
ات میں بتایا جاتا ہے کہ مرد و عورت کے تعلقات کس قسم کے ہیں، انکے
بیر مضبوط رکھ سکتی ہے، اگر خاوند اور بیوی میں اختلاف ہو جائے، لڑائی
بت پہنچے، اور تعلقات قائم نہ رہ سکیں تو اس وقت منازعات باہمی کے
لیا صورت ہوگی، نکاح و طلاق کے مسائل بیان ہونگے، اور انہیں میں
ری راہ نمائی کریگا کہ ان کو خلافۂ کبریٰ پر منطبق کریں، اور ان سے سیاسی
نباط و استخراج کریں۔
رباب اصول نے کلام کی مختلف قسمیں بیان کی ہیں جن کو پیش نظر رکھکر ہم بآسانی
یں کہ متکلم کی غرض و غایت کیا ہے، ان میں سے بعض اقسام یہ ہیں:-

(الف) فحوائے کلام، یہ بالکل بدیہی قیاس ہے اور ایک معمولی آدمی بھی اس کا مطلب سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتا، قرآن حکیم میں ہے ولا تقل لهما اف، جب والدین کو اف تک کہنا جائز نہیں تو ان کو مارنا پیٹنا بدرجۂ اولیٰ حرام ہے۔ (ب) اقتضائے کلام، اسی کو دلالت التزامی کہتے ہیں، ان لوازمات کی بنا پر کلام کا مفہوم ذہن میں آتا ہے جو عادتاً یا عقلاً یا شرعاً اس کے لئے ضروری ہوں، مثلاً جب ایک شخص نے کہا کہ میں نے نماز پڑھی تو اقتضا یہی ہے کہ وہ باوضو تھا۔ اقتضا میں مسکوت عنہ دراصل موقوف علیہ ہوتا ہے، پس جب موقوف ثابت ہے تو موقوف علیہ جو مذکور نہیں بدرجۂ اولیٰ ثابت ہے۔ (ج) ایسی عبارت کے ساتھ اپنا مفہوم و مطلب ادا کرنا جو اعتبارات مناسبہ کو اپنے اندر لئے ہوئے ہو، ان مدارج ثلاثہ کے بعد اعتبار کا درجہ آتا ہے۔

ہم نے نکاح و طلاق کے مسائل سے سیاست کے مباحث اخذ کئے، اس طرز عمل سے یہ غلط فہمی نہ پیدا ہونے پائے کہ ہم ان مسائل کو تفسیر کا درجہ دے رہے ہیں، بلکہ جس طرح اعتبار کے طور پر چند نتائج کا استنباط کیا جا سکتا ہے اسی طرح ان مسائل کی کیفیت ہے، اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ہم نے ان تمام باتوں کو حاشیے میں ڈال دیا ہے کہ کسی قسم کا خفا باقی نہ رہے۔

مسلمان کی عظمت

(۲۲۱) وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝

اور مشرک عورتوں سے نکاح مت کرو جبتک وہ ایمان نہ لے آئیں، اور یقیناً ایک مسلمان باندی مشرک عورت سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تم کو بھلی معلوم ہو، اور مشرکوں سے اپنی عورتوں کا نکاح نہ کرو جبتک وہ ایمان نہ لے آئیں، اور یقیناً ایک مسلمان غلام، مشرک سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تم کو بھلا لگے، وہ تو دوزخ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنی عنایت سے جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے، اور

اپنے احکام لوگوں سے کھول کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

لڑائیوں کی کثرت کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ بہت بڑی تعداد میں یتامی نظر آئیں، اور ساتھ ہی رانڈوں کی بھی کثرت ہو۔ اگر مسلمانوں نے مفتوحہ اقوام کی عورتوں سے حسن و جمال، اور دولت و ثروت کی وجہ سے نکاح کرنے شروع کر دیئے، تو اس کا یہ لازمی نتیجہ ہوگا کہ مسلمان عورتیں برباد ہو جائینگی، نگران کار نہ ہونے کی وجہ سے مجبور ہو کر بدعملی و بدکاری کی مرتکب ہونگی، ادھر جب لڑنے والوں کو یہ معلوم ہوگا کہ ان کی عورتوں کی حفظ و نگہداشت نہیں ہوتی تو ہمت ہار دینگے، اس لئے ہمیشہ کے واسطے مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ مشرک عورتوں سے نکاح نہ کریں۔

نکاح کی اصلی غرض یہ ہوتی ہے کہ عورت اور مرد میں دائمی اتحاد و اشتراک عمل پیدا ہو، ان کی اولاد کی اسلامی طریق پر نشو و نما ہو، ماں باپ کے اخلاق و عقائد کا اثر اولاد پر پڑتا ہے، اگر ماں بے دین ہوگی تو اولاد میں الحاد و زندقہ کے امراض خبیثہ کا پیدا ہونا ضروری ہے، جس سے اسلام کی بنیاد کھوکھلی ہو جائیگی، پھر خاوند اور بیوی کے باہمی اختلاف کی بنا پر تدبیر منزل کے فرائض میں خلل واقع ہوگا، اور امور خانہ داری میں کبھی نظم و نسق قائم نہ رہ سکیگا، ان تمام مصالح کی بنا پر مشرک عورتوں سے نکاح کی ممانعت کی گئی۔ حدیث میں آتا ہے: تنکح المرأۃ لاربع لمالها، ولحسبها، ولجمالها ولدینها فاظفر بذات الدین تربت یداك، عورتوں سے نکاح کرنے میں لوگ مال و دولت، خاندان، حسن و جمال، اور عفت و پاک دامنی کو دیکھتے ہیں تم صرف طہارت و پاکیزگی کو پیش نظر رکھو۔

اس آیت میں دوسرا حکم یہ دیا گیا کہ اپنی لڑکیوں کو مشرکین و معاندین اسلام کے نکاح میں نہ دینا، اس مسئلہ پر تمام دنیائے اسلام کا قاطبۃً اتفاق ہے کہ ایک کافر خواہ کیسا ہی صاحب اثر و نفوذ، جاہ و حشمت، اور دولت و ثروت ہو، مگر اس کے ساتھ کسی مسلمان عورت کا نکاح نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ اول تو عورت عام طور پر منفعل اور اثر پذیر ہوتی ہے،

صحبت وہم نشینی کا اثر ہو کر رہیگا، ممکن ہے وہ بتدریج اسلام کو چھوڑ کر کفر و ارتداد قبول کرلے، دوسرے اگر وہ اسلام سے منحرف نہ ہوئی تو خاوند اور بیوی میں جنگ رہیگی، اور تمام گھر بلبہ میدان جنگ بن جائیگا۔[۱]

(۲۲۲) وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ ۖ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ ۖ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ ۖ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ۝

اور تم سے حیض کا حکم پوچھتے ہیں، ان سے کہدو کہ وہ گندگی ہے پس تم زمانہ حیض میں عورتوں سے الگ رہو، اور جبتک وہ پاک نہوں انکے قریب جاؤ، پھر جب نہا دھولیں تو جدھر سے تمکو حکم دیا ہے انکے پاس آؤ بیشک اللہ توبہ کرنیوالونکو دوست رکھتا ہے اور صاف رہنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ جنگ کی وجہ سے مسلمان عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے پر زور دیا گیا، نکاح ہی کے سلسلہ میں حیض، طلاق اور عدت کے ضروری مباحث ہیں، اس لئے ان کا

---

[۱] اللہ تعالیٰ اپنی آیات کھول کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ ان سے مسائل سیاست کا استخراج کیا جائے، آپ اس کے دوسرے حکم پر نظر ڈالئے، اس میں بتادیا کہ مسلمان عورتوں کو کفار کے نکاح میں دینا جائز نہیں، اور ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ اپنی لڑکی کے لئے مسلمان خاوند ہی تلاش کرے، یہ ایک گوشت اور خون کا رشتہ ہے جس کی حفاظت پر اس قدر زور دیا گیا کہ ایک مسلمان ہی اس کا نگران کار و محافظ بن سکتا ہے، ہمارا ایمان و اسلام اس سے کہیں زیادہ عزیز و محبوب ہے، اولاد کو مذہب پر قربان کیا جا سکتا ہے، مگر دین کو اس کی خاطر نہیں چھوڑا جا سکتا، اس لئے ایک مسلمان کا مقصد حیات یہی ہونا ضروری ہے کہ وہ اپنے ایمان کی باگ بھی صرف مسلمان ہی کے ہاتھ میں دے، اور اس کا بادشاہ مسلمان ہی ہو۔ کفار و مشرکین کبھی مسلمانوں کے حاکم نہیں بن سکتے، آل عمران میں فرمایا: یاایہا الذین اٰمنوا ان تطیعوا فریقا من الذین اوتوا الکتٰب یردوکم بعد ایمانکم کفرین، (۳: ۹۵) پس جب اہل کتاب کی اطاعت جائز نہیں تو کفار و مشرکین ان سے کہیں زیادہ اس ممانعت میں داخل ہونگے۔

ذکر بھی مناسب معلوم ہوا، حیض کے متعلق دنیا افراط و تفریط میں مبتلا رہی ہے، یہودیوں اور مجوسیوں کے نزدیک ایام حیض میں عورتوں کے قریب جانا، ان سے بات چیت کرنا، ان کے پاس بیٹھنا، اور ان کے ساتھ کھانا پینا ممنوع و حرام ہے، عرب بھی اسی قانون کے پابند تھے، مگر نصاریٰ ان سے بخط مستقیم مخالف تھے، وہ ان دنوں میں صحبت سے بھی پرہیز نہ کرتے۔

اسلام نے راہ توسط و اعتدال اختیار کی، ایام حیض میں زنا شوئی کے تعلقات مختلف امراض و مفاسد کے باعث تھے، اس لئے ان کو تو حرام قرار دیا گیا کہ انسان ضرر اور نقصان سے محفوظ رہے، میل جول اور اختلاط میں کوئی ہرج نہ تھا اس لئے اس کی اجازت دی گئی۔

افزائش نسل

(۲۲۳) نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ وَقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُم مُّلَاقُوهُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ○	تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں، تو اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو آؤ، اور اپنے لئے پہلے بھیجدو، اور اللہ سے ڈرو، اور جانے رہو کہ تم اس سے ملنے والے ہو، اور ایمان والوں کو خوش خبری سنا دو۔

مرد و عورت کے باہمی تعلقات و روابط میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا حقیقی مقصد نسل انسانی کی زیادتی اور اس کی نشو و تربیت ہے، اس کے لئے قرآن حکیم نے کھیتی کا بہترین لفظ استعمال کیا، جس سے ایک طرف تو یہ مقصد تھا کہ خاوند اور بیوی کے کے نازک تعلقات کو ایسے اشارات و کنایات میں بیان کیا جائے کہ ہر گھر میں مرد و عورت لڑکے اور لڑکیاں چھوٹے اور بڑے اس کتاب کو پڑھ سکیں اور کسی قسم کا حجاب نہ پیدا ہو، یہ ایک ایسا عظیم الشان معجزہ ہے جو دنیا میں قرآن کے سوا اور کسی کتاب کو حاصل نہیں، اسی کے ساتھ ساتھ قرآن یہ بھی چاہتا تھا کہ ان تعلقات کی حقیقی غرض و غایت بھی بیان کر دے، حیض کے ایام میں امراض خبیثہ اور مفاسد کا اندیشہ تھا، اور ضرر و نقصان کی وجہ سے یہ غرض نہیں حاصل ہو سکتی تھی اسلئے پہلی آیت میں صحبت کی ممانعت کر دی۔

اب فرمایا کہ پاک ہونے کے بعد جب اور جس طریق پر آرزو ہو اس کے قریب جا سکتے ہو کوئی شخص اپنی کھیتی کو برباد کرنا نہیں چاہتا، اصل غرض پیداوار ہوتی ہے، کسان ایک قانون کے ماتحت خاص وقت میں بیج بوتا ہے، ہل چلاتا ہے، اس کی آبیاری کرتا ہے، اور وقت پر فصل کاٹ لیتا ہے، ایسے ہی ایک شخص تمام ان لغو و مہمل طریقوں کو یک قلم ترک کر دے جس سے انسانی نطفہ کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو، اور شریعت کے قاعدہ کے مطابق صحبت کرے تاکہ اولاد پیدا ہو، جو ان مقاصد کی تکمیل کرے، جن کے لئے باپ کی زندگی وقف تھی۔

خداوند قدوس نے تمہیں ایک قانون نوازش کر دیا ہے، اس کی پابندی کا خیال رہے، یہود و نصاریٰ، اور مجوس و مشرکین عرب کا دستور العمل تمہیں معلوم ہے، مسلمانوں کو خوش ہونا چاہئے کہ قانون اسلام میں ان تمام تکالیف و شدائد کا سد باب کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ ہرگز تنگی اور مصیبت ڈالنے کا آرزومند نہیں[5]۔

بر و تقویٰ کی حفاظت

(۲۲۴) وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَ تَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝	اور اپنی قسموں کے سبب اللہ کو مانع نہ بنالو کہ نہ سلوک کرو اور نہ پرہیزگار بنو، اور نہ لوگوں میں میل ملاپ کراؤ، اور اللہ سنتا جانتا ہے۔

[5] ان آیات میں مرد و عورت کے معاملات کے لئے ایک قاعدہ کلیہ بیان کیا مگر ان کی جزئیات کو خود ان کے ایمان و دیانت پر چھوڑ دیا کہ اپنی ضروریات کے مطابق ہر قسم کا قانون وضع کر سکتے ہیں مگر یہ خیال رہے کہ قانون اساسی نہ ٹوٹنے پائے اور افزائش نسل کا مقصد سامنے رہے۔ ایسے ہی یہ بھی معلوم ہو گیا کہ شریعت نے جس قدر قانون مرتب کر دیا اس کا اتباع تو ہر حالت میں ضروری ہوگا، لیکن اگر اس سے مزید برآں جدید حوادث و واقعات کی بنا پر اور زیادہ دستور العمل کی ضرورت محسوس ہو تو جدید قانون وضع کیا جا سکتا ہے مگر اس کی تنظیم و تشکیل میں مقاصد شریعت فوت نہ ہوں، اور قانون اساسی پر زد نہ پڑے، ورنہ اس پر مواخذہ ہوگا، اور تمام قانون بنانے والے مجرم قرار دیے جائینگے۔

(۲۲۵) لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ○

تمہاری قسموں میں سے بیہودہ پر تم سے کوئی مواخذہ نہیں کرے گا، مگر ان قسموں پر گرفت کریگا جن کا تمہارے دلوں نے ارادہ کیا، اور اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔

قانون بنانے کی اجازت دی گئی ہے مگر اسکے اصول اساسی اور مقاصد مہمہ کبھی نظر انداز نہ ہوں اور وہ یہ ہیں۔

(الف) بر و احسان، دوسروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا،

(ب) تقویٰ و طہارت، اپنے اندر اخلاق فاضلہ پیدا کرنا، اور ورع و پاکیزگی سے آراستہ ہونا۔

(ج) اصلاح بین الناس، لوگوں میں اگر منازعات و مناقشات پیدا ہوں تو ان کا رفع و انسداد، اور ان کو آپس میں صلح و آشتی سے رہنے کی تاکید کرنا۔

ایک مسلم کی زندگی کے اعظم ترین مقاصد یہی ہیں، اس لئے کوئی ایسا قانون نہ بنے جو ان کے مخالف ہو، بلکہ اگر کبھی اتفاقاً ایسا ہو جائے تو اس قانون کو منسوخ کرنا ضروری ہوگا، اگر اس پر عمل کرنے کی قسم کھا لی تھی تو اس کے لئے کفارہ ادا کیا جا سکتا ہے، قسم کی خاطر قانون صحیح کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج مطہرات کو خوش کرنے کی خاطر شہد کو حرام کر دیا تو یہ آیت نازل ہوئی: لم تحرم ما احل اللہ لک ج تبتغی مرضات ازواجک ط واللہ غفور رحیم ○ قد فرض اللہ لکم تحلۃ ایمانکم (۶۶: ۱، ۲) ایک اور موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں کسی کام کے نہ کرنے کے لئے قسم کھا لوں، بعد میں معلوم ہو کہ اس کا کرنا بہتر ہے تو اپنی قسم فوراً توڑ دونگا، اس لئے کسی مسلمان کو جائز نہیں کہ اللہ کی قسم کھا کر نیک کاموں سے رک جائے، اللہ تعالیٰ اس بات کو خوب جانتا ہے کہ یہ قانون کس نیت سے بنایا گیا تھا، اور کس ارادہ سے اس پر عمل کیا جا رہا ہے۔

قسمیں کئی طرح کی ہوتی ہیں، (۱) یمینِ لغو، جس کے دو معنی ہیں، (الف) کسی گزری ہوئی بات پر جھوٹی قسم بلا ارادہ زبان سے کھائی گئی، (ب) قسم تو ارادہ سے کھائی گئی مگر گمان یہ تھا کہ جس بات پر قسم کھائی گئی ہے درست ہوگی۔ ان دونوں قسموں پر شریعت کوئی مواخذہ نہ کریگی، اور نہ ان کا اعتبار ہوگا۔

(۲) منعقدہ، آیندہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر قسم کھائی جائے، اگر اس نے قسم پر عمل کرلیا تو بہتر، ورنہ ترک کرنے کی صورت میں کفارہ واجب ہوگا، اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ (الف) ایک غلام آزاد کردے، (ب) اگر اس کی طاقت نہ ہو تو دس مسکینوں کو پیٹ بھر کر کھانا کھلادے، (ج) یہ بھی نہ ہوسکے تو برابر تین دن تک روزہ رکھے۔

(۳) غموس، ارادۃً ایک معاملہ کے متعلق جھوٹی قسم کھائی، اس کا گناہ اس قدر اشد شدید ہے کہ محض کفارہ کافی نہ ہوگا بلکہ نہایت ہی الحاح و تضرّع کے ساتھ توبہ و انابت الی اللہ کرنی ہوگی، تب جاکر یہ جرم عظیم معاف ہوگا، یہ قسم ہمیشہ ماضی سے تعلق رکھتی ہے۔[۱]

ایلاء کے احکام

(۲۲۶) لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (۲۲۷) وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ	جو لوگ اپنی عورتوں سے علیحدہ رہنے کی قسم کھالیں اُن کے لئے چار ماہ کی مہلت ہے، پھر اگر رجوع کرلیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے، اور اگر طلاق کا عزم کرلیں

[۱] مذکورۃ الصدر آیت نے قانون کے اصول اساسی بیان کردیئے، ان کو پیش نظر رکھکر ہم جزئیات کے لئے قانون بنانے کے مجاز ہیں، یہ دستور العمل نذر اور یمین کے درجہ کا ہوگا، اس میں برد تقویٰ اور اصلاح بین الناس کا خیال رکھنا ضروری ہوگا، اگر کوئی جدید قانون ان کی مخالفت میں بن گیا تو اس کا توڑنا ضروری ہوگا، اگر ارباب حل و عقد نے نہایت ہی غور و فکر اور کافی بحث و مشاورہ کے بعد ایک قانون پر اتفاق کرکے اس کے نافذ کرنے کا عزم کرلیا، بعد میں اسکی غلطیاں معلوم ہوئیں، اور فوراً اس کی اصلاح کردی، اس پر اصرار نہ کیا تو اللہ اپنے حلم اور بردباری سے کام لیکر ان غلطیوں کو نظر انداز کردیگا۔

فَاِنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ○ | تو اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

قسموں کے سلسلہ میں طلاق کی ایک خاص قسم کا ذکر کیا جاتا ہے جو عرب میں ایلاء کے نام سے مشہور تھی، اگر مرد و عورت میں اختلاف پیدا ہو جاتا، اور وہ یہ بھی نہ چاہتا کہ میری عورت کسی دوسرے کے پاس جائے، تو قسم کھا لیتا کہ میں اس کے قریب نہ جاؤنگا، اور اس طرح پر اس کو چھوڑ دیتا کہ نہ تو وہ خاوند والی ہوتی، اور نہ دوسری جگہہ نکاح کر سکتی، تاکہ اسے تکلیف ہو اور مصیبت میں مبتلا رہے، یہ نہایت ہی بدترین رسم تھی، اس لئے ضروری ہوا کہ سب سے پہلے اس غلط کاری کی اصلاح ہو۔

اگر کوئی شخص قسم کھالے کہ وہ اپنی بیوی سے صحبت نہ کریگا تو اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں: (الف) کوئی مدّت معین نہ کرے، (ب) چار ماہ کی مدت معین کر دے، (ج) چار ماہ سے زائد کی قید لگا دے، (د) چار ماہ سے کم مدّت کا تذکرہ کر دے۔ پہلی تین صورتوں کو شریعت کی اصطلاح میں ایلاء کہتے ہیں، ان تینوں کے متعلق حکم یہ ہے کہ اگر خاوند چار ماہ کے اندر اندر اپنی قسم توڑ ڈالے، اور بیوی کے پاس چلا جائے تو اسے اپنی قسم کا کفارہ ادا کرنا ہوگا اور اگر چار ماہ گزر گئے، اور قسم نہ توڑی تو اس عورت پر طلاق کا نفاذ ہو گیا، اب بلا نکاح رجوع جائز نہ ہو گا، البتہ اگر دونوں رضا مندی سے پھر نکاح کر لیں تو درست ہے، اور حلالہ کی ضرورت نہ ہوگی، چوتھی صورت کا حکم یہ ہے کہ اگر قسم توڑ دی تو کفارہ ادا کر دے، اور قسم پوری کر لی، جب بھی نکاح باقی رہے۔

شریعت طاہرہ نے ہمیشہ کے لئے ایک قاعدہ معین کر دیا کہ ایلاء کی مدّت زیادہ سے زیادہ چار ماہ ہو سکتی ہے، یہ نہیں ہو سکتا کہ مرد عورتوں کے حقوق بھی ادا نہ کریں، اور ان کو اس طرح سے رکھیں کہ وہ اپنے متعلق کوئی فیصلہ نہ کر سکیں، بلکہ خاوند کو چار ماہ غور کے لئے مل سکتے ہیں، اگر وہ اپنی بیوی کے حقوق ادا کرنے کو تیار ہے تو بہتر، ورنہ علیحدگی اختیار کرنی پڑیگی کیونکہ جب موانست کی کوئی صورت نہیں، اور مزید فتنہ و فساد کا اندیشہ ہے تو حکومت مداخلت

کرکے خاوند اور بیوی میں تفریق کر دے گی

طلاق کے متعلق چند الفاظ

دنیائے قدیم میں عورت کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی، عیسائیت کے پرستار جناب پولوس نے فرمایا: عورت ہی کے ذریعہ گناہ دنیا میں آیا، اور عورت ہی کے طفیل میں ہمکو موت دیکھنی پڑی، برنارڈ، انوطنی، جیروم اور گریگوئے اعظم نے نہایت بلند آہنگی سے عورت کے متعلق، شیطان کا آلہ، شیطان کے ہتیاروں کی جڑ، شیطان کا دروازہ، بچھو، شاہراہ عصیاں، اور زنبور کا زہر کے الفاظ استعمال کئے، خود یورپ کو اس بات کا فیصلہ کئے ہوئے زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ عورت میں روح موجود ہے۔

ان مختلف اقوال سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ازمنہ قدیمہ میں عورت کی نسبت کس قسم کے خیالات تھے، وہ کس قدر شکوک وشبہات کی آماجگاہ رہی ہے، اس کے حق احترام حریت کو خود غرض مرد نے ہمیشہ چھیننے کی کوشش کی، اس لئے یہ ایک قدرتی بات تھی کہ اس کے تمام حقوق کو یک قلم فراموش کر دیا جاتا، باوجود اس قدر ادعائے تہذیب و تمدن کے یورپ میں اب تک یہ حالت ہے کہ عورت کی کوئی حیثیت نہیں، جب تک وہ ناکتخدا ہے، باپ کے نام سے مشہور ہوتی ہے، جب نکاح ہوگیا تو خاوند کے نام میں اس کی شہرت فنا ہو جائیگی، کوئی عورت اپنے نام سے جائداد نہیں خرید سکتی، یہی وجہ ہے کہ نکاح و طلاق کے مسائل میں ہر قوم افراط و تفریط میں مبتلا رہی ہے۔

عرب طلاق دینے میں بالکل آزاد تھے، ان کے نزدیک عورت کی کوئی عزت نہ تھی، اپنی لڑکیوں کو زمین میں زندہ دفن کر دیا کرتے تھے، طلاق کی کوئی حد نہ تھی، جب چاہا رجوع کر لیا، اور ذرا سی ناراضی پر الگ کر دیا، یہودی بھی اس باب میں عرب کے ہم آہنگ تھے، عیسویت کا مقصد یہ تھا کہ یہودیوں کی اصلاح کرے مگر اس نے طلاق کے متعلق ایسا قانون مرتب کیا کہ آج دنیا اس پر عمل کرنے سے عاجز ہے، عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: یہ بھی کہا گیا تھا کہ جو کوئی اپنی

بیوی کو چھوڑ دے، اسے طلاق نامہ لکھدے، لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنی بیوی کو حرام کاری کے سوا کسی اور سبب سے چھوڑ دے وہ اس سے زنا کراتا ہے، اور جو کوئی اس چھوڑی ہوئی بیوی سے بیاہ کرے وہ زنا کرتا ہے" (متی، ۵ : ۳۱ و ۳۲)

ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ کے بڑے بڑے لارڈ اور ڈیوک جب اپنی بیویوں سے تنگ آجاتے ہیں، اور ان سے نجات کی کوئی صورت نہیں ہوتی تو اُن پر زنا کا الزام لگاتے ہیں، جس کے ثبوت میں جھوٹے گواہ پیش کئے جاتے ہیں اور اس طرح چھٹکارا حاصل کیا جاتا ہے۔

ہندوؤں نے یہ خیال کیا کہ خاوند اور بیوی کے تعلقات ایسے ہی ہیں، جیسے خدا کے روابط اپنی مخلوق سے ہیں، اس لئے انہوں نے فیصلہ کیا کہ عورت ہمیشہ خاوند کی غلام رہے، اس کی پرستش کرے، اس کے مرنے پر وہ بھی آگ میں جل جائے، دوسری شادی نہ کرے، اسی قسم کی اور پابندیاں بڑھا دیں۔

قرآن حکیم نے ان تمام بندشوں کو دور کر دیا اور فرمایا کہ جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں، ایسے ہی مردوں پر بھی بہت سی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف (۲ : ۲۲۸) طلاق کے بارے میں جس قدر افراط و تفریط تھی، اس کو دور کر کے راہ اعتدال معین کر دیا، قیود و شرائط لگا دیں، اور لسان نبوت نے ان مختصر الفاظ میں طلاق کی حقیقت پر روشنی ڈالی کہ ابغض المباحات عند اللہ الطلاق، تمام جائز اور حلال اشیاء میں سے اللہ کے نزدیک مبغوض ترین طلاق ہے، گویا طلاق دینے میں بہت زیادہ دور اندیشی سے کام لینا پڑیگا، قرآن نے ان وجوہ و اسباب پر زیادہ وضاحت سے گفتگو نہیں کی، بعض مقامات پر صرف اشاروں سے کام لیا ہے، اور اس کا قطعی و آخری فیصلہ ہر ملک اور قوم کی اپنی اپنی تہذیب و شائستگی پر چھوڑ دیا ہے، البتہ اس نے پابندیوں کا ذکر کیا ہے کہ اس کی آزادی کو محدود کر دیا جائے[1]۔

---

[1] ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رعایا کے حقوق ادا کرنا، اسکے جان و مال کی حفاظت، اسکی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۶۷ پر ملاحظہ ہو)

تین حیض کا انتظار

(٢٢٨) وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

اور مطلقہ عورتیں تین حیض تک اپنے آپ کو روکے رکھیں، اور اگر وہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتی ہیں تو انہیں جائز نہیں کہ جو کچھ اللہ نے ان کے رحم میں پیدا کیا ہے اس کو چھپا رکھیں، اور اگر شوہر اصلاح کا قصد رکھیں تو اس مدت میں اُن کے لوٹا لینے کے وہی زیادہ حق دار ہیں۔ اور جیسا کہ مردوں کا عورتوں پر حق ہے ویسے ہی دستور کے مطابق عورتوں کا بھی حق ہے، اور مردوں کو عورتوں پر فوقیت ہے، اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ٣٦٦ ملاحظہ ہو) تعلیم و تربیت اور تمام ضروریات کی فراہمی حاکم کے ذمہ ہے، لیکن اگر وہ غفلت سے کام لیتا ہے، حقوق کی نگرانی نہیں کرتا، اور اس کی حریت و آزادی کو سلب کر لیتا ہے تو وہ حکومت کا حق دار نہیں رہا بلکہ رعایا متفق ہو کر اس سے اپنے حقوق کا مطالبہ کرے، اور اسکو حکومت سے دست بردار ہونے کیلئے مجبور کرے، مگر اسے فوراً ہی الگ نہیں کیا جائیگا بلکہ اُسے چار ماہ کی مہلت دیجائیگی، ممکن ہے وہ اپنی اصلاح کر لے، اور حقوق ادا کرنے کو تیار ہو جائے، لیکن اگر باوجود تنبیہ کے اسکی حالت میں تغیر نہ ہوا تو چار ماہ کے بعد رعایا اس کو تخت سے اُتار دیگی، اور اس کی جگہ دوسرے کو منتخب کر لیگی، سورۂ توبہ میں جب کفار کو انذار رعب دیا گیا تو غور کرنے کے لئے انہیں بھی چار ماہ کا زمانہ دیا گیا: براءۃ من اللہ و رسولہ الی الذین عاھدتم من المشرکین ۝ فسیحوا فی الارض اربعۃ اشہر (٩ : ١ و ٢) اس سے معلوم ہوا کہ غور کرنے کے لئے شریعت نے سال کا تیسرا حصہ مقرر کر رکھا ہے۔ مرد کو چار ماہ کی مہلت دیگئی کہ فوراً دوسری جگہ نکاح مشکل ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ خاوند اور بیوی کے تعلقات اچھے ہو جائیں، ایسے ہی حاکم چار ماہ تک غور کر لے، شاید اس مدت میں باہمی صلح و صفائی ہو جائے، یا اس درمیان میں رعایا کوئی دوسرا حاکم تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

یہاں سے طلاق کے مختلف احکام بیان کیے جاتے ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) جس عورت سے خاوند نے صحبت یا خلوت صحیحہ کی ہو، اس کو حیض آتا ہو، اور وہ آزاد بھی ہو، اس کو جب طلاق دیجائیگی، تو اُسے تین حیض تک انتظار کرنا پڑیگا، یہ مدّت قریباً تین ماہ ہو جاتی ہے، اس زمانۂ انتظار کو شریعت کی اصطلاح میں عدّت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اس مدّت میں دوسرے شخص سے نکاح کرنا جائز نہیں، اس انتظار کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ خاوند اور بیوی میں مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے۔

جن عورتوں سے شوہر نے صحبت یا خلوت صحیحہ نہ کی ہو، تو طلاق کی صورت میں انکے لئے کوئی عدّت نہیں، جس عورت کو حیض نہ آتا ہو، اس کی تین صورتیں ہیں:۔

(الف) کسی نے نابالغ لڑکی سے شادی کرلی، اس کی عدّت تین ماہ ہے، (ب) اگر کوئی عورت بہت بوڑھی ہے کہ حیض کا خون بند ہو گیا، اس کو بھی تین ماہ انتظار کرنا پڑیگا، (ج) اگر وہ حاملہ ہے، اس کی عدّت وضع حمل کے وقت ختم ہو گی۔

(۲) اگر ان عورتوں کے دلوں میں اللہ کا خوف ہے، اور اعمال کی ذمہ داری محسوس کرتی ہیں، تو اپنے حمل یا حیض کو مخفی نہ رکھیں کیونکہ اخفا کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عدّت کے شمار کرنے میں دقت پیدا ہو جائیگی۔

(۳) اگر خاوند اور بیوی صلاح کے آرزومند ہوں تو پھر زیادہ مناسب یہی ہے کہ ان عورتوں کو پہلے خاوندوں ہی کی طرف لوٹا دیا جائے، تین ماہ کے زمانہ میں انسان کافی غور و فکر سے کام لے سکیگا، الگ رہنے کی وجہ سے عارضی رنجش اور ناراضگی دور ہو جائینگی، سابقہ الفت و محبت پھر عود کر آئیگی، پہلا تعلق قائم ہو جائیگا، اور اس طرح ان جلدبازیوں کا تدارک ہو جائیگا جو طلاق کے متعلق تصور کی جا سکتی ہیں۔

(۴) مردوں کو توجہ دلائی کہ نکاح کی بنا پر جس طرح تمہارے حقوق عورتوں پر عائد ہوتے ہیں، ایسے ہی ان کے حقوق تم پر ہیں، ان کا خیال رکھنا تمہارا فرض ہے، اس ایک

جس نے درحقیقت طلاق کے ناجائز استعمال کو روک دیا، اور تمام دنیا میں عورت کی قدر و منزلت قایم کردی، جو اس سے پہلے اس کو نصیب نہ تھی، البتہ جب خاوند اور بیوی میں اختلاف رائے ہوگا، تو فوقیت رکھنے کی وجہ سے خاوند کی رائے کو ترجیح ضرور حاصل ہوگی۔

خاوند کا فرض ہے کہ اپنی بیوی کے حقوق کا خیال رکھے، اس لئے کہ وہ اس کی نگرانی میں رکھی گئی ہے، اگر مرد اپنے فرائض کے ادا کرنے میں کوتاہی سے کام لیگا، تو اُسے یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ عزیز ہے، اپنے غلبہ و اقتدار سے کام لیکر اُسے ذلیل کردیگا[1]،

---

[1] گزشتہ آیات میں اگر مزید درس و فکر سے کام لیا جائے، تو ان سے حسب ذیل مسائل کا استنباط ہوگا:۔

(۱) اگر حاکم و محکوم میں اختلاف شدید ہوگیا، اور مصالحت کی کوئی صورت باقی نہیں رہی، بلکہ رعایا نے اسکو معزول کردیا، اس وقت رعایا کے لئے مناسب یہی ہے کہ معزول شدہ حاکم کے تمام سابقہ مطالبات ادا کردے۔

(۲) راعی و رعایا میں اگر مصالحت ہو جائے، اور حاکم ادائے حقوق کا عہد و میثاق کرے، تو زیادہ قرین عقل و انصاف یہی ہے کہ اسی کے ہاتھ میں قوم کی عنان سیاست رہے۔

(۳) مگر حاکم یہ امر ہمیشہ اپنے ذہن نشین کرلے کہ جس طرح میں چاہتا ہوں کہ رعایا میرے تمام حقوق کی حفظ و نگہداشت کرے، اور میرا ہر حکم ماننے کو تیار ہو، ایسے ہی رعایا کے بھی بہت سے حقوق ہیں، جن کا پورا کرنا حاکم کا اولین فرض ہے، مثلاً اس کی جان و مال کی حفاظت، بیرونی و اندرونی مصائب سے حفظ و صیانت، تعلیم و تربیت کا بہترین انتظام، اور تمام داخلی و خارجی معاملات میں کامل حریت و استقلال وغیرہ وغیرہ۔

(۴) البتہ اگر راعی و رعایا میں کسی مسئلہ پر اختلاف ہو جائے، اور ارباب حل و عقد دونوں جانب برابر ہوں، تو جس طرف حاکم کی رائے ہوگی، اُسے ترجیح دیجائیگی۔

(۵) اگر دوبارہ حکومت لینے کے باوجود اس نے پھر بھی رعایا کے حقوق ادا نہ کئے تو اسے یاد رکھنا چاہیے کہ اس سے بالاتر ایک اور قوت بھی موجود ہے جو اس نظام عالم کو قائم کئے ہوئے ہے، وہ فوراً اس بادشاہ کو ذلیل کردیگی، اور جب تک کوئی دوسرا شخص اس کی سرکوبی کے لئے تیار نہوگا، اس کو عدوان و سرکشی میں ترقی کرنے کا اور موقع دیگی، تا آنکہ اللہ کے غضب کا ہاتھ بڑھے، اور اس کے خرمن حکومت کو جلا کر خاکستر کردے۔

طلاق رجعی

گزشتہ آیات میں مردوں کے حقوق بیان کئے گئے، اب عورتوں کے حقوق کا تذکرہ آتا ہے:-

(۲۲۹) اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ۭ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْھُنَّ شَـيْـــًٔـا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْھِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ۭ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْھَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○	طلاق دو ہی مرتبہ ہے پھر یا تو دستور کے مطابق روک رکھنا ہے یا خوبی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے، اور جو مال تم نے ان کو دیا ہو، تمہیں جائز نہیں کہ اس میں سے کوئی شے لے لو، مگر یہ کہ خاوند اور بیوی کو اس بات کا خوف ہو کہ اللہ کی حدوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو اس صورت میں کہ تم لوگوں کو اس بات کا خوف ہو کہ میاں بی بی اللہ کے احکام کو پورا نہ کر سکیں گے، اور عورت اپنی جان بچانے کے لئے کچھ دیدے تو اس میں دونوں

پر کچھ گناہ نہیں، یہ اللہ کی حدیں ہیں، ان سے آگے مت بڑھو اور جو اللہ کی باندھی ہوئی حدوں سے آگے بڑھ جائیں، تو یہی لوگ ظالم ہیں۔

پہلی آیت میں فرمایا تھا کہ بعولتھن احق بردھن، اب اس طلاق کی مزید تفصیل کی جاتی ہے، طلاق کی ایک قسم رجعی بھی ہے جس کا اس آیت میں تذکرہ ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) ایسی طلاق جس کے بعد عورت اپنے پہلے خاوند کی طرف لوٹائی جاسکتی ہے صرف دو ہی مرتبہ ہے بشرطیکہ ادائے حقوق کا خیال ہو، اس سے مقصد یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو طلاق کا وقوع نہایت ہی شاذ حالات میں ہو،

(۲) عرب میں دستور تھا کہ صدہا مرتبہ طلاق دینے کے بعد بھی خاوند رجوع کر سکتا تھا، جس سے عورتوں کے حقوق بالکلیہ فنا ہو جاتے تھے، اسلام نے آتے ہی مرد کی آزادی کو چھین لیا، اور فرمایا کہ اگرچہ ایک شخص دو دفعہ طلاق دے کر رجوع کا حق رکھتا ہے، مگر تیسری

مرتبہ بھی طلاق دینے کے بعد یہ حق سلب ہو جائیگا، اور اب خاوند اور بیوی میں علیحدگی ہو جائیگی۔
دو طلاقوں کے بعد اسے اجازت دی گئی کہ (الف) عدّت کے اندر رجوع کرلے، اس سے
حسن سلوک کے ساتھ پیش آئے، اور اس کے حقوق و مراعات کا خیال رکھے، (ب) ورنہ تیسری
مرتبہ طلاق دیکر نیکی کے ساتھ رخصت کر دے۔

(۳) جب خاوند اپنی بیوی کو بغیر کسی قصور اور جرم کے طلاق دیتا ہے تو وہ مہر وغیرہ
سے ایک پائی بھی واپس لینے کا مجاز نہیں، اور اگر اب تک مہر ادا نہیں کیا تو طلاق کے وقت
ایک ایک کوڑی شمار کرکے دینی ہوگی، یہ بھی طلاق کی آزادی کو روکنا ہے، جب اتنی مدّت
تک دونوں کی صحبت و یکجائی رہی، نکاح کے وقت یہی عہد و پیمان ہوا تھا کہ ہمیشہ ساتھ رہینگے،
اب اگر بعض اسباب کی بنا پر نباہ نہ ہو سکا تو پھر بھی دیا ہوا مہر واپس نہیں لیا جا سکتا۔

(۴) مہر واپس لینے کی صرف یہی صورت ہے کہ اس وقت جبکہ مرد و عورت میں اختلاف
انتہا تک پہنچ گیا ہو اور مصالحت کی کوئی صورت باقی نہ رہی ہو، جانبین سے بذریعہ حکم کے
فیصلہ کی کوشش کی گئی، مگر ناکام رہی، لیکن مرد طلاق دینے پر رضامند نہیں، عورت اس فکر
میں ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو اس سے نجات حاصل کرے، ایسی حالت میں اگر عورت خود بخود اپنے
خاوند کو کچھ دینے پر رضامند ہو جائے تو خاوند اس رقم کے وصول کرنے پر شریعت کے لحاظ سے
گنہگار نہ ہوگا، اس قسم کی طلاق کو شریعت کی اصطلاح میں خلع کہا جاتا ہے اس روایت سے
اس مسئلہ پر اور زیادہ روشنی پڑتی ہے:۔

عن ابن جریج قال نزلت هذه الاٰیة فی ثابت بن قیس وفی جیبة، وکانت اشتکته الی رسول الله صلی الله علیه وسلم، فقال اتردین علیه حدیقته، قالت نعم، فدعاه، فذکر ذلك له قال	ابن جریج کہتے ہیں کہ یہ آیت ثابت بن قیس اور جیبہ کے حق میں نازل ہوئی، جیبہ نے رسول علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر طلاق چاہی، آپ نے فرمایا تم اس کا باغ واپس کرنے کو تیار ہو جو اس نے تمہیں مہر میں دیا تھا؟ اس نے اپنی رضامندی کا اظہار

وتطیب لی بذلك، قال نعم، قال قد فعلت، فنزلت ولا یحل لكم ان تاخذوا مما اتیتموھن شیا الایة

کیا، آپ نے قیس کو بلا کر اس کی رضامندی لی، اور طلاق دلوا دی، اسپر یہ آیت نازل ہوئی۔

اس آیت نے بتا دیا کہ جس طرح مرد کو طلاق دینے کا حق حاصل ہے، ایسے ہی عورت بھی اپنے خاوند سے طلاق لینے کی مجاز ہے، یہ قانون کی حدود ہیں، ان سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ ہو۔

حلالہ

(۲۳۰) فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝

پھر اگر عورت کو طلاق دیدے تو اسکے بعد وہ عورت اسکو حلال نہیں جبتک کہ وہ دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرلے، پھر اگر دوسرا شوہر بھی طلاق دیدے تو دونوں میاں بیوی پر کچھ گناہ نہیں کہ ایک دوسرے کی طرف رجوع کریں، بشرطیکہ دونوں کو امید ہو کہ اللہ کی باندھی ہوئی حدوں کو قائم رکھ سکینگے، یہ اللہ کی حدیں ہیں، جنکو ان لوگوں کے لئے کھول کھول کے بیان فرماتا ہے جو سمجھتے ہیں۔

تین طلاقوں کے بعد خاوند اور بیوی میں تفریق ہوگئی، اب یہ عورت اس وقت تک کے لئے اس پر حرام ہے جب تک کوئی دوسرا شخص اس سے نکاح نہ کرلے، پھر یا تو وہ مر جائے، یا اس کو طلاق دیدے، اس کے بعد وہ عورت اپنے پہلے خاوند کی طرف رجوع کر سکتی ہے، اس کو شرعی اصطلاح میں حلالہ کہا جاتا ہے۔ شریعت کے اعتبار سے تو یہی دو صورتیں نکاح کے جواز کی تھیں، مگر بعض ارباب حیل یہاں بھی خدع و فریب سے باز نہیں آتے، اور حیلہ کی ایک صورت پیدا کرتے ہیں یعنی جب پہلے خاوند نے طلاق دیدی، پھر اس کو اپنی حرکت پر ندامت ہوئی، اور اس نے دوبارہ نکاح کی آرزو کی، تو اس کی خاطر ایک شخص نے نکاح کرلیا، اور رات کے بعد اسے طلاق دیدی تاکہ اس طرح وہ اپنے پہلے شوہر کے لئے حلال ہوسکے۔ مگر تمام

ائمہ وفقہا اس امر پر متفق ہیں کہ یہ نکاح حرام وناجائز ہے۔

عکرمہ نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن المحلل فقال لا الا نکاح رغبۃ، لا نکاح دلسۃ، ولا استہزاء بکتاب اللہ ثم یذوق العسیلۃ آپ سے محلل کی نسبت سوال کیا گیا، تو آپ نے فرمایا نہیں نکاح رغبت اور شوق سے ہونا ضروری ہے، اس میں فریب اور خدا کی کتاب کے ساتھ استہزاء و تمسخر نہو، نکاح میں ضروری ہے کہ خاوند اور بیوی باہم متمتع ہوں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لا اوتی بمحلل ولا محلل لہ الا رجمتہ، جب کبھی میرے پاس کوئی حلالہ کرنے والا، یا وہ جس کے لئے تحلیل کی گئی، لایا گیا تو میں نے دونوں کو سنگسار کیا، سلیمان بن یسار کہتے ہیں کہ رفع الی عثمان رجل تزوج امراۃ لیحلھا لزوجھا ففرق بینھما وقال لا ترجع الیہ الا بنکاح رغبۃ غیر دلسۃ حضرت عثمان کے پاس ایک مرد لایا گیا، جس نے ایک عورت سے صرف اس لئے شادی کی تھی کہ اس کو پہلے شوہر کے لئے حلال کر دے، آپ نے ان دونوں میں تفریق کرادی، اور فرمایا کہ یہ صرف اس نکاح کے ذریعہ اس کی طرف لوٹ سکتی ہے جس میں رغبت ہو، نہ کہ فریب کاری۔ اسی قسم کے الفاظ حضرت علی سے بھی منقول ہیں: لا ترجع الیہ الا بنکاح رغبۃ غیر دلسۃ، حضرت ابن عباس نے محلل اور محلل لہ کو ملعون فرمایا ہے: عن اشعث عن ابن عباس قال لعن اللہ المحلل والمحلل لہ، حضرت حسن بصری کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا، اور عرض کیا: ان رجلا من قومی طلق امراتہ ثلاثا فندم وندمت، فاردت ان انطلق فاتزوجھا واصدقھا صداقا ثم ادخل بھا کما یدخل الرجل بامراتہ ثم اطلقھا حتی تحل لزوجھا فقال لہ الحسن البصری اتق اللہ یا فتی ولا تکونن مسمار نار لحدود اللہ، میری قوم میں سے ایک نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیدیں، اس پر وہ دونوں نادم ہوئے میرا ارادہ ہے کہ اس عورت سے نکاح کر لوں اس کا مہر ادا کر دوں، اور پھر جس طرح شوہر اپنی بیوی کے پاس جاتا ہے جاؤں، اور اس کے بعد

اسے طلاق دیدوں تاکہ وہ اپنے شوہر کے لئے حلال ہو جائے، حسن بصری نے جواب دیا کہ اے نوجوان؟ اللہ سے ڈر، اور اس کی حدود کے لئے آگ کی کھونٹی نہ بن۔

پھر یہ کسی فرد واحد کی رائے نہیں کہ نکاح تحلیل حرام و ناجائز ہے، بلکہ سعید بن المسیب، حسن بصری، ابراہیم نخعی، عطاء بن ابی رباح، ابو الشعثاء جابر بن یزید، شعبی، قتادہ، بکر بن عبداللہ المزنی، مالک بن انس، اوزاعی، لیث بن سعد، سفیان ثوری، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، سلیمان بن داؤد الہاشمی، ابو خیثمہ زہیر بن حرب، ابو بکر بن شیبہ اور ابو اسحاق الجوزجانی جیسے اساطین امت و ائمہ اعلام اس کے عدم جواز پر متفق ہیں۔

یہ رکاوٹ تو اس لئے پیدا کی گئی تھی کہ تیسری طلاق سوچ سمجھکر دی جائے، مگر حلالہ کی یہ صورت تو بیحیائی، بے غیرتی، اور بد اخلاقی کا فتح باب کرتی ہے، ایک شخص اپنی عورت کو تین مرتبہ طلاق دیتا ہے، وہ دوسرے مرد سے نکاح کرتی ہے، مگر مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس سے طلاق لیکر پھر پہلے خاوند کے پاس جائے، نکاح کی غرض تو یہ تھی کہ خاوند اور بیوی ہمیشہ مل کر رہیں، اور کبھی ان میں افتراق نہ ہو، یہ بدبخت اس مقصد اصلی کو فنا کر چکے، اب صرف قانون کی ظاہری صورت کے پابند بننا چاہتے ہیں، بلکہ اگر موجودہ خاوند اور بیوی میں اتحاد ہو گیا تو پہلے خاوند کے لئے جائز نہیں کہ وہ ان میں لڑائی کرانے کی فکر میں لگ جائے۔ البتہ اگر اتفاق سے موافقت نہ ہو سکی، طلاق تک نوبت آگئی، اور ادھر پہلے خاوند نے بھی نکاح کا شوق ظاہر کیا تو شریعت کی جانب سے ممانعت نہیں، ان حدود الہیہ کا توڑنا مناسب نہیں ورنہ بے حیائی کا مرض پیدا ہو جائیگا۔[۵]

---

[۵] گزشتہ آیات سے سیاست و ملک داری کے حسب ذیل مسائل کا استخراج کیا جا سکتا ہے، ہم مزید سہولت و آسانی کی خاطر فقہی احکام کو بھی ساتھ ہی درج کئے دیتے ہیں کہ تطابق میں دقت نہ ہو:۔

(۱) نکاح ایک قسم کا معاہدہ ہے، طلاق دیتے وقت خاوند، مہر وغیرہ لینے کی کوشش نہ کرے، جن شرائط پر کسی شخص کے ہاتھ میں ایک قوم کی باگ دی جاتی ہے، وہ بھی درا صل ایسا ہی معاہدہ ہے جس طرح خاوند

ضرر دینا جائز نہیں

(۲۳۱) وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ ۚ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۚ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُم بِهِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ○	اور جب تم نے عورتوں کو طلاق دیدی، پھر وہ اپنی عدت تک پہنچ گئیں تو ان کو دستور کے مطابق روک رکھو، یا اچھی طرح رخصت کرو، اور ان کو ستانے کے لئے نہ روک رکھو کہ زیادتی کرنے لگو، اور جو ایسا کریگا تو بیشک اس نے اپنے اوپر ظلم کیا، اور اللہ کے احکام کو ہنسی نہ بناؤ، اور اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جو تم پر ہے، اور جو اس نے تم پر کتاب اُتاری ہے اور کام کی باتیں جن سے تمکو نصیحت کرتا ہے، اور اللہ سے ڈرو، اور جانتے رہو کہ اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔

چونکہ زمانہ جاہلیت میں طلاق رجعی کے متعلق سخت بدنظمی اور بے ترتیبی تھی، اس لئے پھر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۴) اور بیوی کے درمیان ہوتا ہے، حاکم جب اپنا عہدہ و مواثیق کا پابند نہیں، اور قوم اسے معزول کر رہی ہے، تو اسے جائز نہیں کہ جن اصلاحات کو اس نے اپنے زمانہ حکومت میں نافذ کیا تھا عزل کے وقت برباد کرے، کیونکہ اس سے قومی نشو و ارتقا میں رکاوٹ پیدا ہو جائیگی۔

(۲) مرد و عورت میں اصلاح نہیں ہوسکتی، مگر خاوند طلاق دینے پر رضامند نہیں، اس صورت میں فدیہ دیکر عورت اپنے آپ کو آزاد کر سکتی ہے، امیر جب نالائق و بدکار ہو، رعایا کے حقوق کی مطلق پروا نہ کرتا ہو، باوجود صدائے احتجاج بلند کرنے کے اصلاح کی طرف توجہ نہ کرے، اور حکومت سے بھی دست بردار نہ ہو، تو قوم حکمت عملی اور دانائی سے کام لیکر امیر کو تخت سے اُتار دے تاکہ ملک میں بدنظمی اور فساد بھی نہ ہو، اور وہ برطرف بھی ہو جائے۔

(۳) حلالہ کی صورت یہ ہے کہ اگر تفریق کے بعد عورت نے دوسری جگہ شادی کرلی، اور اتفاقاً وہاں سے بھی طلاق لینی پڑی، ادھر پہلا خاوند بھی نکاح کے لئے تیار ہوگیا، اور آیندہ حقوق کی نگہداشت کا وعدہ کیا، مگر اسکے لئے جائز نہیں کہ اپنے نکاح کی خاطر دوسرے خاوند اور بیوی میں خواہ مخواہ لڑائی کرائے۔ ایسے ہی جب امیر معزول کر دیا گیا، رعایا نے دوسرے شخص کو اپنا امیر منتخب کرلیا، مگر تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ یہ اس سے بھی گیا گزرا ہے، اس پر پہلے امیر کو دعوت دی گئی کہ آکر حکومت سنبھال لے، اور اس نے بھی پابندی قانون کا عہد کیا، اس امیر کے لئے ضروری ہے کہ اپنے زمانۂ عزل میں جدید امیر کو ناقابل ثابت کرنے، اور نقصان دینے کی فکر نہ کرے۔ (بقیہ صفحہ ۳۷۶ پر دیکھو)

تاکید مزید کی کہ اگر رجوع کرنا ہو تو بہتر ورنہ دستور کے مطابق شریفانہ طور پر اس بیوی کو الگ کردو
اور یاد رہے کہ بے زبان عورت کو صرف تکلیف و مصیبت میں ڈالنے کی غرض سے گھر میں بند
نہ رکھنا، کیونکہ اس اختلاف کی صورت میں تمہیں بہت سی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑیگا، گھر میں ہر
وقت جنگ رہیگی، عورت تمہاری عزت کا مطلق خیال نہ رکھیگی، تمہیں ہر وقت اسکی غلامی
کرنی پڑیگی، وہ اپنی اولاد کو تمہاری نافرمانی کی تعلیم دیگی، اور اس کو بداخلاق بنانے
کی کوشش کریگی، پس جو شخص اپنی بیوی پر ظلم کرتا ہے، وہ حقیقت میں خود اپنے اوپر ظلم کرتا ہے، اور
ایسا کرنا قانون الٰہی سے تمسخر و استہزا کرنا ہے، تمہارا فرض یہ ہو کہ اللہ کا قانون اپنے محل اصلی پر
استعمال ہو، عورت تمہاری نگرانی میں رکھی گئی ہے، خانہ داری کے لئے ایک دستور العمل
نوازش کیا، جس کے اصول اساسی تمہارے ذہن نشین کر دیے گئے، ان اعلیٰ ترین نعمتوں کی
قدر یہی ہے کہ ان سے عبرت اندوز ہو کر تذکیر و موعظت پیدا کرو، اگر تم نے اس قانون کو بیجا
طریق پر استعمال کیا، اور اس میں ایسی پیچیدگیاں پیدا کر دیں کہ حکومت بھی مواخذہ نہ کر سکے، تو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۵) (۴) عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ تین مرتبہ طلاق دینے کے بعد خاوند اور بیوی میں مصالحت
ہونی غیر ممکن ہو جاتی ہے، اور ان کا باہمی ازدواج خلاف مصلحت ہی معلوم ہوتا ہے، ایسے ہی جو امیر رعایا کی صدائے
احتجاج بلند ہونے پر تین مرتبہ معزول ہو چکا ہو، اب اس سے یہ توقع رکھنی فضول ہے کہ اپنی اصلاح کر لیگا بلکہ بہتر یہی ہے
کہ آیندہ انتخاب میں اس کو امیدوار بننے کا موقعہ ہی نہ دیا جائے۔

(۵) جو شخص اپنی عورت کو اس غرض سے دوسرے کے حوالہ کرتا ہے کہ وہاں سے طلاق لے کر پھر اس سے
نکاح کر لے، تو وہ بے حیائی کا مرتکب ہوتا ہے، اپنے جذبہ صادقہ کو فنا کرتا ہے، اور شریعت کی زبان میں اس کو
ملعون کہا گیا ہے۔ پس اگر ایک مسلمان اپنی عورت کی عصمت و آبرو بچانے کے لئے جان دینے کو تیار ہو جاتا ہے
تو اسے یاد رکھنا چاہیے کہ ایمان و اسلام، اور اللہ کا گھر اس سے کہیں زیادہ عزیز و محترم ہیں، کیا کلمۂ اسلام
کے حفظ و بقا، اور قرآن حکیم کی دعوت و ارشاد کے لئے اس کے اندر جوش و ولولہ نہ پیدا ہوگا۔

یاد رہے اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہی، تمہارا دجل و فریب اس پر مخفی نہیں رہ سکتا۔[۱]

رکاوٹ پیدا نہ کرو

(۲۳۲) وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ ذَٰلِكَ يُوعَظُ بِهِ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكُمْ أَزْكَىٰ لَكُمْ وَأَطْهَرُ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ○	اور جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دیدو، پھر وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انہیں اس سے نہ روکو کہ اپنے شوہروں سے نکاح کرلیں، جب وہ جائز طور پر آپس میں راضی ہو جائیں، یہ اس کو نصیحت کی جاتی ہی جو تم میں اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہی، یہ تمہارے لئے بڑی پاکیزگی اور صفائی کی بات ہی، اور اللہ جانتا ہے، اور تم نہیں جانتے۔

اگر عورت کو طلاق دے چکے اور اس کی عدّت کا زمانہ بھی ختم ہو گیا، اب وہ جس جگہہ چاہے نکاح کر سکتی ہی، خواہ پہلے شوہر سے کرے، خواہ کسی اور شخص سے، دونوں صورتوں میں کوئی شخص اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں پیدا کر سکتا، بعض اوقات خود پہلا خاوند ہی طلاق دینے کے بعد اس عورت کو دوسری جگہہ نکاح کرنے سے روکتا ہی، کیونکہ وہ اسے ذلّت خیال کرتا ہے، اور کبھی اس عورت کے رشتہ دار ہی سدراہ بن جاتے ہیں، اس آیت میں دونوں کو روک دیا گیا ہی، انہیں تو اپنی عزّت بچانے کی فکر ہے، اور یہ خیال نہیں آتا کہ اگر وہ

---

[۱] امیر کا فرض ہے کہ حکومت لیتے وقت جو عہد و پیمان کیا تھا اس کو پورا کرے، اگر ایسا نہیں کرتا، رعایا اسے معزول کرنا چاہتی ہے، اور وہ الگ نہیں ہوتا، بلکہ اپنے آپ کو محکم و استوار کرنے کی غرض سے اور زیادہ سخت گیر قانون وضع کرتا ہے، اور یہ سمجھتا ہی کہ اس سے کامیابی ہوگی، اس کا اقتدار قائم رہیگا، اس کی قوم کے تمام افراد عزت و آبرو کی زندگی بسر کرینگے، تمام جلیل القدر عہدے ان کے قبضہ میں ہونگے، اور رعایا ذلت و رسوائی کی زندگی کے لئے مجبور ہوگی، مگر اسے یاد رکھنا چاہئے کہ وہ اپنے اوپر آپ ظلم کر رہا ہے، رعایا کے دل سے اسکی عزت و حرمت جاتی رہیگی، بغاوت انگیز تحریکوں کے لئے راستہ کھل جائیگا، اس کے قتل کی تدبیریں ہونگی، تمام ملک فتنہ و فساد کا گھر بن جائیگا اور اس بدبخت امیر کو ایک لمحہ بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوگا۔

نکاح نہ کرسکی تو ممکن ہے اس سے زیادہ خرابیوں کی مرتکب ہو۔[۱]

اس آیت کے متعلق حسب ذیل مسائل کا یاد رکھنا ضروری ہی (۱) عورت جس سے نکاح کا ارادہ کرے وہ غیر کفو نہ ہو، مہر مثل سے کم مقرر نہ ہو، ورنہ عورت کے ولی کو روکنے کا حق حاصل ہوگا، اگر وہ نکاح کریگی تو عدالت اس کو فسخ کرسکیگی (۲) اگر شرعی گواہوں کے بغیر نکاح کرنے لگے، نابالغہ بغیر ولی کی اجازت کے نکاح کرلے، یا ایسے شخص سے ازدواج کی تجویز کی گئی ہو جس سے نکاح حرام ہی، تو یہ تمام صورتیں باطل ہونگی، اور ہر شخص کو روکنے کا حق ہوگا (۳)، شوہر اوّل سے نکاح کے جواز کی صورت یہ ہوگی کہ اس نے تین طلاق نہ نہ دی ہوں، ورنہ حلالہ کے بغیر نکاح نہ ہوسکیگا،

مسئلہ رضاعت

مباحث طلاق میں اولاد کو دودھ پلانے کا سوال ضرور پیدا ہوتا ہی، اس لئے فرمایا:-

(۲۳۳) وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا

جو شخص چاہے کہ دودھ کی مدت پوری کرے تو مائیں اپنے بچوں کو پورے دو برس دودھ پلائیں، اور باپ پر جس کا وہ بچہ ہی دستور کے مطابق ان کا کھانا اور کپڑا ہے، کسی کو تکلیف نہ دی جائے مگر اس کی برداشت کے موافق نہ تو ماں کو اسکے بچہ کی وجہ سے نقصان دیا جائے، اور نہ باپ کو اس کے بچہ کے سبب، اور ایسا ہی وارث پر بھی لازم ہی، پھر اگر وہ دونوں اپنی مرضی اور مشورہ سے دودھ

---

[۱] جب راعی و رعایا کی تفریق کی بنا پر ایک امیر کو معزول کرکے دوسرے کے تقرر کی تجویز ہو تی اور باہمی عہد و پیمان بھی ہوگیا تو معزول شدہ امیر کو جدید فرمانروا کی راہ میں کاوٹ پیدا کرنے کا حق نہ حاصل ہوگا، وہ لوگوں کو اس کی جانب سے بدگمان کرنے کی کوشش میں مصروف ہوجائے، اس سے ملک میں نظم و نسق قایم نہ رہ سکیگا، اور جب رعایا کے سر پر کوئی نگران کار نہ ہوگا تو خانہ جنگی شروع ہوجائیگی، اور قتل و خونریزی کے سوا اور کچھ نظر نہ آئیگا۔

وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۗ وَإِنْ أَرَدْتُّمْ	چھڑانا چاہیں تو ان پر کچھ گناہ نہیں، اور اگر تم اپنی اولاد کو
أَنْ تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ	کسی دایہ سے دودھ پلوانا چاہو تو بھی تم پر کچھ گناہ نہیں،
إِذَا سَلَّمْتُمْ مَا آتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوفِ ۗ وَاتَّقُوا	جبکہ دستور کے مطابق جو تم نے مقرر کیا ہی حوالہ کر دو، اور اللہ
اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ	سے ڈرو اور جان لو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ دیکھ رہا ہے۔

دودھ پلانے کی مدّت دو سال ہے، اس زمانہ میں خاوند اپنی حیثیت کے مطابق تمام مصارف برداشت کرے، اگر خاوند اور بیوی کا متفقہ فیصلہ یہ ہو کہ کسی دوسری عورت سے دودھ پلوائیں تو اس کی اجازت ہے، مگر اجرت ادا کرنا ضروری ہے، دوسری جگہ دودھ چھڑانے کی مدّت ڈھائی سال قرار دی ہے، وحمله وفصله ثلثون شهرا، (۴۶ : ۱۴) دراصل اس میں حمل کے چھ ماہ بھی شامل کئے گئے ہیں، اگرچہ حمل کی مدّت تو نو ماہ ہے، مگر ابتدا کے تین ماہ ویسے ہی ہوتے ہیں، کیونکہ حمل کا ظہور تین ماہ کے بعد ہوتا ہے، پس دودھ کا زمانہ تو وہی دو سال رہا، اور چھ مہینے حمل کے ہوئے۔

اس آیت میں حسب ذیل مسائل بیان کئے گئے ہیں :-

(۱) خاوند اور بیوی دونوں مل کر اولاد کی تربیت کریں، (۲) خاوند کا فرض ہوگا کہ بیوی کے تمام مصارف کا انتظام کرے، اور کسی قسم کی تکلیف نہ دے، (۳) دونوں کو اجازت ہی کہ اگر چاہیں تو اپنی اولاد کو دوسری عورتوں سے دودھ پلوائیں (۴) جب دونوں کا مشورہ ہو تو دودھ چھڑوا سکتے ہیں[1]۔

---

[1] جس ترتیب سے اوپر مسائل بیان کئے گئے ہیں، اسی ترتیب سے نتائج ملاحظہ ہوں :-

(الف) عورت اور مرد اگر متحد الخیال ہوں تو ان سے اولاد پیدا ہونا ضروری ہی جس کی تربیت ان پر عائد ہوتی ہی، ایسے ہی جب حاکم و محکوم میں اتحاد و یگانگت ہوگی تو ضرور ہے کہ دوسری قومیں ان کی مفتوح ہوں یا ان کے ماتحت رہنا پسند کریں، ان سب اقوام کی حیثیت اولاد کی ہوگی، راعی و رعایا کا مشترک مقصد یہ ہوگا کہ ان کی تعلیم و تربیت میں کوشاں رہیں۔

(ب) رعایا علوم و معارف کا سامان فراہم کریگی، حکام کو یہ غرض ہوگا کہ ملک میں امن قائم رکھیں،

عورت انتظار کرے

(۲۳۴) وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ○

اور جو لوگ تم میں مرجائیں، اور اپنی بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ بیویاں اپنے آپ کو چار ماہ اور دس دن روکے رکھیں، پھر جب اپنی عدت کو پہنچ جائیں، تو جو وہ اپنے حق میں جائز طور پر کریں، اس میں تم پر کچھ گناہ نہیں، اور جو تم کرتے ہو، اللہ اس سے خبردار ہے۔

جن عورتوں کے خاوند مرجائیں، اور انہیں حمل نہ ہو تو خاوند کی وفات پر انہیں چار ماہ دس روز اپنے خاوند کے گھر میں رہنا ہوگا، رات کو کسی دوسرے کے گھر میں نہیں رہ سکیں، اس زمانہ عدت میں خوشبو لگانا، بناؤ سنگار کرنا، سرمہ، تیل، اور مہندی بلاضرورت استعمال کرنا، اور رنگین کپڑے پہننا درست نہیں، عدت کے بعد انہیں نکاح کی اجازت ہے[ل]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۹) مصارف کا بندوبست کریں، اور آزادانہ کام کرنے کا موقع دیں، ہر ایک جماعت اپنے اپنے فرائض کو محسوس کرے، کوئی فرزند آدم دودھ سے انکار نہیں کرتا، یہ علوم بھی دودھ کی جگہ پر ہونگے، اگر اشاعت تعلیم کے بعد جدید اقوام نے اسلام قبول کرلیا، تو وہ ہمارے مساوی ہوجائینگی، اور ان کو برابر کے حقوق ملینگے۔

(ج) خاوند اور بیوی اپنے مشورہ سے دوسری عورت کا دودھ بھی پلوا سکتے ہیں، پس اگر ضرورت ہو تو راعی اور رعایا دونوں ملکر دوسری قوموں سے بعض وہ علوم اور صنعت و حرفت سیکھ سکتے ہیں، جن کی ابتک انہیں خبر نہ تھی۔

(د) متفقہ مشورہ سے بچہ کا دودھ چھڑا سکتے ہیں، چنانچہ یہ ضروری نہیں کہ ہر مفتوحہ قوم کے سامنے ہم اسلام ہی پیش کریں، بلکہ اگر مناسب ہو تو ابتدا میں انہیں ماتحت رہنے دیں، اس درمیان میں انہیں مسلمانوں کے اخلاق و اعمال، اور اسلام کے محاسن و فضائل کے درس و مطالعہ کا کافی موقعہ مل جائیگا، عجب نہیں وہ خود بخود دائرہ اسلام میں داخل ہونا شروع کردیں۔

ل معلوم ہوا کہ خاوند کی وفات پر عورت کو ایک مدت تک خاموشی کے ساتھ گھر میں رہنا ہوگا، اور انتظام خانہ داری خود ہی کرنا ہوگا، ایسے ہی جب رعایا کو عادل حاکم نہ مل سکے تو اس فتنہ کے زمانہ میں وہ بدعملی کی مرتکب نہ ہو، بلکہ گزشتہ احکام کی پیروی کرے، اور جدید حاکم کی تلاش میں رہے، اور یہ پہلے صاف ہوچکا ہے کہ مسلمان عورت صرف مسلم خاوند ہی کی تلاش کریگی۔ ایسے ہی مسلمان رعایا کا بھی یہی فرض ہوگا کہ کسی غیر مسلم کو اپنا حاکم نہ بنائے، بلکہ اسکی عنان سیاست مسلمان ہی کے ہاتھ میں رہے۔

(۲۳۵) وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنتُمْ فِي أَنفُسِكُمْ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِن لَّا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَن تَقُولُوا قَوْلًا مَّعْرُوفًا وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ○

اور اگر تم نے کسی بات کی آڑ میں ان عورتوں کو نکاح کا پیغام دیا، یا تم اپنے دل میں چھپائے رکھو تو اس میں بھی تم پر کچھہ گناہ نہیں، اللہ کو معلوم ہے کہ تم ان کا ذکر کروگے، لیکن ان سے چپکے چپکے وعدہ نہ کرلو، مگر یہ کہ جائز طور پر کوئی بات کہدو، اور جب تک میعاد مقررہ اپنے اختتام تک نہ پہنچ جائے نکاح کی گرہ نہ باندھو، اور جانے رہو کہ جو کچھہ تمہارے دلوں میں ہے اللہ جانتا ہے، تو اس سے ڈرتے رہو، اور جانے رہو کہ اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔

عدّت کے زمانہ میں صرف اشارۃً عورت کو نکاح کا پیغام دیا جاسکتا ہے، عدّت ختم ہونے سے قبل نکاح کرنا حرام ہے، اگر مرد عزم کرلے کہ انقضائے عدّت کے بعد اس سے نکاح کرلیگا تو اس کا کوئی حرج نہیں، ان احکام کی مصلحت یہ ہے کہ اگر ان دنوں میں نکاح کرنے یا اس کا پیغام دینے کی اجازت مل جائے تو نکاح کا اصلی مقصد فوت ہوجائیگا، نکاح کی غرض تو یہ تھی کہ خاوند اور بیوی تمام عمر مل کر رہینگے، اور یہ اتحاد آخر تک رہیگا، اب اگر اتفاق سے خاوند پہلے مرگیا تو اظہار افسوس کے لئے ضرور کچھہ نہ کچھہ مدّت ہونی چاہیے، ورنہ آیندہ اس رشتہ پر کوئی اطمینان نہیں ہوسکتا، عورت کو جب اس امر کا یقین ہوگا کہ وہ آسانی سے دوسری جگہہ نکاح کرسکتی ہے تو اس کی محبت اپنے خاوند کے ساتھ کبھی محکم و استوار نہ رہ سکیگی، ہندو قانون نے اسی اتحاد کو لیا، مگر حدود سے تجاوز کرگئے[۵]۔

---

[۵] گزشتہ قانون سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ جب رعایا کے سر پر کوئی حاکم نہ ہو، اور وہ کسی کی تلاش میں پھر رہی ہو، اس وقت کسی شخص کو جائز نہیں کہ اپنے آپ کو اس ذمہ داری کے لئے پیش کردے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

من سال القضاء وکل الی نفسه ومن جبر علیه ینزل علیه ملك فیسدده، ترمذی نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جو شخص قضا کا خود طلبگار ہو، اللہ کی نصرت اس کے لئے بند ہوجاتی ہے اور جسکو لوگ جبراً حاکم بنادیں، ملائکۃ الرحمن اس کی تائید کرتے ہیں۔

طلاق قبل لوطی

(۲۳۶) لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً ۚ وَمَتِّعُوهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ○

اگر ایسی حالت میں عورتوں کو طلاق دیدو کہ ان کو ہاتھ تک نہیں لگایا، یا ان کے لئے مہر مقرر نہیں کیا، تو تم پر کچھہ گناہ نہیں، اور ان کے ساتھ سلوک کرو، مقدور والے پر اس کے موافق، اور بے مقدور پر اسکے موافق، دستور کے مطابق سلوک کرنا ہی، یہ نیک لوگوں پر لازم ہی۔

نکاح کے وقت اگر مہر مقرر نہ ہو تو پھر بھی نکاح ہو جاتا ہی، ایسی عورت کو صحبت اور خلوت صحیحہ سے قبل ہی طلاق دیدی تو مہر کچھہ بھی ادا نہ کرنا پڑیگا، البتہ اس شخص کو اپنی استطاعت کے موافق کپڑوں کا ایک جوڑا ضرور دینا ہوگا اور یہی کپڑے مہر کے قائم مقام ہو جائینگے[۵]۔

(۲۳۷) وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۚ وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۚ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ○

اور قبل اس کے کہ تم ان کو ہاتھ لگاؤ تم نے ان کو طلاق دیدی ہو، اور ان کے لئے مہر ٹھیرا چکے تھے، تو جو مقدار تم نے ٹھیرائی تھی اس کا آدھا لازم ہی، مگر یہ کہ عورتیں چھوڑ بیٹھیں یا وہ مرد چھوڑ بیٹھے جسکے ہاتھ میں عقد نکاح ہی، اور یہ بات کہ تم چھوڑ دو یہ پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہی، اور آپس میں احسان کرنا مت بھولو، بیشک جو کچھہ تم کرتے ہو اللہ دیکھ رہا ہے۔

یہ دوسری صورت ہی، نکاح کے وقت مہر معین ہو چکا تھا، خاوند نے بغیر صحبت اور خلوت صحیحہ کے اس کو طلاق دیدی، اب اس کے ذمہ نصف مہر ادا کرنا واجب ہوگا کیونکہ نہیں معلوم

[۵] رعایا نے اپنا حاکم منتخب کر لیا، عنان حکومت بھی اس نے اپنے ہاتھ میں لے لی، کام شروع کرنے سے قبل اسے خیال ہوا کہ میں اس بار کا متحمل نہیں ہو سکتا، اسلئے اس نے استعفا دیدیا، اس صورت میں اگرچہ اس نے رعایا سے کوئی فائدہ نہیں حاصل کیا، مگر پھر بھی تقاضائے انصاف یہی ہے کہ اپنے مشوروں اور تجربوں سے لوگوں کو فائدہ اٹھانیکا موقعہ دے، اور جن اصلاحات کو وہ اپنے زمانہ حکومت میں نافذ کرتا، ان کے لئے جدید حاکم کو مشورہ دے۔

اس بیچاری کے دل میں کس قسم کے خطرات و وساوس پیدا ہوں، اور لوگ اس کی نسبت کیا کیا خیالات آفرینیاں کریں، اگر عورت خود ہی مہر لینا پسند نہیں کرتی، یا جس شخص کے ہاتھ میں عقد نکاح ہے، وہ نہیں لینا چاہتا تو کوئی حرج کی بات نہیں، آخر میں خاوندوں سے کہا جاتا ہے کہ اگر وہ عفو و درگزر سے کام لیں تو یہ طہارت و تقویٰ کے زیادہ قریب ہوگا، یعنی انہیں شرعی طور پر نصف مہر ادا کرنا پڑتا تھا، مگر انہوں نے پوری رقم دیدی، یہ احسان و مروت، اور بزرگانہ طرز عمل مفید نتائج پیدا کریگا۔

(۲۳۸) حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُومُوا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۔ (۲۳۹) فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ○

تمام نمازوں اور خصوصاً درمیانی نماز کی حفاظت کرو، اور اللہ کے آگے مودب کھڑے رہو، پھر اگر تم کو خوف ہو تو پیدل یا سوار پڑھ لو، پھر جب مطمئن ہو جاؤ تو اللہ کو یاد کرو جس طرح اس نے تم کو وہ تعلیم دی ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

گزشتہ آیات میں نکاح و طلاق کے مسائل بیان کیے گئے، ممکن تھا بعض لوگ دنیاوی مسائل خیال کرکے ان کی پابندی نہ کرتے، اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے فوراً نماز کی محافظت کا حکم دیا، اور بتا دیا کہ نکاح و طلاق، اور نماز کے احکام میں فرق کرنا ٹھیک نہیں، بلکہ جس طرح تم نماز کی حفظ و صیانت کا خیال رکھو، ایسے ہی ان مسائل کا بھی لحاظ کرنا، اور ان کی روح و حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا۔

(۲۴۰) وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○

اور جو لوگ تم میں مر جائیں، اور بیویاں چھوڑ جائیں تو چاہیے کہ ایک سال تک بغیر اخراج کے بیویوں سے سلوک کرنے کی وصیت کر مریں، پھر اگر وہ خود نکل جائیں تو اپنے حق میں جائز طور پر وہ جو کریں اس میں تم پر کچھ گناہ نہیں، اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔

(۲۴۱) وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِؕ حَقًّا عَلَی الْمُتَّقِیْنَ ، (۲۴۲) کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ ○	اور طلاق دی ہوئی عورتوں کے لیے دستور کے مطابق سلوک ہے یہ پرہیزگاروں پر حق ہے، اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنے احکام کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم سمجھو۔

خاوند، مرنے سے قبل اپنے وارثوں کو وصیت کر دے کہ اگرچہ شریعت نے اس عورت کے لیے، جس کا خاوند مر جائے، چار ماہ دس روز کی عدّت مقرر کی ہے، مگر تم اس بیچاری کو عدّت کے گزرتے ہی گھر سے نہ نکال دینا، بلکہ ایک سال تک اس کے قیام و طعام کا بندوبست تمہارے ذمہ ہے، اب اگر وہ خود بخود چلی جائے، اس جگہ رہنا پسند نہ کرے، یا دوسری جگہ نکاح کرے، تو اس کی اجازت ہے۔

عام مفسرین کا خیال ہے کہ ایک سال تک گھر میں عورت کو رکھنے، اور سامان دینے کا حکم منسوخ ہو چکا ہے اس لیے کہ:

(الف) اس آیت میں عورت کی عدّت ایک سال ہے، مگر والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا یتربصن بانفسهن اربعة اشهر وعشرا میں چار ماہ دس روز ہے، پس اس نے سال بھر کے حکم کو منسوخ کر دیا۔

(ب) اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ اپنی بیوی کے لئے خاوند ایک سال کے مصارف کی وصیت کرے، سورۂ نساء میں بیوی کا حصہ مقرر کیا گیا ہے ولکم نصف ماترك ازواجکم، اس لیے وصیت کا حکم منسوخ ہے۔ مگر ہمارے نزدیک یہ آیت منسوخ نہیں، کیونکہ:

(۱) اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ اگر وہ ایک سال پورا نہ کریں، اور چار ماہ دس روز گزرنے کے بعد نکاح کر لیں تو سال بھر تک ان کو بند رکھنا، اور ان کی ضروریات زندگی ادا کرنا ضروری نہیں، پس معلوم ہوا کہ عدّت اور چیز ہے، اور یہ سال کچھ اور ہے

(۲) خورو نوش کا جس قدر سامان دیا جائیگا اس کو وراثت سے کوئی تعلق نہیں، اگلی آیت اس کو واضح کرتی ہے، وللمطلقت متاع بالمعروف حقا علی المتقین، گویا اسلام عورتوں

کے ساتھ احسان و مروّت کا آرزومند ہے، اور وہ سلوک یہی ہو سکتا ہے کہ مہر کے علاوہ ایک سال تک اس کے کھانے پینے اور رہنے کا انتظام کر دیا جائے۔

(۳) بخاری نے مجاہد سے روایت کی ہے: قال جعل اللہ تمام السنۃ سبعۃ اشہر وعشرین لیلۃ وصیۃ ان شاء سکنت فی وصیتہا وان شاءت خرجت، انہوں نے کہا کہ چار ماہ دس روز کے علاوہ سال کا بقیہ حصہ سات ماہ بیس روز بطور وصیت کے قرار دیے گئے ہیں، اگر چاہے تو ایام وصیت میں رہے، اور اگر مرضی ہو تو چلی جائے۔

(۴) ایّام جاہلیت میں دستور تھا کہ خاوند مرتے وقت وصیت کر جاتا، اور ضروری ہوتا کہ اس کی عورت سال بھر کسی جگہ نکاح نہ کر سکتی، قرآن نے اس دستور کی اصلاح کی، چار ماہ دس روز عدّت کے لئے ضروری قرار دیے، اور باقی کو عورت کی مرضی پر چھوڑ دیا۔[۱]

فصل ثالث

ضروریات جہاد

جہانگیری اور جہانداری کے احکام وضوابط ضرورت کے مطابق بیان کئے گئے، تمام مسلمانوں میں ان کی نشر و اشاعت ہو گئی، ہر گھر میں ان کی تعلیم ہو گی، اور ایک ایک بچہ ان سے واقف ہو گا، مشق کرتے کرتے ان کے اندر کام کرنے کی استعداد اور قابلیت پیدا ہو جائیگی، تا آنکہ ان کے سامنے دعوت عمل پیش کی جائے، چنانچہ جہاد فی سبیل اللہ شروع

---

[۱] جس طرح خاوند اپنی بیوی کے لئے ایک سال تک کے مصارف کی وصیت کر جاتا ہے، ایسے ہی حاکم کو چاہیے فرائض منصبی کے علاوہ رعایا کے دوسرے امور کی بھی نگرانی کرے، اور اس کے ساتھ احسان و مروت سے پیش آئے تو یہ خود حاکم کے لئے مفید ہو گا، اور باہمی تعلقات زیادہ محکم و استوار ہونگے، ورنہ راعی و رعایا کے تعلقات ناجرانہ رہ جائینگے، رعایا کے دل میں اس کی محبت جاگیر نہ ہو گی۔

کرتے وقت جن چیزوں کی ضرورت محسوس ہوگی، ان کو اس فصل میں بیان کیا جائیگا۔

میدان جنگ اور موت

(۲۴۳) اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْیَاهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَی النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ٥	کیا تم نے ان لوگوں کے حال پر نظر نہیں کی، جو موت کے ڈر کے مارے ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھروں سے نکلے، پس اللہ نے ان کو حکم دیا کہ مرجاؤ، پھر ان کو زندہ کردیا، بیشک اللہ لوگوں کے لئے بڑے فضل والا ہے لیکن اکثر آدمی شکر نہیں کرتے۔

بنی اسرائیل قریبًا چار سو سال تک مصر میں غلامانہ زندگی بسر کرتے رہے تا آں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پنجہ فرعون سے ان کو نجات دلوائی، فرعون کی قوم انکو ہلاک کرنا چاہتی تھی، ایک لشکر جرار ان کے تعاقب کے لئے نکلا، جس وقت یہودیوں نے اس عظیم الشان اجتماع کو دیکھا تو ان کے اوسان خطا ہوگئے، اور ان کو اپنی جانوں کا خطرہ ہوا فلما تراء الجمعٰن قال اصحٰب موسیٰ انا لمدرکون (۲۶ : ۶۱) جو قوم صدیوں تک غلام و محکوم رہ چکی ہو، اس کے تمام جذبات حق و حریت فنا ہو جاتے ہیں، ارادہ میں ضعف و کمزوری محسوس ہوتی ہے، جوش و ولولہ سرد پڑجاتا ہے، یہی حال بنی اسرائیل کا تھا، اور حقیقت یہ ہے کہ محکومیت اور غلامی سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی لعنت نہیں ہوسکتی

یہاں سے فارغ ہوکر موسیٰ نے ان کی حمیت قومی اور عصبیت میں جوش پیدا کرنے کے لئے فرمایا: یٰقوم ادخلوا الارض المقدسة التی کتب اللہ لکم ولا ترتدوا علی ادبارکم فتنقلبوا خٰسرین (۵ : ۲۴) ارض مقدس تمہارا آبائی وطن ہے، اس وقت غیروں نے اس پر قبضہ کر رکھا ہے، اپنے وطن کو آزاد کرنے کی کوشش کرو۔ مگر ان کا جوش وطنیت اس درجہ مردہ ہوگیا تھا کہ انہیں ذرہ برابر بھی احساس نہ ہوا، اور بدبختانہ یہ جواب دیا کہ وہ صاحب صولت و ہیبت ہیں، ہم میں ان سے جنگ کرنے کی طاقت نہیں، مگر جب موسیٰ

کا اصرار بڑھتا گیا تو انہیں کہنا پڑا : فاذهب انت وربك فقاتلا انا ههنا قاعدون ،
(۵ : ۲۷) تم جاؤ، اور تمہارا خدا، دونوں جاکر لڑو، ہم یہاں بیٹھکر تمہاری جنگ کا تماشہ دیکھینگے،
اس بدبختانہ جواب کی سزا یہ ملی کہ چالیس سال تک ارض مقدس میں ان کا داخلہ بند کر دیا گیا:
فانها محرمة عليهم اربعين سنة يتيهون فى الارض (۵ : ۲۹) موجودہ نسل تباہ
ہو گئی، دوسری نسل نے آکر اس کو فتح کیا۔

قوموں کی زندگی اور موت ہمیشہ یہی ہوا کرتی ہے کہ اگر خود حاکم و فرمانروا ہوں تو زندہ
ہیں، اور اگر دوسروں کے مقہور و ذلیل ہیں، تو انہیں مردہ کہا جائیگا، بنی اسرائیل نے ارض
مقدس فتح کرنے سے انکار کیا، اور مردہ ہو گئے، ایک مدت کے بعد اللہ نے ان پر اپنا
فضل کیا، دوسری نسل کے ذریعہ سے آبائی وطن نوازش کرکے زندگی بخشی، قوموں اور ملتوں
پر اللہ تعالیٰ اسی قسم کا فضل و احسان کیا کرتا ہے مگر وہ توجہ نہیں کرتیں۔

انسان جب کام کرنے کے لئے گھر سے باہر قدم نکالتا ہے، مخالفین و معاندین کی کثرت
ہوتی ہے، اسے ہر وقت اپنی جان کا خطرہ رہتا ہے، اگر یہی خوف ترقی کر جائے، تو کبھی کام
کرنے کی ہمت نہ پیدا ہوگی، اور دشمن سے مقابلہ نہ ہو سکیگا، اس لئے کام شروع کرنے سے
قبل ہی فرما دیا کہ انفرادی و اجتماعی حالتیں زندگی اور موت کسی انسان کے ہاتھ میں نہیں،
اللہ تعالیٰ ہی انسانوں کو زندگی بخشتا اور مارتا ہے، تمہاری حیات و ممات اسی خدائے واحد
کے قبضہ میں ہے، اگر اس نے تمہیں زندہ رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو کوئی انسانی طاقت تمہیں فنا
نہیں کر سکتی، اور یہ ضروری نہیں کہ تم میدان جنگ میں جاکر مر ہی جاؤ گے، بلکہ اس کا تعلق
شہنشاہ اعظم اور مالک السموات والارض سے ہے، پس تم موت و حیات کی الجھن میں پھنس کر
جہاد فی سبیل اللہ کے فرض سے نہ رک جاؤ۔

(۲۴۴) وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ○	اور اللہ کی راہ میں لڑو، اور جانے رہو کہ اللہ سنتا جانتا ہے۔

پس جب موت و حیات کسی انسان کے قبضہ میں نہیں، اور جنگ میں بھی مرنا یقینی نہیں تو اٹھ کھڑے ہو، اللہ کا قانون بلندہ برتر کرنے کے لئے جہاد و قتال کرو کہ اسلام کو غلبہ و اقتدار حاصل ہو، کرۂ ارضی امن کا گہوارہ بن جائے، اور چونکہ تم محض اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے جنگ کروگے اس لئے ضروری ہے کہ وہ تمہاری ہر دعا کو سنے، اس کو اجابت بخشے، اور تمہیں مخالفین کے مقابلہ میں کامیابی نصیب کرے۔

روپیہ بھی دو

(۲۴۵) مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗٓ اَضْعَافًا کَثِیْرَۃً ؕ وَ اللّٰہُ یَقْبِضُ وَ یَبْصُۜطُ ۪ وَ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ○	کون شخص ہے جو اللہ کو قرض دے اچھا قرض، تاکہ اللہ اسکے قرض کو اسکے لئے کئی گنا بڑھائے، اور اللہ ہی تنگدست کرتا ہے، اور کشائش دیتا ہے، اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤگے۔

محض جان قربان کرنا کافی نہیں، بلکہ روپیہ خرچ کرنے کی بھی سخت ضرورت ہے، سامان حرب خریدو، دوسروں کو تیاری میں مدد دو، اور خلافت اسلامی کو اپنی تمام دولت نذر کردو، میدان جنگ میں جاتے ہی تمہیں فتح و کامرانی نصیب ہوگی، اس قدر مال غنیمت ملیگا کہ سمیٹ نہ سکوگے، اور جس قدر تم نے اسلام کے بقا و قیام کے لئے صرف کیا تھا اس سے کئی گنا زیادہ ملجائیگا، صدہا ممالک پر ہلالی جھنڈا اڑیگا، اور ہزاروں کافر و مشرک دائرہ اسلام میں داخل ہونگے۔

تم غربت و افلاس کا خیال نہ کرو کہ قبض و بسط، اور تنگدستی اور کشائش اللہ کے ہاتھ میں ہے، یہ بالکل ممکن ہے کہ تمہارے پاس لاکھوں روپیہ ہو مگر اللہ ایسے سامان پیدا کردے کہ تمام دولت تمہارے لئے بیکار ثابت ہو، اور ناداری و تہیدستی کی زندگی بسر کرو، اور یہ بھی اسکے اختیار میں ہے کہ غربت کے ایام میں تمہیں ایسی فرحت و شادمانی نوازش کرے کہ بڑے بڑے دولتمندوں کو بھی نصیب نہ ہو۔

انتخاب امیر

تیاری مکمل ہو چکی ہے، ہر ایک فرزند اسلام جہاد فی سبیل اللہ کے جوش و ولولہ سے سرفروشی

کے لیے تیار ہے، مگر جب تک اس عظیم الشان اجماع کے لیے کوئی امیر نہ ہو اس کو حرکت نہیں دی جا سکتی۔ آئندہ آیات میں امیر کی ضرورت، اس کے خصائص و امتیازات، اور وجوہ انتخاب پر گفتگو کی جاتی ہے۔

(۲۴۶) أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا ۖ قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا ۖ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ○

کیا تم نے موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کی ایک جماعت کے حال پر نظر نہیں کی، جب انہوں نے اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دو تاکہ ہم اللہ کی راہ میں لڑیں، نبی نے کہا کیا عجب ہے کہ اگر تم پر جہاد فرض کیا جائے تو تم نہ لڑو، انہوں نے جواب دیا کہ کیا چیز اللہ کی راہ میں ہمارے لڑنے میں مانع ہے، ہماری حالت یہ ہے کہ ہم اپنے گھروں اور بچوں سے نکال دیے گئے ہیں، پس جب ان پر جہاد فرض کیا گیا تو بجز چند آدمیوں کے سب پھر گئے، اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

تعلیمی کام اور ملکی انتظام دو جداگانہ فرائض ہیں، مگر کبھی کبھی اللہ تعالیٰ ان دونوں کو ایک ہی وجود میں جمع کر دیتا ہے، ورنہ عام طور پر الگ الگ ہوتے ہیں، اشموئیل نبی صرف تعلیمی امور کے منتظم اعلیٰ تھے، ان سے بنی اسرائیل نے درخواست کی کہ جہاد فی سبیل اللہ کے لیے سپہ سالار کی ضرورت ہے، جس کی امارت و سرکردگی میں ہم مخالفین سے جنگ کر سکیں، اشموئیل کو معلوم تھا کہ یہ لوگ ابھی اس کام کے لیے تیار نہیں، اسی لیے انہوں نے دریافت کیا کہ عین وقت پر بھاگو گے تو نہیں، سب نے متفقہ طور پر جواب دیا کہ ملک پر غیروں کا قبضہ ہے، ہماری اولاد کو ہم سے جدا کر دیا گیا ہے، قومیت اور وطنیت دونوں فنا ہو چکی ہیں، اب بھی ہم لڑنے کو تیار نہ ہوں گے تو پھر اور کونسا وقت ہوگا؟ مگر انجام کار وہی ہوا جس کا کھٹکا تھا۔

جنگ میں جانے سے قبل اس امر کی ضرورت ہے کہ فوج ہر قسم کے سامان جنگ سے مسلح ہو فنون حرب کی مشق کر لی ہو، اور لڑائی کے وقت جن سائنس اور چالبازیوں کی ضرورت ہو انکی

مہارت بہم پہونچائی ہو، یہ لوگ اس کے لئے تیار نہ تھے، ایک عارضی اور ہنگامی جوش تھا، جس نے ان کو لڑنے کے لئے ابھارا تھا،

اس نبی کا نام سموئیل تھا جس کے لئے حسب ذیل شہادت کافی ہے: تو بھی لوگوں نے سموئیل کی بات سننے سے انکار کیا، اور کہا نہیں ہم تو بادشاہ چاہتے ہیں جو ہمارے اوپر مقرر ہو تا کہ ہم بھی اور سب گروہوں کی مانند ہو ویں، اور ہمارا بادشاہ ہماری عدالت کرے، اور ہمارے آگے آگے چلے، اور ہمارے لئے لڑائی لڑے، (سموئیل ۸: ۱۹و۲۰)

اس آیت سے یہ نتیجہ نکلا کہ کام شروع کرنے سے قبل امیر کا انتخاب ضروری ہے، آگے چلکر ان شرائط کا تذکرہ آتا ہے، جن خصوصیات کی بنا پر اس کا تقرر عمل میں آئیگا۔

شرائط انتخاب

(۲۴۷) وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ قَالُوٓا أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۖ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝	اور ان سے ان کے پیغمبر نے کہا کہ اللہ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے، انہوں نے کہا، اسکو ہمارے اوپر کیونکر حکومت ہو سکتی ہے، حالانکہ اس کی نسبت ہم حکومت کے زیادہ حقدار ہیں، اور اس کو تو مال کی وسعت بھی نہیں دی گئی، نبی نے جواب دیا کہ اللہ نے اسکو تم پر پسند فرمایا ہے، اور علم اور جسم میں اسکو فراخی دی ہے، اور اللہ اپنا ملک جسکو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ فراخی والا واقف کار ہے۔

ان کی درخواست پر طالوت کو بادشاہ مقرر کیا گیا، بنی اسرائیل کو خیال تھا کہ حکومت و فرماں روائی اور فوجوں کی امارت کے لئے وجہ انتخاب صرف دولت ہی ہو سکتی ہے، ان کو اپنی فراخی و فارغ البالی پر ناز تھا، وہ طالوت جیسے غریب و مفلس شخص کو اپنا امیر کیسے دیکھ سکتے تھے، اس لئے اعتراضات شروع کر دیے، نبی نے کہا کہ امارت کے لئے دو چیزوں

کی ضرورت ہی، (الف) علم، ملک کا نظم و نسق قائم رکھ سکے، بہترین طریق سے حکومت کرنے کے قابل ہو، اور سیاسی مسائل کی پیچیدگیاں سلجھا سکے، (ب) جسم اس کی ظاہری شکل و صورت پر رعب، داب ٹپکتا ہو، لوگوں پر اسکی ہیبت طاری ہو، فن حرب کا ماہر، اور فنون جنگ سے اچھی طرح واقف ہو، اور فوجوں کو نظم و ترتیب کے ساتھ لڑا سکے - یہ دونوں اوصاف طالوت میں علیٰ وجہ الکمال موجود ہیں، اور یہی باتیں ہیں جن کی بنا پر ایک شخص امیر یا پادشاہ منتخب کیا جا سکتا ہی، اللہ کا علم بہت وسیع ہی، اس کی نظر تمام لوگوں پر ہوتی ہے، وہ جس میں قابلیت اور استعداد دیکھتا ہی اس کو حکومت کے لئے چن لیتا ہی -

دنیا نے ہمیشہ اپنے خاندان اور نسلی امتیازات کی پرستش کی ہے، نسل و قوم کے بت کے آگے برابر سربسجود رہی ہی، اسلام نے آتے ہی ان قومی و نسلی امتیازات کو مٹا کر ہمیشہ کے لئے صرف انسانیت کی بے قید و عام عظمت کو قائم کر دیا، اور عمل کے قانون الٰہی پر زور دیا، اس نے اپنی دعوت کی سب سے پہلی اور کاری ضرب اسی غرور نسل و قوم کے بت پر لگائی، اور اعلان کر دیا کہ: یایہا الناس انا خلقنکم من ذکر و انثیٰ وجعلنکم شعوبا و قبائل لتعارفوا، ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (۴۹-۳۰) یعنی ہر طرح کی فضیلت اور بزرگی کی بنیاد صرف عمل ہے اور کوئی شے نہیں - قوموں اور خاندانوں کی تفریق صرف اس لئے ہی کہ باہم گر پہچان اور تمیز کا ذریعہ ہو، سب سے بڑا انسان وہی ہی جو سب سے زیادہ متقی ہو -

جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں سب سے آخری مہم بھیجی تو اسکی سرداری اسامہ کو دی، جن کے والد زید آپ کے غلام تھے، بعض ظاہر بینوں پر یہ بات گراں گزری، تو آپ نے فرمایا: لقد طعنتم فی امارۃ ابیہ وقد کان لہا اھلا و ان اسامتہ لہا اھل، تم لوگ پہلے زید کی سرداری پر بھی طعن کر چکے ہو، حالانکہ وہ اس کا اہل تھا، اور اب اسامہ سردار بنایا گیا ہی، اور وہ اس کا اہل ہی، اہل کے لفظ پر زور دیا، یعنی طعن بیکار ہی کیونکہ امارت و سرداری کے معاملہ کی بنیاد صرف اہلیت و قابلیت ہی، اور کچھ نہیں -

قرآن حکیم اس بادشاہ کا نام طالوت بیان کرتا ہی، اور کتاب مقدس میں اس کا نام ساؤل آیا ہی، لیکن درصل دونوں میں کوئی اختلاف نہیں، اس لئے کہ ساؤل کے متعلق حسب ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

تب وہ دوڑے اور اسے وہاں سے لائے، اور وہ جماعت کے درمیان کھڑا ہوا تو شانوں سے لیکر اوپر تک سب لوگوں سے زیادہ لمبا تھا (اسموئیل، ۱۰: ۲۳) طالوت، طول سے مشتق ہے، اور اس سے قد کی لمبائی معلوم ہوتی ہی، کتاب مقدس سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ اسی ساؤل کے انتخاب پر نکتہ چینی کی گئی تھی:

سو ساؤل جواب میں بولا کیا میں بنیمینی نہیں جو اسرائیل کے سب فرقوں سے چھوٹا ہی؟ اور کیا میرا گھرانا بنیمین کے فرقے کے سارے گھرانوں میں سب سے زیادہ چھوٹا نہیں؟ پس کیا سبب جو تو مجھ سے یوں بولتا ہی (اسموئیل، ۹: ۲۱) پر بنی بلعال بولے کہ یہ شخص ہم کو کس طرح بچائیگا؟ اور اس کی تحقیر کی، اور اس کے لئے نذر لے نہ لائے، پر اس نے آپ کو ایسا بنایا کہ گویا نہ سنتا تھا، (اسموئیل، ۱۰: ۲۷)

نزول برکات

امیر کا انتخاب ہوگیا، مگر بنی اسرائیل اس پر مطمئن نہیں، ان کا خیال یہ ہی کہ صاحب دولت ہی اس جلیل القدر منصب کا اہل ہوسکتا ہی، ضرورت ہی کہ ان کے شبہات کو دور کردیا جائے، ورنہ آگے چلکر رکاوٹیں پیدا ہونگی، عام رائے کا احترام ضروری ہی، اس لئے فرمایا:-

(۲۴۸) وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ○	اور ان سے ان کے نبی نے کہا کہ ان کے بادشاہ ہونے کی نشانی یہ ہی کہ تمہارے پاس ایک صندوق آئیگا جس میں تمہارے رب کی طرف سے دلجمعی ہی اور وہ بچی ہوئی چیزیں ہیں جنکو موسیٰ اور ہارون کی اولاد چھوڑ گئی تھی اسکو فرشتے اٹھائے ہونگے اگر تم ایمان رکھتے ہو تو بیشک تمہارے لئے اس میں پوری نشانی ہی۔

اگر یہ انتخاب صحیح ہے، اور اللہ بھی اس کو پسند کرتا ہے تو اس کی نشانی یہ ہوگی کہ وہ صندوق تمہارے پاس واپس آئیگا جس کو تمہارے دشمن تم سے چھین کرلے گئے ہیں، بنی اسرائیل کے پاس ایک صندوق تھا جس میں موسیٰ وہارون کے تبرکات تھے، ان کا قاعدہ تھا کہ جنگ کے وقت ان کو اپنے ساتھ رکھتے، ان کی برکت سے ان میں جوش وولولہ، اور استقلال وثبات قدم پیدا ہوتا، اور اپنی تمام قوت جنگ میں صرف کردیتے، پوری ہمت سے کام لیتے، اور مظفرومنصور واپس آتے، ایک دفعہ بعض ناگہانی حوادث کی بنا پر اس صندوق پر دشمنوں نے قبضہ کرلیا، اس کے چھنتے ہی انہیں اپنی شکست کا یقین ہوگیا، جبن ونامردی نے ان کو گھیرلیا، اور ہمت ہار بیٹھے۔ جس وقت دشمن تابوت کولے گیا ہے تو اللہ کے کرشمائے قدرت کا ظہور رہوا، جہاں تابوت ہوتا وبا پھیل جاتی، اور تمام آبادی برباد ہونا شروع ہوجاتی، انہیں خیال ہوا کہ یہ اس صندوق کی نحوست کا نتیجہ ہے، اس لئے بیل گاڑی پر لادکر بیلوں کو شہر سے باہر تک ہانک دیا، ملاء سافل کے فرشتوں نے ان بیلوں کو بنی اسرائیل کی طرف متوجہ کردیا، اور گاڑی صندوق کے ساتھ شہر میں آگئی، اس واقعہ نے یہودیوں کے شبہات کو زائل کردیا، اور انہیں یقین ہوگیا کہ انتخاب صحیح ہے، اور ہم ضرور کامیاب ہونگے ۔

فوج کا امتحان

میدان جنگ میں جانے سے پہلے فوج کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ جھوٹے اور سچے، کھوٹے اور کھرے، اور کمزور اور طاقتور میں تمیز ہوجائے، لڑائی میں صرف بہادر اور طاقتور ہی مفید ہوسکتے ہیں، اعلان جنگ کے وقت چونکہ طبیعتوں میں جوش وہیجان پیدا ہوجاتا ہے، اسلئے ہر شخص اپنے اندر لڑنے کا شوق پاتا ہے، مگر محض شوق مفید نہیں جب تک فنون حرب سے واقفیت نہ ہو، تکلیفوں اور مصیبتوں کے برداشت کرنے کی عادت نہ ہو، اور سخت سے سخت خوف کے وقت بھی گھبراہٹ طاری نہ ہو، اس لئے امتحان لینا ضروری ٹھیرا :-

(۲۴۹) فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ | پھر جب طالوت فوجوں سمیت روانہ ہوا تو کہا کہ اللہ تمکو ایک

قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً ۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ ھُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً ۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝

نہر سے آزمائیگا، پس اس میں سے جو پانی پیئے گا تو وہ میرا نہیں ہی، اور جس نے اسکو نہ چکھا تو بیشک وہ میرا ہی مگر جو ایک چلو اپنے ہاتھ سے بھر لے، پس ان میں سے چند آدمیوں کے سوا سب نے پی لیا، پھر جب طالوت اور ایمان والے جو اسکے ساتھ تھے نہر کے پار ہو گئے تو کہنے لگے کہ جالوت اور اس کے لشکر سے مقابلہ کرنے کی آج ہم میں طاقت نہیں ہے وہ لوگ جو یقین رکھتے تھے کہ وہ اللہ سے ملنے والے ہیں بول اٹھے کہ تھوڑی سی جماعت بڑی جماعت پر اکثر اللہ کے حکم سے غالب آگئی ہی، اور اللہ صبر کرنیوالوں کے ساتھ ہی۔

طالوت ایک عظیم الشان فوج لیکر روانہ ہوئے اور کہا کہ راستہ میں ایک نہر آتی ہی، شدّت تشنگی کے وقت تمہارا اس پر سے گزر ہوگا، اور اسی جگہہ تمہارے استقلال نفس کا امتحان ہو جائیگا، قانون تو یہی ہے کہ کوئی شخص ایک گھونٹ بھی پانی نہ پیئے، مگر تمہاری حالت کو پیش نظر رکھکر صرف ایک چلو پانی کی اجازت دی جاتی ہی، ان لوگوں کو مصیبتوں کے برداشت کرنے کی عادت نہ تھی، معدودے چند کے سوا سب نے خوب پانی پی لیا، اب ان میں یہ طاقت نہ رہی کہ نہر کو عبور کرسکیں، پیٹ پھول گئے، اور آخر اسی کنارہ پر انہیں ٹھیرنا پڑا، طالوت باقی ماندہ نوجوانوں کو لیکر پار ہوئے، دونوں فوجیں صف آرا ہوئیں، تو انہیں اپنی قلت تعداد، فقدان اسباب، اور ضعف ظاہری کا احساس ہوا، اور پکار اٹھے کہ ہم میں ان سے مقابلہ کی طاقت نہیں، مگر ان میں کچھہ لوگ ایسے بھی پیکر صدق و اخلاص تھے، جو صرف خدائے واحد کی ذات پر اعتماد و توکل رکھتے تھے، انہیں یقین تھا کہ ہم صرف اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر جنگ کر رہے ہیں، جن لوگوں کو احتساب اعمال کا یقین ہو وہ صرف خدا ہی کی قاہرانہ قوت سے دب سکتے ہیں، ان کی قوت ارادیہ اس درجہ مضبوط و مستحکم ہو جاتی ہی کہ دنیا کی

اور وہ حکومت و نبوت سے سرفراز کیے گئے۔

دنیا میں اگر لڑائی کا سلسلہ بند ہوجاتا تو تمام کرہ ارضی شر و فساد کا گھر بن جاتا، مگر اللہ کو ابھی اس کا باقی رکھنا منظور ہے، اس لئے کفر و ارباب کفر کی باطل پرستانہ سعی و کوشش کو فنا کرنے کے لئے سرفروشوں کو کھڑا کر دیا جاتا ہے، انسانوں کے مقابلہ میں انسان ہی لائے جاتے ہیں کہ کفار و معاندین اسلام کتے کی موت نہ مریں، بلکہ دل کی بھڑاس نکال کر جہنم میں داخل ہوں: لیھلک من ھلک عن بینۃ، اور یہ اللہ کا فضل مخصوص ہے کہ حق کو باقی رکھنے کے لئے ضرور ایک جماعت پیدا کر دی جاتی ہے: لاتزال طائفۃ من امتی یقتلون علی الحق ظاھرین الی یوم القیمۃ۔

(۲۵۲) تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ۝	یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہماری ضرورتوں کو پیش نظر رکھکر ہم تم پر پڑھتے ہیں، اور بلاشبہ تم پیغمبروں میں سے ہو۔

گزشتہ قصہ پر دوبارہ نظر ڈالئے، آپ دیکھیں گے کہ اس سے حسب ذیل مسائل کا استنباط و استخراج ہوتا ہے:۔

(۱) جنگ شروع کرنے سے قبل امیر کا انتخاب ضروری ہے،

(۲) امیر کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے:۔

(الف) جہانگیری و جہانداری کے مسائل سے خوب واقف ہو۔

(ب) فنون جنگ میں اسے درخور وافی حاصل ہو۔

(۳) رائے عامہ کا احترام ضروری ہے، اگر اس کے خلاف کوئی بات کہی جائے تو عام لوگوں کو اطمینان دلایا جائے، ورنہ کام میں رکاوٹ پیدا ہو جائیگی۔

(۴) امارت کے لئے دولت پر نظر نہ ہو، اور صدر نشینی کے لئے مالداروں کو تلاش نہ کیا جائے۔

(۵) جو لوگ اپنی خدمات پیش کریں، ان کا امتحان لینا ضروری ہے کہ کھوٹے اور کھرے

میں تمیز ہو۔

(۶) صرف مقصد حیات پر مرنے والوں سے کام لیا جائے۔

(۷) کامیابی کے لئے امیر کی نظر قلت و کثرت تعداد پر نہ ہو، بلکہ جذبات حسنہ، اور اخلاق فاضلہ پر ہو۔

(۸) نتائج کو اللہ پر چھوڑ دیا جائے، اور یہی توکل ہے۔

(۹) حق و صدق کی مدافعت، اور کفر و باطل پرستی کے استیصال کے لئے سر فروشوں کا ایک گروہ ہمیشہ تیار رہے۔

(۱۰) بنی اسرائیل نے حکومت قائم کی، اس لئے مسلمان اپنی حکومت قائم کریں۔

یہ تمام قصہ اس لئے بیان کیا گیا تھا کہ جس طرح بنی اسرائیل نے اپنی حکومت قائم کی ایسے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں پیش گوئی کی گئی ہے کہ آپ کو بھی مخالفین و معاندین اسلام سے جنگ کرنی پڑیگی، انجام کار آپ غالب رہینگے، اور آپ کو امت مسلمہ کے بقا و قیام کے لئے سلطنت قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوگی، اس لئے آپ کی آیندہ ضروریات کو پیش نظر رکھکر یہ قصہ اس وقت بیان کیا جاتا ہے، اور اس قصہ میں ان تمام سیاسی امور کی تعلیم دی گئی ہے جو قیام حکومت میں پیش آئینگے۔ اور آپ آسانی سے ان کی بنا پر تنظیم مملکت کر سکیں گے، حضرت داؤد، انبیاء مرسلین میں سے تھے، ان کو جہانگیری و جہانداری کے علوم نوازش کئے گئے، آپ بھی نبی مرسل ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ ان نوازش ہائے گوناگوں سے آپ بھی سرفراز کئے جائیں۔
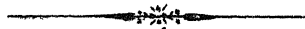
خلافتِ کبریٰ

ایک لطیف نکتہ

(۲۵۳) تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِّنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ۔

یہ تمام پیغمبر ہیں کہ ہم نے ان میں ایک کو دوسرے پر برتری دی، بعض ان میں وہ ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا، اور بعض کو درجوں میں بلند کیا، اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو معجزات دیے، اور ہم نے ان کو روح القدس سے قوت دی، اور اگر اللہ چاہتا تو وہ لوگ جو ان کے پیچھے آئے آپس میں نہ لڑتے بعد اس کے کہ انکے پاس نشانیاں آچکیں، لیکن وہ مختلف ہوئے، تو انہیں سے کوئی تو ایمان لے آیا، اور کسی نے کفر کیا، اور اگر اللہ چاہتا تو وہ باہم نہ لڑتے، لیکن اللہ جو چاہے کرتا ہے۔

اگرچہ ماقبل میں کئی انبیاء و رسل کا تذکرہ آچکا ہے، جو نبوت میں مساوی ہیں مگر پھر بھی ان کے فرائض کے اعتبار سے ان میں فرق مراتب ضرور ہے، اور یہی امور ایک دوسرے پر ان کی فضیلت و بزرگی کا اظہار کرتے ہیں، جس مقصد کے لئے موسیٰ کی بعثت ہوئی اس سے داؤد کا نصب العین جداگانہ تھا، یہی حال عشق و محبت، اور شیفتگی و وارفتگی کا ہے، بعض صرف

ایک نظر سے اپنے محبوب حقیقی کی زیارت سے شرف اندوز ہوتے ہیں، کسی کو باتوں کا موقع دیا جاتا ہے، بعض کے، جنوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ان کو دیدار اور کلام دونوں سے حصّہ وافر ملتا ہے، موسیٰ علیہ السلام ان جلیل القدر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام میں سے تھے، جن کو خداوند قدوس نے شرف ہم کلامی بخشا۔

تعلیم و تربیت کو دیکھئے تو یہاں بھی وہ ایک دوسرے سے مختلف نظر آئیں گے، ان مراتب کی تقسیم یوں ہو سکتی ہے، (الف) تہذیب اخلاق، (ب) تدبیر منزل، (ج) سیاست مدن (د) خلافت کبریٰ۔ تمام انبیاء و رسل کا روئے سخن اپنی اپنی قوم کی طرف تھا، اس لئے ان میں سے کوئی بھی سیاست مدن سے آگے نہ بڑھ سکا وما من قریۃ الا خلا فیہا نذیر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جملہ اقوام و امم اور مذاہب و ادیان کی اصلاح کے لئے مبعوث ہوئے لتخرج الناس من الظلمت الی النور، اور یہی وہ خصوصیت و مزیت ہے جس نے آپ کو خلافت کبریٰ نوازش کی، اور آپ کی اُمت کو شھداء علی الناس کا منصب جلیل عطا کیا

بنی اسرائیل کے موسس اوّل تو حضرت موسیٰ ہیں، مگر ان کو انتہائی عروج، ارض مقدس کی حکومت و فرماں روائی داؤد کے زمانہ میں نصیب ہوئی، دنیاوی کمالات، اور ظاہری شان شوکت کے لحاظ سے ان کو جو نمایاں اور ممتاز خصوصیت حاصل ہے، وہ کسی اور بنی اسرائیلی نبی کو نصیب نہیں، دوسری طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام دکھائی دیتے ہیں، جن کی وساطت سے یہودیوں کو روحانی ترقیاں، اخلاقی کمالات، اور باطنی فضائل حاصل ہوئے، اور اس طرح جو سلسلہ موسیٰ عمران سے شروع ہوا تھا، ان دونوں بزرگوں کی تعلیم و تربیت نے اس کو کمال تک پہنچا دیا، اور اس اعتبار سے ان کی جس قدر مدح و ستایش کی جائے کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے پہلے داؤد کا ذکر کیا، اور ان کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کا نام لیا۔ مگر ان دونوں کی عجیب کیفیت ہے، دونوں نبی عربی کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، آپ کی تشریف آوری کو خدا کی آمد سے تعبیر کرتے ہیں، جب اپنے فضائل و کمالات اور ظاہری و باطنی ترقیات کو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بزرگیوں سے مقابلہ کرتے ہیں تو ان کو رسول کی کی ظاہری وباطنی رفعت قدر میں اللہ کی شان نظر آتی ہے،

اس سے معلوم ہوگیا کہ گزشتہ آیات میں دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت وبرتری کا اظہار کرنا تھا کہ آپ رحمۃ اللعالمین ہیں، ارسل الی الناس کافۃ بشیرا ونذیرا ہیں، آپ کی تعلیم میں گزشتہ صداقتوں کو ایک جگہ جمع کردیا ہے. اور آپ کی ذات اقدس میں نوح علیہ السلام کی سی سرگرمی، ابراہیم علیہ السلام جیسی نرم دلی، یوسف علیہ السلام کی سی درگذر، داود علیہ السلام کی سی فتوحات، یعقوب علیہ السلام کا سا صبر، عیسیٰ علیہ السلام کی سی خاکساری، زکریا علیہ السلام کا سا زہد، اور اسمٰعیل علیہ السلام کی سی سبک روحی موجود ہے۔

اے کہ بر تخت سیادت ز ازل جا داری

انچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری!

فطرت انسانی تو محض خیر اور نیکی پر پیدا کی گئی تھی، مگر خارجی اثرات ضلالت، اور باد صرصر کے تیز و تند جھونکوں نے اس کے آئینہ فطرت کو گرد آلود کردیا، تعلیم صحیح ان لوگوں کے پاس آئی کہ اپنی فطرت اصلیہ کو قایم رکھیں، مگر ان لوگوں نے اختلاف پیدا کرکے اپنے آپ کو تباہ کردیا۔ تین نبی قریب قریب ہوئے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام اس لئے آئے کہ بنی اسرائیل کو فرعون کے پنجہ قہر واستبداد سے نجات دلوائیں: ان ارسل معنا بنی اسرائیل عیسیٰ علیہ السلام ماقبل کے مصدق، اور مابعد کے لئے مبشر بنا کر بھیجے گئے مصدقا لما بین یدی من التوراۃ ومبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد، اور آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام دنیا کے لئے آئینہ ... بنا کر بھیجا گیا جن لوگوں نے ازبیا ... بنی اسرائیل کی تعلیم کو صحیح طور پر اخذ کرلیا وہ نبی عربی کی ... کے فورا ... ہو گئے اور جن پر ان کی صحبت نے کوئی اثر نہیں ڈالا، وہ ضرور اس تعلیم کی مخالفت کرینگے، یہودیت، نصرانیت، اور اسلام میں کشمکش ہوکر رہیگی، اور جنگ ایک لازمہ انسانیت ہو جائیگی۔

کسریٰ مشرقی نبوتوں کا مرکز تھا، اور قیصر بنی اسرائیلی رسالت کا، دونوں کی آپس میں جنگ ہو رہی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر شاہنشاہی اختیارات سے کام لیکر ان کے اختلافات کو رفع کیا، اور ان کو لوائے توحید کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا کہ آیندہ لڑنے نہ پائیں: تبٰرك الذی نزل الفرقان علی عبدہ لیکون للعٰلمین نذیرا (۲۵ : ۱) گویا آپ کا روئے سخن عالمگیر ہے، اور قرآن کا مقصد یہ ہے کہ اس کی تعلیم عام ہو، اس غرض کی تکمیل خلافت کبریٰ سے ہوگی، اور آپ کی اُمّت کو یہ عزت و سربلندی نوازش کی جائیگی۔

(۲۵۴) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۲ : ۱)	مسلمانو! اس مال سے جو ہم نے تم کو دیا ہے خرچ کر لو قبل اس کے کہ وہ دن آجائے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوستی، اور نہ سفارش، اور کافر ہی ظالم ہیں۔

تمہاری حیثیت ایک [illegible] حکومت دشمنوں کے ساتھ، جس کے بقا واستحکام کے لئے ہر وقت روپیہ کی ضرورت ہوگی، اس لئے زمین میں گاڑنے، اور بینکوں میں جمع کرنے کی بجائے اپنی تمام دولت خلافت کی نذر کردو، جو سب سے زیادہ روپیہ دیگا اسی کی قدر ہوگی، اور اگر اتفاق سے یہاں اس کو کوئی اجر نہ مل سکا تو مرنے کے بعد اس کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہوجائیگی، اور یہی روپیہ تمہیں عذاب الیم سے نجات دلائیگا، جو لوگ خلافت کی مدد نہیں کرتے، وہ نادانی وجہالت میں مبتلا ہیں، اور اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں، اگر مسلمانوں کی حکومت نہ رہیگی تو ان کو زندگی کا کیا لطف آئیگا۔

خلیفۂ اسلام کے فرائض

مختلف اقوام دنیا میں جنگ ہو کر رہیگی، ارباب ایمان واخلاص اپنی ہر چیز قربان کر بیٹھیں گے، باطل کفر وشیطنت کو مٹا دیں، مگر شیاطین وطواغیت بھی اپنی باطل پرستانہ

سعی و کوشش سے باز نہ آئینگے، اس خلافت کا فرض ہوگا کہ اپنی قاہرانہ قوت اور عالمگیر اقتدار سے کام لیکر ان کوششوں کو دبا دے، حکومت کے صدہا مشاغل ہونگے، ہزارہا صیغے اور محکمے قائم ہو جائینگے، ماتحت حکام ملک کے نظم و نسق کا خیال رکھینگے، خلیفۃ اللہ فی الارض ان کا نگران کار و محافظ ہوگا، اور جہاں یہ کسی بدعملی کے مرتکب ہونگے فوراً ان کو تنبیہ کر دیگا، اس لئے اگلی آیات میں خلیفہ کے فرائض بیان کئے جاتے ہیں:-

(۲۵۵) اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۭ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَـــُٔـوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ○	اللہ کی وہ ذات ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ ہے سب کا تھامنے والا، اس کو اونگھ اور نیند نہیں آتی، جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اسی کا ہے، کون ہے جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے؟ جو کچھ خلق کے روبرو ہے اور جو ان کے پیچھے ہے، وہ جانتا ہے، اس کی معلومات میں سے وہ کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے، مگر جتنا وہ چاہے، اس کی کرسی آسمانوں اور زمین کو گھیرے ہوئے ہے، اور ان کی حفاظت

اس کو گراں نہیں گزرتی، اور وہ عالیشان عظمت والا ہے۔

انسان بالطبع آزاد پیدا کیا گیا ہے، صرف خدائے قدوس ہی کی ذات ہے جس کی غلامی کرنا انسان کے لئے باعث صد ہزار فخر و امتیاز ہے، وہی ایک قوت قدسی ہے جو تمام زمین و آسمان میں مصروف عمل ہے، اصل میں بمنزلہ حقیقۃ الحقائق صرف اللہ کا ذکر ہوتا ہے، مگر جب بدبختان نوع انسانی اس کے ساتھ دوسروں کو بھی شریک کرنے لگیں تو ذکر الٰہی توحید سے بدل جاتا ہے، یعنی اللہ کا اثبات، اور غیر اللہ کی نفی، گویا توحید کے سوا کوئی چیز مطلوب نہیں۔

دنیا میں جس قدر چیزیں ہیں، مادہ اور صورت سے ترکیب دی گئی ہیں، جس صفت الٰہی کے عکس سے صورتیں مبنی ہیں اس کو حی سے تعبیر کرتے ہیں، اور جس پر مادوں کی انتہا ہوتی

ں آس کا نام قیوم ہے، حی جو خود زندہ ہی اور دوسروں کو زندگی بخشتا ہی، ویبقی وجہ
ربک ذوالجلال والاکرام (۵۵ : ۲۷) اور قیوم جو خود قائم ہے، اور دوسروں کے
کے قیام کا موجب ہی نظم ونسق قائم کرنے والا، ان اللہ یمسک السمٰوٰت والارض
ن تزولا ولئن زالتا ان امسکہما من احد من بعدہ (۳۵ : ۳۹) گویا یہ دونوں
م اللہ لا الٰہ الا ھو کی شرح وتفسیر ہیں، غزوہ بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
ایت ہی الحاح وتضرع کے ساتھ یا حی یا قیوم باربار پڑھتے تھے کہ کفار ومشرکین کے مقابلہ
ں اسلام زندہ وقائم رہے۔

وہ اگرچہ ہر چیز کو زندگی بخشتا ہی، اور زمین وآسمان کا قیام اسی کی ذات کے ساتھ
ابستہ ہی، مگر باوجود اس کے یہ کبھی نہیں ہوتا کہ قوتوں کے اضمحلال اور ضعف وناتوانی کی وجہ
سے اس پر اونگھ طاری ہو، بلکہ وہ برابر مصروف عمل رہتا ہی، کمزوری اور نقاہت کا نام ونشان
یں، اس پر تعطل وبیکاری کا زمانہ نہیں آتا، اور نہ کام کرتے کرتے اس کو آرام کی ضرورت محسوس
وتی ہی، بلکہ نیند سے پاک ہی۔

اللہ کے سوا جو کچھ ہی زمین وآسمان میں جس قدر چیزیں ہیں سب پر اسی کا قبضہ ہی،
ورہی ہر انسان کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہی، اگر تم نے ایسے باجبروت بادشاہ کی مخالفت
ں، تو یاد رہے اس کے دربار میں کسی کو شفاعت کرنے کی جرأت نہ ہوگی، مگر ہاں جس کو وہ خود
نجات دینے کا آرزومند ہو، اور اس کے لئے کسی کو شفاعت کرنے کی اجازت دیدے حقیقت
ہی کہ شفاعت کی ضرورت وہاں محسوس ہوتی ہی، جس جگہ واقعات کا حاکم کو پورا علم نہ ہو، اور
اللہ کو تو ایک ایک ذرہ کی خبر ہے، اس کے علم کا کون احاطہ کرسکتا ہی، ہاں وہ خود ہی اپنے
لم کے بحر ناپیدا کنار میں سے کسی کو ایک قطرہ نوازش کردیتا ہی، مگر یہ کبھی نہیں ہوا کہ ایک ہی
نسان کو اتنا علم دیدے جتنا اس کو ہی۔

اس کی حکومت وپادشاہت تمام آسمان وزمین کو گھیرے ہوئے ہی، کوئی نہیں جو اس کے

دائرہ حکومت سے نکلنے کی کوشش کرے اور وہ خارج بھی ہو جائے، یٰمعشر الجن والانس ان استطعتم ان تنفذوا من اقطار السمٰوٰت والارض فانفذوا لا تنفذون الا بسلطٰن، (۵۵: ۳۳) بلکہ جس جگہ جائیگا اسی کی حکومت ہوگی، فاینما تولوا فثم وجہ اللہ، زمین و آسمان، اور ان دونوں کے درمیان جو کچھ ہے، وہ ان کی حفاظت سے نہیں تھکتا، اس کی ذات اقدس بہت بزرگ و برتر ہے اور انسانی فہم و ادراک سے ورا الوریٰ ثم ورا الوریٰ ثم ورا الوریٰ ہے، تمام چیزیں اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔

ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنا تعلق، اللہ کے ساتھ اسی قسم کا رکھے جو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے اور اس میں کمی نہ آنے دے، کیونکہ تمام خرابیوں، اور بربادیوں کا سرچشمہ توحید کا چھوڑ دینا ہے، تمام مذاہب و ادیان کو اس توحید کے ماننے سے انکار نہیں ہو سکتا، اور یہی خلیفہ کا اوّلین فرض ہے کہ اس آیت کو اپنی خلافت کے اطراف و جوانب میں شائع کرے، اور جملہ اقوام و ملل کو اس کی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کرے۔

جبر و اکراہ کی ضرورت نہیں

(۲۵۶) لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۚ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۚ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○	دین کے بارے میں کچھ زبردستی نہیں، بے شک گمراہی سے ہدایت ظاہر ہو چکی، تو جو طاغوت کا کفر کرے، اور اللہ پر ایمان لائے، تو اس نے بے شک مضبوط حلقہ پکڑ لیا، جو ٹوٹنے والا نہیں، اور اللہ سنتا جانتا ہے۔

دنیا کا دستور ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ جن قوموں کے پاس صداقت اور سچائی کی کوئی چیز بھی نہیں ہوئی انہوں نے دوسروں کو اپنے قبضہ میں لانے، اپنے اصول منوانے، اور اپنا مطیع و فرماں بردار بنانے کے لئے نیزوں کے پھلوں، تلوار کی دھار، اور ہتھیاروں کی جھنکار سے فائدہ اٹھایا ہے، اور قوت کے زور سے اپنے خیالات و افکار کی نشر و اشاعت

کی ہی، مگر اسلام ہی وہ سب سے پہلی آواز حق و صدق ہی جس کو تبلیغ و دعوت کے لئے کسی طاقت کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، اس نے گمراہی و ضلالت اور ہدایت کو ایک دوسرے سے نمایاں کر دیا، سعادت و شقاوت انسانی کی راہیں واضح کر دیں، اور روشنی اور اندھیاری صاف صاف نظر آنے لگ گئی، نور و ظلمت میں فرق و امتیاز ہو گیا، اور اس لئے لسان الٰہی نے ہمیشہ کے لئے اعلان کر دیا کہ لا اکراہ فی الدین، خلیفہ کا کام یہ ہی کہ ہدایت و ضلالت، نور و ظلمت، اور اسلام و کفر میں ایسا فرق و امتیاز کر دے کہ ہر شخص سمجھ جائے، اور لوگوں کی ترغیب و تحریص کے سامان فراہم کر دے، اور جو لوگ اسلام قبول کرنے کو تیار ہوں، ان کی راہ سے رکاوٹوں کو دور کر دے، پس جس نے طغیان و سرکشی کی ہر چیز سے نفرت کا اظہار کیا، خواہ وہ اصنام و طواغیت ہوں، یا انسان اور جن ہوں، سب سے بغاوت کا اعلان کیا، اور زمین و آسمان کے بادشاہ کے آستانہ جلال و کبریائی پر اپنا سر نیاز جھکا دیا، اور اس کا ہر حکم ماننے کو تیار ہو گیا، تو بیشک اس نے ایسے محکم و مضبوط کڑے میں ہاتھ ڈالا جو کبھی بھی ٹوٹ نہیں سکتا، بلکہ برابر ترقی کرتا رہیگا، اللہ کو معلوم ہی کہ تم نے طاغوت سے علیحدگی اختیار کی، اس لئے تمہاری ترقی کے لئے عظیم الشان میدان کھول دیگا۔

(۲۵۷) اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۗ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔــهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۗ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○

اللہ ان کا حامی ہی جو ایمان لائے، ان کو اندھیروں سے اجالے کی جانب نکالتا ہی، اور جو لوگ کافر ہیں، انکے رفیق شیطان ہیں، جو ان کو اجالے سے اندھیروں کی جانب نکالتے ہیں، یہی لوگ دوزخی ہیں، اور اس میں ہمیشہ رہینگے۔

جو لوگ صرف خدائے واحد کی غلامی کرینگے، ان کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہوں گی، شیاطین اپنا اثر ڈالنے کی کوشش کرینگے، ظلمت چاروں طرف سے گھیر لیگی، قوانین الٰہی

میں شبہات رونما ہونگے، لیکن اللہ نور السموٰت والارض کی ایک ہی جلوہ نمائی
ان تمام طواغیت کو فنا کر دیگی، شکوک رفع ہو جائینگے، ہدایت و رہ نمائی حاصل ہوگی، تمام
رکاوٹیں حرف غلط کی طرح مٹ جائینگی، جب کبھی کوئی قوت، حق کو دبانے کی کوشش کریگی،
اس کو فوراً برباد کر دیا جائیگا، اور مسلم قانت اپنے آگے نور ہی نور دیکھیگا، دوسری جگہ فرمایا:

قد جاءکم من اللہ نور وکتٰب مبین ۙ یہدی بہ اللہ من اتبع رضوانہ سبل
السلٰم ویخرجہم من الظلمٰت الی النور باذنہ ویہدیہم الیٰ صراط مستقیم
(۵ : ۱۸) لیکن انکار کرنے والے ظلمت و تاریکی میں مبتلا ہو جائینگے، ان کو حق و صدق میں اس
قدر شبہات پیدا ہونگے کہ اس کو باطل سمجھنے لگ جائیں گے۔

وجود باری تعالیٰ

انسان کبھی فسق و فجور سے باز نہیں رہ سکتا جب تک اس کو دو باتوں کا یقین نہ ہو،
(الف) اللہ موجود ہے، اور وہ ہمارے ہر عمل حیات کا نگران کار و محافظ ہے، (ب) جو کچھ ہم
کرتے ہیں، ان کے متعلق ایک روز سوال کیا جائیگا، اور احتساب اعمال سے بچنے کی کوئی صورت
نہیں، ان دو باتوں کو تسلیم کرنے کے بعد خود بخود اس امر کی ضرورت محسوس ہوگی کہ ان اعمال
و اخلاق کا پتہ لگایا جائے، جو نجات کا باعث ہیں، اور ان سے پرہیز کیا جائے، جو تباہی
لانے والے ہوں، اس لئے اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہیگا کہ (ج) نبی کی جانب
توجہ کی جائے جو ان تمام باتوں پر روشنی ڈال سکے، اگلے رکوع میں چند واقعات بیان کئے
گئے ہیں مگر ان میں وجود باری تعالیٰ، اور اثبات قیامت پر بحث کی گئی ہے، ان کو تسلیم کرنے
کے بعد تیسرا مقدمہ نبوت خود بخود ثابت ہو جائیگا۔

(۲۵۸) الم تر الی الذی حآج ابراھم فی ربہٖ ان اتٰہ اللہ الملک م اذ قال ابراھم ربی الذی یحیٖ و یمیت	کیا تونے اس کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے ان کے رب کے بارے میں بحث کی، اس وجہ سے کہ اللہ نے اس کو سلطنت دی تھی، جب ابراہیم نے کہا کہ میرا

قَالَ اَنَا اُحۡیٖ وَ اُمِیۡتُ ؕ قَالَ اِبۡرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاۡتِیۡ بِالشَّمۡسِ مِنَ الۡمَشۡرِقِ فَاۡتِ بِهَا مِنَ الۡمَغۡرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیۡ كَفَرَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ۞

رب وہ ہی جو جلاتا ہے اور مارتا ہے، وہ بولا کہ میں بھی جلاتا اور مارتا ہوں، ابراہیم نے کہا کہ اللہ تو سورج کو پورب سے لاتا ہے، پس تو اس کو پچھم سے لا، پس وہ کافر متحیر رہ گیا، اور اللہ نا انصاف لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ نبوت میں نمرود کو اپنی ظاہری شان و شوکت، اور جاہ و جلال کی وجہ سے دھوکا ہو گیا تھا کہ وہ خدا ہے، اسی لئے لوگوں سے سجدہ کراتا تھا: ابراہیم نے اس کو اللہ کی طرف توجہ دلائی تو وہ حیران ہو کر پوچھنے لگا کہ میرے سوا کوئی اور بھی خالق ارض و سما ہو سکتا ہے اور اس کی کیا خصوصیات ہونگی، انہوں نے جواب دیا کہ دنیا میں کروڑوں جان دار ہیں، جن کی زندگی اور موت کا رشتہ ایک بالاتر قوت کے ہاتھ میں ہے، مگر وہ اس حقیقت کو سمجھ نہ سکا، اور کہنے لگا کہ یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں، جس کو چاہوں قتل کر دوں، یا معافی دیدوں، حالانکہ اگر وہ ذرا غور کرتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ زندہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بے جان چیزوں میں جان ڈالنا اور مارنے سے مراد یہ ہے کہ اپنے اختیار و قدرت سے جان نکالنا۔

ابراہیم نے قرائن سے معلوم کر لیا کہ زندگی اور موت کی حقیقت سے وہ نا آشنائے محض ہے، اس لئے ایسے بلید الذہن کو سمجھانے کے لئے دوسرے جواب کی طرف متوجہ ہوئے، اور فرمایا کہ میرا رب وہ ہے جو آفتاب کو روز کے روز مشرق سے نکالتا ہے تو ایک ہی دن مغرب سے نکال کر دکھا۔ یہ سنتے ہی اس کی عقل ماری گئی، اور بھونچکا سا رہ گیا اب اس صریح شکست کا تقاضا تو یہ تھا کہ فوراً ہدایت قبول کر لیتا، مگر اس کو طاغوت کی ہم نشینی حاصل تھی، اس لئے اپنی ضد پر قائم رہا، ہدایت کے تمام اسباب فراہم ہوں، پھر بھی ایک شخص ان سے کام نہ لے، تو پھر ایسے شخص کی راہ نمائی کے لئے اور کوئی جدید سامان نہیں پیدا کیا جاتا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ نمرود یہ جواب دیسکتا تھا کہ مشرق سے تو میں سورج نکالتا ہوں، تم

مغرب سے نکال کر دکھاؤ، مگر حقیقت یہ ہی کہ ابراہیم کی بات نے اس کو اس درجہ مبہوت کر دیا تھا کہ اس کے ہوش و حواس ہی بجا نہ رہے تھے، مناظرہ کا بہترین طریق یہ ہی کہ مخالف کو تھوڑی دیر کے لئے حیران کر دیا جائے۔

گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اللہ ولی الذین اٰمنوا یخرجہم من الظلمٰت الی النور، والذین کفروا اولیاھم الطاغوت یخرجونہم من النور الی الظلمٰت، اس قصّہ نے بتا دیا کہ ابراہیم کی راہ میں ایک طاغوت حائل ہوا، مگر اللہ نے ان کی فوراً راہ نمائی کی، ایک نئی حجت سکھا دی، اور اس طرح کائنات خلت کو ظلمت سے نور کی طرف لے آیا، مگر نمرود طاغوت کی غلامی کرتا تھا، اس لئے اور زیادہ کفر میں پختہ کار ہو گیا۔

اثبات قیامت

(۲۵۹) اَوْ كَالَّذِىْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِىَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْىٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ○

کیا تو نے اس کو نہیں دیکھا، جو ایک قصبہ پر گزرا، اور وہ اپنی چھتوں پر گرا پڑا تھا، کہنے لگا کہ اس کو اللہ اس کے مرے پیچھے کس طرح زندہ کریگا، تو اس کو اللہ نے سو برس مردہ رکھا، پھر اس کو جلایا، فرمایا تو کتنی دیر رہا؟ اس نے جواب دیا کہ ایک دن یا ایک دن سے کچھ کم رہا ہونگا، فرمایا بلکہ تو سو برس رہا، پس اپنے کھانے اور پینے کو دیکھ کہ سڑا تک نہیں، اور اپنے گدھے کو دیکھ، اور تا کہ ہم تجھکو لوگوں کے لئے نمونہ بنائیں، اور ہڈیوں کی جانب دیکھ کہ ہم کیونکر ان کا ڈھانچ بناتے ہیں، پھر انکو گوشت پہنائے دیتے ہیں پس جب اسکو کھل گیا تو بولا کہ میں خوب جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہی۔

بخت نصر والی بابل نے ۶۱۳ قبل مسیح، بیت المقدس پر حملہ کیا، اور ۵۹۹ میں اسکو

بالکل ویران کر دیا، اکثر یہودی تلوار کے گھاٹ اتار دیے گئے، اور جو بچے ان کو جلاوطن کیا گیا، ۵۳۶ میں اہل بابل بھی فنا ہو گئے، اس پر فورس شاہ ایران نے یہودیوں کو واپس آنے اور یروشلم آباد کرنے کی اجازت دی، آخر کامل ایک صدی کے بعد بیت المقدس پھر آباد ہوا۔ اس تباہی کے زمانہ میں حضرت حزقیل کا اس بستی پر گزر ہوا، وہ اس المناک منظر کو دیکھکر براہ حیرت واستعجاب کہنے لگے کہ نہیں معلوم اللہ تعالیٰ اس بستی کے مردوں کو کس طرح زندہ کریگا؟ اس سوال کے جواب میں خود ان پر موت طاری کی گئی، برابر ایک سو سال تک اسی حالت میں پڑے رہے، دوبارہ زندہ ہونے پر ان سے دریافت کیا گیا کہ کتنی دیر تک اس حالت میں رہے؟ ان کے لئے سو سال کی مدت برابر تھی، انہیں خیال ہوا کہ ایک دن یا اس کا کچھ حصہ، جس وقت اصحاب کہف سالہا سال کے بعد بیدار ہوئے، اور ان سے پوچھا گیا کہ اس حالت میں کب تک رہے تو انہوں نے بھی یہی جواب دیا تھا: قال قائل منہم کم لبثتم ط قالوا لبثنا یوما او بعض یوم (۱۸: ۱۸) قیامت کے روز جب کفار سے پوچھا جائیگا کہ دنیا میں ان کے رہنے کی مدت کتنی تھی تو وہ بھی یہی جواب دیں گے!

قال کم لبثتم فی الارض عدد سنین ○ قالو لبثنا یوما او بعض یوم (۲۳: ۱۱۲ و ۱۱۵)

پس ان آیات کے ہوتے ہوئے جو لوگ حضرت حزقیل کے واقعہ کو محض خواب اور رویا پر محمول کرتے ہیں، وہ یقیناً غلطی پر ہیں، اور صحیح وہی ہے جس کو ہم نے اختیار کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا کہ تم برابر ایک سو سال تک اس حالت میں رہے، اب ہمارے کرشمہائے قدرت ملاحظہ کرو، تمہارے کھانے پینے کی چیزوں میں بو تک نہیں پیدا ہوئی، گدھے کو دیکھو گل سڑ گیا ہے، مگر اسے دوبارہ زندہ کئے دیتے ہیں، اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت حزقیل کو دو باتیں دکھانا چاہتا تھا:۔

(الف) بعض چیزیں ایسی ہیں کہ لاکھوں کروڑوں برس گزرنے پر بھی وہ اپنی حالت پر قائم رہتی ہیں، ان کے خواص واثرات میں کوئی فرق نہیں آتا، کیا اللہ تعالیٰ اس بات پر

قادر نہیں کہ اگرچہ انسان پر ہزارہا برس تک فنا طاری رہے، مگر پھر بھی اس کے بعض اجزا کو محفوظ رکھے، اور وقت پر ان میں زندگی پیدا کر دے۔

(ب) اگر ایک چیز گل سڑ کر فنا ہو جائے، اور اس کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے، اللہ تعالیٰ اس کو دوبارہ زندہ کر سکتا ہے۔

اس آیت میں ان دونوں باتوں کو واضح کر دیا گیا، لیکن اس قسم کے واقعات عام لوگوں کے سامنے روزمرہ نہیں ہوا کرینگے، یہی ایک نظیر باقی انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے کافی ہوگی، جس وقت انہوں نے یہ کیفیت ملاحظہ کی تو بے اختیار ہو کر کہنے لگے کہ میں دل سے یقین کرتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ احیائے یوم البعث میں چند چیزوں کو یاد رکھنا ضروری ہے:-

(۱) خود زندہ کرنا، حضرت حزقیل اور ان کے گدھے کو اللہ تعالےٰ نے زندہ کر کے دکھا دیا۔

(۲) زمانہائے دراز کے بعد زندگی بخشنا، اس کے لئے ان کو سو برس تک عالم ممات میں رکھا۔

(۳) خاص کیفیت سے زندہ کرنا، گدھے کو زندہ کر دیا۔

(۴) اتنی مدت تک روح کا باقی رکھنا، طعام و شراب کا باقی رہنا، اور ان کے بدن کا موجود ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان کی روح باقی ہے، کیونکہ بدن، طعام، شراب، مختلف اجزا و عناصر سے مرکب ہیں، ان میں آسانی سے تغیر اور فساد آ سکتا ہے، حالانکہ روح میں یہ بات نہیں۔

(۵) دوبارہ زندہ ہونے کے بعد برزخ کی مدت معلوم نہ ہونا، چنانچہ حزقیل نے جواب دیا کہ میں ایک دن یا اس کا کچھ حصہ رہا ہوں، لیکن حقیقت میں وہ ایکسو سال تک رہے تھے، اور یہی جواب قیامت کے روز کفار دینگے۔ لبثنا یوما او بعض یوم (۲۳ : ۱۱۵)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قوموں اور ملتوں کو زندہ کرتا ہے، اگرچہ ان پر گمنامی اور غلامی کی صدیاں گذر جائیں مگر پھر بھی ان کو فضیلت و برتری مل سکتی ہے، بنی اسرائیل ایک صدی تک برباد رہے، آخر اللہ نے ان کی سن لی، اور انہیں دوبارہ حکومت توارث کی، لا تقنطوا من رحمۃ اللہ، (۳۹ : ۵۴)

ایک اور مثال

(۲۶۰) وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ۭ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۭ قَالَ بَلٰي وَلٰكِنْ لِّيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِىْ ۭ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰي كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ۭ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

اور جب ابراہیم نے کہا کہ اے میرے رب! مجھکو دکھا تو کیونکر مردوں کو زندہ کریگا؟ فرمایا کہ کیا تم کو یقین نہیں؟ عرض کیا کیوں نہیں، لیکن یہ کہ میرے دل کو تسکین ہو جائے، فرمایا اچھا چار پرندے لو، پس ان کو اپنے ساتھ ہلالو، پھر ہر پہاڑی پر ان کا ایک ٹکڑا رکھ دو، پھر ان کو آواز دو، وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے چلے آئینگے، اور جانو کہ اللہ زبردست حکمت والا ہے۔

چونکہ لوگوں کو احیاے اموات میں سب سے زیادہ شبہات ہوتے ہیں، اس لئے ایک اور مثال بیان کی جاتی ہے، ابراہیم علیہ السلام نے قیامت کے روز مردوں کے زندہ کرنے کی کیفیت کا سوال کیا، ممکن تھا بعض لوگوں کو ان کے اس سوال سے یہ شبہ ہوتا کہ باوجود پیغمبر ہونے کے ان کو حشر اجساد پر یقین نہ تھا، اس لئے فوراً بعد ان کا جواب نقل کرکے بتا دیا کہ ان کو یقین تو حاصل تھا، مگر وہ صرف اتنا چاہتے تھے کہ زندہ کرنے کی مختلف صورتیں ہیں، ان میں سے ایک کیفیت کا مشاہدہ کرلیں۔

اصل بات یہ ہے کہ ہر انسان کی طبیعت میں یہ جذبہ موجود ہے کہ وہ ہر امر کے متعلق کیوں اور کس طرح کا سوال کرنے پر مجبور ہوتا ہے، اس سوال کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں:-

(الف) استفسار کے طور پر کہ اطمینان قلب مقصود ہے، چنانچہ ابراہیم کا سوال اسی

قسم کا تھا، وہ احیائے موتی کی کیفیت دریافت کرنا چاہتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ امام بخاری نے اس آیت سے ایمان کی کمی اور زیادتی پر استدلال کیا ہے۔

(ب) جس امر کی نسبت سوال کیا جاتا ہے، اس کے متعلق کسی کو شکوک وشبہات ہیں، کفار کہتے تھے: من یحی العظام وھی رمیم (۳۶: ۷۸) ہڈیوں کو بوسیدہ ہونے پر کون زندہ کریگا۔

پہلی صورت ایمان میں داخل ہے، اور دوسری کا تعلق ضلالت وگمراہی سے ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ چار پرندے لیکر ان کو پالو، یہاں تک کہ خوب مانوس ہو جائیں پھر سب کو ذبح کرکے ان کے اجزائے مختلفہ کو ملا لو، اور ہر پہاڑ پر ایک ایک حصہ رکھدو، اب انہیں آواز دو، تو وہ دوڑتے ہوئے تمہارے پاس آجائینگے، لوہا جب مقناطیس کے سامنے آئیگا تو ضرور ہے کہ اس کی طرف کھچے، حضرت ابراہیم کی آواز میں اس درجہ قوت مقناطیسی پیدا کردی گئی تھی کہ جس جانور کا نام لیتے، فوراً دوڑتا ہوا ان کے پاس چلا آتا، تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ غالب ہے، اور یہ کام کرسکتا ہے، تمام مخلوقات کو اپنے خالق کے ساتھ ایسا فطری ربط وتعلق ہے کہ اس کے ٹوٹنے کی کوئی دوسری صورت نہیں، اگرچہ ان پر ہزاروں سال فنا طاری رہے، مگر جس وقت خدائے قدوس ایک لفظ کن ارشاد فرمائیگا، سب کے سب بھاگتے ہوئے اس کے پاس آجائینگے۔

اب تک تین واقعات بیان کئے گئے ہیں، ان سے معلوم ہو گیا کہ حق وصدق اور توحید کی نشر واشاعت میں ظلمتیں پیدا ہونگی، ان کے رفع وانسداد کے لئے اللہ تعالیٰ ایسے آدمی پیدا کردیگا، جو ان ظلمتوں اور تاریکیوں کے پردوں کو چاک چاک کرکے دنیا کے سامنے اسلام کی اصلی صورت پیش کردینگے، خلیفہ کا فرض ہوگا کہ ایسے ارباب صلاح وتقوی کو ڈھونڈھ نکالے، ان کو دعوت وارشاد کے کام پر لگائے، جو لوگ ان سے تعلیم حاصل کرنے کے لئے آئیں، ان کے لئے آسانیاں پیدا کرے، اور جب اس قسم کے واقعات پیش

آئیں تو ان کا تمام اطراف مملکت میں اعلان کرے۔ ان آیات نے خلیفہ کے دو فرض معین کر دیئے :۔

(الف) توحید کی نشر و اشاعت، اور اس کی حفظ و صیانت۔

(ب) امت مسلمہ کے بہترین دل و دماغ سے کام لینا۔

انفاق فی سبیل اللہ کی شرطیں

خلیفہ اور اس کے اعوان و انصار کے فرائض بیان کئے گئے، یہی لوگ حقیقی معنی میں خلافت کے دست و بازو ہونگے، جن کے صدق و اخلاص، اور حسن نیت پر ملک و ملت کی بہتری موقوف ہوگی، اگر ارباب دولت و ثروت بھی اس آسمانی بادشاہت میں شریک ہونے کے آرزومند ہوں جس کا داخلہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے لئے ممنوع قرار دیا تھا، تو وہ اپنا مال خلافت کی نذر کریں، مگر یہ روپیہ چند شرطوں کے ماتحت قبول کیا جا سکتا ہے، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے :۔

(۲۶۱) مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝	جو لوگ اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کی مثال اس دانہ کی سی ہے جس سے سات بالیں اگیں کہ ہر بال میں سو دانے ہوں، اور جس کے لئے چاہتا ہے اللہ بڑھاتا ہے، اور اللہ گنجائش والا واقف کار ہے۔

خلیفہ اسلام کو سلطنت کے بقا و استحکام، قوم کی تعلیم و تربیت، لشکروں کی تیاری، سامان حرب کی خریداری، اور جہاد فی سبیل اللہ کے لئے روپیہ کی ضرورت ہوگی، جو شخص ایسی ضرورت کے موقعہ پر مال صرف کریگا، اس کے خرچ کی مثال اس بیج کی سی ہے جو ایک دانہ سے سات سو بن جاتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اس قسم کے صدقات کی خیر و برکت بیان کرتے ہیں: اور جو اچھی زمین میں بویا گیا، یہ وہ ہے جو کلام کو سنتا اور سمجھتا ہے اور پھل

بھی لاتا ہے، کوئی سو گنا پھلتا ہے، کوئی ساٹھ گنا، کوئی تیس گنا" (متی، ۱۳: ۲۳) مرقس میں ہے: "اور کچھ اچھی زمین پر گرا، اور وہ اگا، اور بڑھ کر پھلا، اور کوئی تیس گنا، کوئی ساٹھ گنا، کوئی سو گنا پھل لایا" (مرقس، ۴: ۸) مگر قرآن حکیم بتاتا ہے کہ ایک مسلم قانت جب جہاد فی سبیل اللہ کے لئے دیتا ہے تو وہ سات سو گنا بڑھتا ہے، اور اس سے زیادہ کی حد نہیں، صحابہ کرام نے اس وعدہ کو دیکھ لیا کہ سینکڑوں خرچ کر کے کروڑوں کے مالک بن گئے، جس مال کے یہ ثمرات ونتائج ہوں، اس کی شرطیں ملاحظہ ہوں:

من واذی نہ ہو

(۲۶۲) اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَاۤ اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کئے پیچھے احسان نہیں جتاتے اور نہ ستاتے ہیں، ان کے لئے ان کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے، اور نہ ان پر کچھ خوف ہے، اور نہ وہ رنجیدہ ہونگے،

(۲۶۳) قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَاۤ اَذًى وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ○

معقول بات اور درگزر کرنا ایسی خیرات سے بہتر ہے جس کے بعد میں ستانا ہو، اور اللہ غنی ہے حلیم ہے۔

عام دستور ہے کہ کسی محتاج کو روپیہ دیکر لوگ اس پر احسان جتاتے ہیں، اور تکلیف دیتے ہیں، جنھیں قومی کاموں میں خرچ کرنے کی عادت ہے، وہ ہر موقعہ پر اپنے چندوں کا ذکر فخر و مباہات سے کرتے ہیں، اور جن لوگوں نے کم چندہ دیا ہے، ان کا ذکر حقارت سے کرتے ہیں، یہ دونوں باتیں بری ہیں، کہ صدقات بھی دو، اور احسان بھی رکھو، بلکہ خرچ کرنے کی اولین شرط یہ ہے کہ نہ تو ان لوگوں پر احسان جتاؤ، اور نہ انہیں یاد دلا کر اذیت دو، اللہ کے نزدیک صرف وہ مال قدر و قیمت رکھتا ہے، جس کے بعد من اور اذی نہ ہو، ورنہ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ تم اچھی بات کہدو، اور کہو کہ اس وقت معاف کیجئے، اللہ تعالے

اپنی ذات کے متعلق تو تم سے مواخذہ نہیں کرتا، مگر حلیم کے غضب سے بھی ہر وقت ڈرنا ضروری ہے۔

(۲۶۴) یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى لا كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ط فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ط لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَیْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ط وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ ○

مسلمانو! احسان جتا کر اور ایذا دیکر اپنی خیرات کو اکارت نہ کرو، اس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے، اور اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں لاتا، تو اس کی خیرات کی مثال اس چٹان کی سی ہے جس پر مٹی پڑی ہوئی ہو، پھر اس پر زور کا مینہ برسے، تو اس کو سپاٹ بنا چھوڑے، اس میں سے جو انہوں نے کمایا ان کے کچھ ہاتھ نہ لگیگا، اور اللہ کافر قوم کی ہدایت نہیں کرتا۔

مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے صدقات و خیرات کو منّ اور اذیٰ سے برباد نہ کریں، اور یہ تو ایک مسلم کی شان ہی نہیں کہ لوگوں کو دکھانے کے لیے کچھ خرچ کرے، بلکہ یہ اس شخص کا کام ہے جس کو اسلام سے کوئی تعلق نہیں، جس کو نہ اللہ پر یقین ہے، اور نہ یوم آخرت پر۔

جو لوگ ریاؤسمعۃ اپنی دولت صرف کرتے ہیں، ان کو اس مثال سے عبرت اندوز ہونا چاہیے ایک پتھر پر کچھ مٹی پڑی ہوئی ہے، ایک ہی زور کی بارش نے اس کو بالکل صاف کر دیا، اور اس پر دانہ اُگنے کی کوئی صورت نہیں، پس جس طرح اللہ تعالیٰ، انفاق فی سبیل اللہ کے لیے سات سو، اور اس سے بھی زائد اجر و ثواب دیتا ہے، دوسری جانب وہ مال جو دکھانے کی غرض سے دیا گیا ہو اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اس کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہنے دیتا، تمام محنت اکارت جاتی ہے،

رضائے الٰہی پیش نظر ہے

(۲۶۵) وَمَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ

اور جو لوگ اپنے مال، اللہ کی رضاجوئی، اور اپنی نیت

اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ج فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ م وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ○

ثابت رکھکر خرچ کرتے ہیں، ان کی مثال اس باغ کی ہی، جو اونچی جگہہ پر واقع ہو کہ اس پر زور کا مینہ پڑا ہو، اور وہ اپنے پھل دوچند لایا ہو، اور اگر اس پر زور کا مینہ نہ پڑا تو پھوار ہی کافی ہے، اور جو کچھہ تم کررہے ہو، اللہ دیکھہ رہا ہے۔

دوسرے وہ لوگ ہیں جو اپنے مال کو محض اس لئے خرچ کرتے ہیں کہ اللہ کی رضامندی حاصل ہو، اور نفس میں پختگی پیدا ہو، یہ قاعدہ ہی کہ جس کام میں نفس کو تکلیف برداشت کرنی پڑے، اس کے بار بار کرنے سے عادت ہوجاتی ہی، اور پھر طبیعت میں وہی ملکہ راسخ ہوجاتا ہے، نفس کی مزاحمت جاتی رہتی ہے، اور دوسرے اعمال صالحہ میں بھی دقت نہیں پیدا ہوتی، اس پختگی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ چونکہ ہم اپنی عزیز ترین متاع حیات، دولت کو اللہ کی راہ میں صرف کرتے ہیں تو جس چیز کے لئے اس کو خرچ کرینگے، خود اس سے بھی ایک قسم کا ربط و تعلق قایم ہوجائیگا، اور خدا کی راہ میں زیادہ ثابت قدمی اور وفاداری نوازش ہوگی، ان صفات کو ملحوظ رکھکر خرچ کرنے والوں کی مثال اس باغ کی ہے، جو بلند مقام پر واقع ہی، جس کی ہوا لطیف اور بارآور ہی، بارش بھی خوب ہوتی ہے، اس لئے وہ باغ دگنا اور چوگنا پھل لاتا ہی، اور اگر بارش نہ بھی ہو تو ہلکی پھوار بھی کافی ہوجاتی ہے، کیونکہ زمین اور اس کا موقعہ بہت عمدہ ہی۔

(۲۶۶) اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لا لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ لا وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ صلے ج فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ط

کیا تم میں کوئی اس بات کو پسند کرتا ہی کہ اس کا کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو، اس کے نیچے نہریں بہتی ہوں، اس کو وہاں ہر قسم کے پھل میسر ہوں، اور اس کو بڑھاپا آپہنچے، اور اس کے بال بچے ناتواں ہوں، پھر اس باغ پر ایک بگولا آپڑے

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ○	جس میں آگ ہو اور وہ جل بھن جائے، اسی طرح اللہ تم سے احکام کھول کر بیان کرتا ہے کہ تم غور کرو۔

یہ تیسری مثال ہے کہ من اذی، اور ریا سے صدقات و خیرات پر کس طرح تباہی و بربادی نازل ہوتی ہے، ایک شخص کا باغ ہے، جس میں ہر قسم کے میوہ جات ہیں، پیری و نقاہت کا زمانہ ہے، سب سے زیادہ احتیاج کا یہی وقت ہوتا ہے، پھر اہل و عیال میں اتنی طاقت نہیں کہ خبرگیری کر سکیں، اسی باغ پر تمام خاندان کی زندگی کا دار و مدار ہے، ایسی حالت میں ایک ہی آگ بگولہ سے تمام باغ جل کر خاکستر ہو جاتا ہے۔

یہی حال اُن لوگوں کا ہے جو من و اذی، شہرت و ناموری، اور دنیا کی قدر و منزلت کے لئے روپیہ دیتے ہیں کہ ہر مجلس ان کی فیاضی و سخاوت کا تذکرہ ہو، لیکن مرنے کے بعد یہ سخاوت کچھ کام نہ آئیگی، اور یاس و حرماں کے سوا کچھ نصیب نہ ہوگا۔

بہترین مال خرچ کرو

(۲۶۷) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ○	مسلمانو! جو پاک چیزیں تم نے کمائی ہوں، اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے واسطے زمین سے اگائی ہیں خرچ کرو، اور اس میں سے ردّی چیز کا ارادہ نہ کرنا، خرچ کرنے لگو، حالانکہ تم خود نہ لو مگر یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ، اور جان لو کہ اللہ بے نیاز تعریف کے لائق ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ مال دو جو جائز طریق سے کمایا گیا ہو، اور اس میں سے بھی بہترین ہو، یہ مال یقیناً حیات قومی کے لئے زندگی بخش ثابت ہوگا، اللہ کو ناکارہ اور ردّی اشیاء کی ضرورت نہیں، ان صدقات کے بغیر بھی اس کی ذات حمد کے لائق اور قابل ستائش ہے، اس لئے وہی چیز پیش کرو جو اس کی ذات اور صفات کے لائق ہو۔

(حاشیہ صفحہ ۴۱۸ پر ملاحظہ ہو)

(۲۶۸) اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَ یَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰہُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَۃً مِّنْہُ وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۝	شیطان تم کو تنگدستی سے ڈراتا ہی، اور تم کو بیحیائی کا حکم کرتا ہی، اور اللہ تم سے اپنی بخشش اور برکت کا وعدہ کرتا ہی، اور اللہ گنجائش والا واقف کار ہی۔

جب ایک شخص اللہ کی راہ میں خرچ کرنے لگتا ہی تو اُسے خیال پیدا ہوتا ہی کہ میں غریب ومفلس نہ بن جاؤں، یہ تمام وساوس وخطرات شیطانی ہیں، ایک مسلم کا فرض ہی کہ ان کی پروانہ کرے، اور خوب دل کھول کر خلافت کی مدد کرے اس کا ایک تو یہ فائدہ ہوگا کہ اس کی غلط کاریوں کا کفارہ ہو جائیگا، دوسرے اللہ تعالیٰ اس کو مالامال کردیگا، اللہ کا علم بہت وسیع ہی، ہر ایک کو اُس کی نیت کے مطابق اجر دیتا ہی۔

(۲۶۹) یُّؤْتِی الْحِکْمَۃَ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا ؕ وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝	جس کو چاہتا ہی سمجھ عطا فرماتا ہی، اور جس کو سمجھ عطا کی گئی، اس کو بیشک بہت بڑی خوبی عطا کی گئی، مگر صاحبان عقل ہی اس سے نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

انفاق فی سبیل اللہ کے لئے گزشتہ آیات میں مختلف شرطیں بیان کی گئیں، جن کی تلخیص حسب ذیل ہی:۔

(۱) دیکر احسان نہ جتاؤ، (۲) دوسروں کو اذیت وتکلیف نہ دو، (۳) دکھاوے کی غرض سے نہ ہو، (۴) رضائے الٰہی پیش نظر رہے، (۵) پختگی اور استواری کا خیال ہو،

حاشیہ صفحہ ۴۱۷

سلہ مگر مسلمان بالکل اس کے برعکس کرتے ہیں، بدترین مال خدا کی راہ میں صرف کرتے ہیں، جب کھانا خراب ہونے لگے تو فقیر کو دیا جاتا ہی، جب کاروبار سے تھک گئے اور کام کرنے کی طاقت نہ رہی تو دو چار اسلامی ہمدردی کی باتیں کرلیں، دماغ معطل ہوگیا، تفریح کا وقت نہ رہا تو درس قرآن میں آگئے، اپنے بچوں میں جو سب سے نکما ہو، آنکھ کان اور فہم وفراست سے بے بہرہ ہو تو اُسے مذہبی تعلیم کے لئے وقف کردیا، جن کتابوں کے فروخت ہونے کی زیادہ توقع ہو، اس کے لئے کاغذ، کتابت اور طباعت کا بہترین انتظام کیا، اور قرآن کو معمولی کاغذ پر شائع کیا صحت کا بھی خیال نہ کیا، ان امراض کے ہوتے ہوئے مسلمان زندہ ہوں تو کیسے۔

(۶) بہترین مال خرچ کرو، (۷) جائز ذرائع سے کمایا ہوا (۸) فقر و تنگدستی کا خیال دل میں نہ آئے، (۹) بخل و امساک سے پرہیز کرو۔

ان تمام شرطوں کا تعلق مال و دولت سے ہے، اس کے بعد فرمایا کہ جس شخص میں اللہ تعالیٰ استعداد اور قابلیت دیکھتا ہے، اس کو علم و حکمت اور تفقہ فی الدین نوازش کرتا ہے، قرآن حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ مال و دولت کے لئے خیر کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے وانہ لحب الخیر لشدید، وما تنفقوا من خیر، میں خیر سے مراد مال ہی ہے، اور خیر کثیر کا اطلاق علم و حکمت پر آتا ہے، گزشتہ آیات کے ربط و تعلق سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شرطیں ارباب دولت و ثروت کے لئے بیان کی گئی ہیں، وہی قیود اہل علم و فضل کے لئے ہیں، دونوں میں کوئی فرق و امتیاز نہیں۔

(۲۷۰) وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (۲۷۱) اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ○

اور جو کچھ کوئی خیرات تم خرچ کرتے ہو یا کوئی منت مانتے ہو، تو بیشک اللہ اس سے واقف ہے، اور ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا، اگر تم ظاہر میں خیرات دو تو بھی اچھا ہے، اور اگر اس کو چھپاؤ، اور حاجتمندوں کو دیدیا کرو تو وہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے، اور تمہارے کچھ گناہ دور کر دیگا، اور جو اعمال تم کرتے ہو اللہ ان سے باخبر ہے۔

مال و دولت کے صرف کرنے، اور علم و حکمت کی نشر و اشاعت کے لئے تمام شرطوں کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، ان کو پیش نظر رکھکر اب تمہیں اختیار ہے، خواہ گاہ و بیگاہ اللہ کے نام پر دو، یا ایک رقم نذر کے طور پر معین کر لو، نذر کے بعد اگر تم نے اس کو پورا نہ کیا، تو اس کا بہت برا اثر اخلاق پر پڑیگا، اور باقی فرائض ملت کے ادا کرنے میں بھی کاہلی سے کام لوگے، اس قدر تعلیم کے بعد بھی جو لوگ برمحل صرف نہ کریں، اور بہانے بناتے پھریں

اللہ انہیں خوب جانتا ہے، ان کی کبھی مدد نہ ہوگی۔

علی الاعلان دینا، اور خاموشی کے ساتھ چھپا کر دینا بھی جائز ہے، اگر رفاہ عام کے لئے دینا ہے، سیاسی و مذہبی ضرورتوں میں صرف کرنا ہے، تو اعلان ہی مفید ہوگا کہ دوسروں کی ترغیب و تشویق کا باعث ہو، اور اگر فقراء و مساکین کو دینا ہو تو چھپا کر دینا مفید ہوگا، اصل چیز حسن نیت اور اخلاص ہے، جب یہ ہے تو چھوٹے سے چھوٹا کام بھی مفید و نافع ہوگا۔

(۲۷۲) لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ○

تمہارے ذمہ ان لوگوں کا راہ پر لانا نہیں لیکن اللہ جسے چاہتا ہے راہ پر لاتا ہے، اور جو کچھ تم مال خرچ کروگے سو اپنے لئے، اور اللہ کی رضاجوئی کے سوا خرچ نہ کرو، اور جس قدر مال تم خرچ کروگے، وہ تم تک پورا پہنچا دیا جائیگا، اور تم پر ظلم نہ کیا جائیگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی فرض تھا کہ لوگوں کے سامنے قانون صحیح پیش کردیں، شکوک و شبہات کو دور کردیں، اور دولت و علم کے مصارف بتادیں کہ جہاد فی سبیل اللہ ہی ان کے صرف کرنے کے بہترین مواقع ہیں، لیکن یہ آپ کا فرض نہیں کہ لوگوں میں جذبات صادقہ بھی پیدا کردیں، انما انت منذر لست علیھم بمصیطر، پھر دوسری جگہ فرمایا: انک لا تھدی من احببت ولکن اللہ یھدی من یشاء مسلمانوں کو خود یہ ضرورت محسوس کرنی چاہئے کہ ان کی حیات ملی کا دارومدار انفاق و جہاد فی سبیل اللہ پر ہے، باقی ہدایت دراہ نمائی تو اللہ کے اختیار میں ہے۔

اگر کسی کو یہ خیال ہو کہ اسلام کی تعلیم کا تمام تر مقصد یہی ہوا کہ اپنی ساری دولت اللہ کی راہ میں لٹا دو تو ہ ذرا غور کرکے دیکھیں کہ وہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں، اس کا نفع و سود انہیں کی جانب عود کرتا ہے یا نہیں، عزیز و قریب کی ہدایت کا باعث بنتے ہیں، اسلام کا بول بالا ہوتا ہے، خلافت اسلامی محکم و استوار ہوتی ہے، مال غنیمت سے مالا مال ہوتے ہیں،

اور جو قومیں ظلم و جور کا تختۂ مشق بنی ہوئی تھیں، ان کی آزادی کا باعث بنتے ہیں، اس سے زیادہ اور کیا چاہتے ہیں۔

انفاق فی سبیل اللہ کے مصارف

(۲۷۳) لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمٰهُمْ لَا یَسْــَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ○	ان مفلسوں کا حق ہے جو اللہ کی راہ میں گھرے ہوئے ہیں، ملک میں چل پھر نہیں سکتے، ان کی بے سوالی کے سبب انجان ان کو مالدار سمجھتا ہے، ان کی صورت سے تم ان کو پہچان لو گے، وہ لوگوں سے لگ لپٹ کر نہیں مانگتے، اور جو کچھ تم کام کی چیز خرچ کرو گے، اللہ اس سے واقف ہے۔

اس آیت میں ان لوگوں کو بیان کیا ہے، جن پر ہم اپنی دولت صرف کر سکتے ہیں، اور وہ حسب ذیل ہیں:

(الف) مجاہدین، (ب) جو جہاد میں مجروح ہوں، (ج) علمائے ملت جو تعلیم حقہ کی نشر و اشاعت میں مصروف ہوں، کتاب و سنت کا درس دیتے ہوں، اور لوگوں کو جہاد کے لئے تیار کرتے ہوں، (د) خلافت اسلامی کے اعضا ارکان، جو ملک کے نظم و نسق میں لگے ہوئے ہوں۔

یہ لوگ نالائق و بیکار نہیں، بلکہ شرعی ضرورتوں نے ان کو روزی کمانے، تجارت کرنے، اور دوسرے مشاغل دنیوی میں شریک ہونے سے روک دیا ہے، وہ کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کرتے، اور نہ لگ لپٹ کر مانگتے ہیں، یہ شرط اس لئے لگا دی کہ عام طور پر فقراء و مساکین اصرار مالی کیا کرتے ہیں۔

حضرت ابوبکر اپنی خلافت کے ابتدائی ایام میں تجارت کرتے تھے، ایک روز کپڑوں کی گٹھری اٹھا کر بازار جا رہے تھے کہ حضرت عمرؓ مل گئے، انھوں نے کہا، اے امیر المومنین!

کہاں کا قصد ہے ؟ اُنہوں نے جواب دیا کہ اپنے اہل و عیال کے لئے کمانے جاتا ہوں ، حضرت عمر نے جواب دیا کہ یہ نہیں ہوسکتا ، اپنے ضروری مصارف کے لئے بیت المال سے لے لیا کیجئے ۔

(۲۷۴) اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○	جو لوگ اپنے مال ، رات اور دن ، چھپے اور کھلے صرف کرتے ہیں ، ان کے رب کے ہاں ان کے لئے ان کا ثواب ہے ، اور نہ ان پر کچھ خوف ہی اور نہ وہ رنجیدہ ہونگے ۔

شرائط کا علم ہوگیا ، اب کسی مزید پابندی کی ضرورت نہیں ، وقت معین کرنا بھی بے سود ہی ، بلکہ ان لوگوں کو جب ضرورت ہو ، دن ہو یا رات ، سرًا ہو یا جھرًا فورًا مدد کرو ۔

سود کی حرمت

خلافت اسلامی ، اور اس کے اعضا و ارکان کی غایۃ الغایات ، توحید کی نشر و اشاعت ، اور اعلیٰ ترین علم و حکمت کا درس و تعلم ہے ، ان مقاصد مہمہ کا حصول ممکن نہیں ، جب تک کثرت سے روپیہ نہ ملے ، اس لئے گزشتہ آیات میں انفاق فی سبیل اللہ پر پورا زور دیا گیا ہے اور فرمایا کہ خرچ کروگے تو بڑے اجر ملینگے ، اور کامیابی نصیب ہوگی ، انفاق کے جذبہ صادقہ کی تکمیل و تربیت کے لئے ضروری ہے کہ جس قدر اخلاق فاسقہ اس کے مخالف ہوں ، ان کو ترک کرادیا جائے ، لوگوں کے دلوں میں مال کی محبت جاگیر نہ ہو ، کیونکہ اگر مال کی محبت جڑ پکڑ گئی تو اللہ اور اسکے کلمہ حق کی محبت کم ہو جائیگی ، جہاد فی سبیل اللہ کا شوق جاتا رہیگا ، اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ سود خواری کو ہمیشہ کے لئے حرام کردیا جائے اور ایک لمحے کے لئے بھی اسے جائز نہ رکھا جائے ، اس لئے اب یہاں سے سود کی حرمت پر بحث ہوتی ہے :۔

(۲۷۵) اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ○	جو لوگ سود کھاتے ہیں، وہ کھڑے نہ ہو سکیں گے مگر اس طرح وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جس کے حواس شیطان نے لپٹ کر کھو دیے ہوں، یہ اس لئے ہے کہ انہوں نے کہا تھا کہ بیع بھی تو سود ہی جیسی ہے، حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا، اور سود کو حرام کیا، تو جس شخص کے پاس اس کے رب کی طرف سے نصیحت پہونچ چکی، پھر وہ باز آگیا، تو اسی کا ہے جو لے چکا، اور اسکا معاملہ اللہ کے حوالے ہے، اور جس نے پھر سود لیا تو وہ لوگ دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہینگے۔

امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں :-

الامر الذی کان مشہورا متعارفا فی الجاھلیة انہم کانوا یدفعون المال علی ان یاخذ واکل شہر اقدرا معینا ویکون راس المال باقیا ثم اذا حل الدین طالبوا المدیون براس المال وان تعذر علیه الاداء ازدادوا فی الحق والاجل	زمانہ جاہلیت میں ربا ایک مشہور و متعارف امر تھا، ان کا قاعدہ یہ تھا کہ وہ اس شرط پر قرض دیتے کہ ہر ماہ ایک معین رقم وصول کر لیا کریںگے، اور اصل رقم بدستور باقی رہیگی پھر جب قرض کے ادا کرنے کا وقت آجاتا، تو قرضدار سے راس المال طلب کرتے، اگر وہ اس اصل رقم کے ادا کرنے سے ہی اپنے آپ کو معذور پاتا تو رقم اور مدت، دونوں میں اضافہ کر دیتے۔

ہندوستان میں بھی اسی طرح کیا جاتا ہے، عرب جس کو ربا کہتے ہیں، یہاں اس کو سود اور بیاج کہتے ہیں، یہاں بھی ساہوکار اصل رقم پر کچھ معین کر لیتا ہے، اور اپنی سہولت کے اعتبار سے ماہوار یا سال کے ختم پر وصول کرتا ہے، یا تمام سود کو راس المال میں شامل کر لیتا ہے۔ یہی سود اور سود در سود ہے، عرب اور ہندوستان ہیں اس مسئلہ کے متعلق کوئی اختلاف

نہیں، اور دونوں جگہہ ایک ہی طرح کا سود نظر آتا ہے۔

جو شخص سود کھاتا ہے قرآن حکیم نے اس کے حالات و واردات کو اس کے ساتھ تشبیہ دی ہے جس کو شیطان چھو کر مخبوط الحواس کر دے، اس آیت میں سود خوار زندگی، اس کے عادات و خصائل اس کے اعمال و افعال، اور اس کے ثمرات و نتائج کی نہایت ہی جامع و مانع تشبیہ دی گئی ہے، وہ گویا اس مسئلہ کی پوری کتاب ہے، اہل عرب کا خیال تھا کہ شیطان اور جن کی ضرب سے انسان مجنون و لا یعقل ہو جاتا ہے، اور صرع (مرگی) کی بیماری دراصل ایک طرح کی آسیب ہوتی ہے، مس جنون کے معنی میں بولا جاتا ہے، اور ممسوس پاگل کو کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں سود خوار زندگی کو ایک آسیب زدہ پاگل، اور ایک مصروع کے حالات و خصائص سے تشبیہ دی ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ ان بدبختوں نے اپنی فطرت صالحہ، اپنے جذبات ملکوتیہ، اور اپنے عواطف انسانیت کو بالکل بدل دیا، اور کہنے لگ گئے کہ بیع و شرا مثل سود ہی کے ہے، ایک سود خوار عام تاجروں کی طرح اپنی ایک تجارت رکھتا ہے، وہ مبادلۂ اشیاء کی تجارت نہیں کرتا، تو کیا ہوا، ایک ہی جنس کو دیتا، اور ایک ہی جنس کو لیتا ہے، یہ بھی ایک کاروبار اور بیع و شرا ہی ہے، اس کے جواب میں فرمایا کہ یہ نظریہ ہی سرے سے غلط ہے، اسلئے کہ:

(الف) تجارت کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ انسان کو محنت و مشقت کی عادت پڑے، اسلام تجارت کا سب سے بڑا حامی، اور ان پیشوں کا مخالف ہے جن سے کاہلی اور سستی پیدا ہو، اور جو انسان کو اخلاق فاضلہ، اور کمالات انسانیت سے محروم کر دیں،

(ب) سود خوار جب روپیہ دیتا ہے تو صرف نفع کا مالک ہوتا ہے، مگر تجارت میں سود و زیاں، اور نفع و نقصان کے دونوں پہلو ہوتے ہیں۔

اس لئے بیع و شرا کو تو جائز قرار دیا گیا، اور سود کو حرام کر دیا، ترمذی نے عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے کہ لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکل الربوا و موکلہ

وشاھدیہ وکاتبہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے، ۔ ۔ ۔ ۔
سود دینے والے، گواہوں، اور اس کے کاتب پر لعنت کی ہے ۔

(۲۷۶) يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ط وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ
اللہ سود کو گھٹاتا ہے، اور خیرات کو بڑھاتا ہے، اور اللہ کسی کافر گنہگار کو پسند نہیں کرتا، بیشک جو لوگ ایمان لائے

(۲۷۷) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ج وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○
اور نیک اعمال کئے، اور نماز قائم کی، اور زکوٰۃ دی، ان کے لئے ان کے رب کے پاس ان کا ثواب ہے، اور نہ ان پر کچھ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہونگے ۔

آپ سود خواری کے چند نتائج کو سامنے لائیے:۔

(۱) سود خوار اپنے پیشہ کے لئے یہ خواہش رکھنے پر مجبور ہے کہ لوگ اپنی ضروریات انجام دینے پر قادر نہ ہوں، اور قرض کے لئے درخواست کریں، کسی کو قمار بازی کی عادت ہو، کوئی عیاشی میں مبتلا ہو، عیال داری کے مصارف برداشت کرنے کے قابل نہ ہو لوگ اس کی حالت پر افسوس کرینگے، مگر بدبخت سود خوار دل ہی دل میں خوش ہوگا کہ حسب دلخواہ سود لینے، اور اس کی جائداد پر قبضہ کرنے کا وقت آگیا۔

(۲) یہ آمدنی محنت کو چھوڑنے، اور آرام طلب ہونے کی ترغیب دیتی ہے ۔

(۳) ایک محدود جماعت ملک کے تمام سرمایہ پر قابض ہوجاتی ہے، اقتصادیات کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ اس سے ملک کو کس قدر نقصان پہنچتا ہے ۔

(۴) بعض اوقات غیر اقوام کے لوگ ایک ملک کے سرمایہ پر قبضہ کر لیتے ہیں، اور اس ملک کے رہنے والے محروم رہ جاتے ہیں۔

مال کی تقسیم کا مسئلہ، دولتمندوں اور فقیروں میں ہمیشہ سے منازعت کا باعث رہا ہے، یورپ اس لئے اور بھی مصیبت میں ہے کہ ارباب دولت و ثروت روز بروز روپیہ کو اپنے

قابو میں کر رہے ہیں، غربا و مساکین کی حالت بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے، اسی کشمکش سے یورپ میں مختلف فرقے پیدا کر دیے، مگر اس مسئلہ کو حل نہ کر سکے۔

ہنلسٹ، ان کا مقصد یہ ہے کہ جملہ املاک و امتیازات پر افراد قوم کا مساوی حق تصرف و یکساں حق مالکیت ہو۔

سوشیالسٹ، یہ چاہتے ہیں کہ اسباب معیشت پر سے شخصی ملکیت کو اٹھا دیا جائے، اور جمہور کی ملک میں کر دیا جائے۔

نیشنلسٹ، ان کی غرض یہ ہے کہ اراضی سکنی و زرعی کی ملکیت و پیداوار کو شخصی قبضہ سے نکال لیا جائے۔

بولشوسٹ، ان کا خیال یہ ہے کہ حکومت افراد کی تمام ضروریات کی متکفل ہو اور سب کو مساوی حقوق دیے جائیں، اور افراد کی تمام سعی و کوشش سے حکومت و قوم فائدہ اٹھائے،

مگر یاد رہے حکیم سولون کے عہد سے لیکر آج تک کوئی انسانی دماغ اس عقدہ کی گرہ کشائی نہ کر سکا۔ املاک پر سے مالکوں کا حق ملکیت کا اٹھا دینا عملاً اس قدر محال ہے کہ دنیا میں کبھی بھی اس کا رواج نہیں ہو سکتا۔

اسلام نے اس کی یوں گرہ کشائی کی کہ تمام دولت مند سالانہ اپنی دولت کا چالیسواں حصہ نکالیں، بیت المال میں جمع ہو، وہاں سے فقرا و مساکین کی مدد ہو، اور ساتھ یہ حکم بھی نافذ کر دیا کہ بغیر سود کے قرض دیا کریں۔

سود کے مال میں کبھی برکت نہیں ہوتی، شراب قلیل مقدار میں نقصان نہیں پہنچاتی مگر ترقی کرتی ہوئی آخر کار مہلک ثابت ہوتی ہے، ایسے ہی سود خواری کا، جسکا انجام کار ایسی شکل اختیار کر لیتا ہے جس سے سود لینے والے کو سود تو ملے مگر تمام موجودہ دولت، اور اس کی مدد سے آئندہ کی بڑی پیداوار معدودے چند کام کرنے والوں کے پاس ضرورت سے زیادہ جمع

ہوجائے، باقی تمام ملک جس کی متحدہ کوشش سے وہ رقم جمع ہوئی ہے، اور جس میں سود خوار کے سرمایہ، اور مزدوروں کی محنت سے بہت بڑی خدمت لی گئی ہے، سب اپنے جائز استحقاق سے محروم رہیں، آرام طلبی کے خوگر ہوں، چیزوں کو گراں قیمت پر خریدیں غرض ایک سود کے لالچ میں کئی طرح کا مالی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔

زکوٰۃ، خیرات، اور صدقات سے تمام ملک یکساں طور پر فائدہ اُٹھاتا ہے، فقرا اور مساکین اپنی حالت کو درست کر لیتے ہیں، دولت کا ایک حصہ تقسیم ہوجاتا ہے، اور اس طرح دولت مندوں اور غریبوں کی باہمی کشمکش کا مسئلہ صاف ہوجاتا ہے۔

اعلان جنگ

(۲۷۸) یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ○ (۲۷۹) فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ ○	مسلمانو! اللہ سے ڈرو، اور اگر تم مسلمان ہو تو جس قدر سود رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو، اور اگر ایسا نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول سے لڑنے کو تیار ہوجاؤ، اور اگر توبہ کرتے ہو تو اصل رقم تمہاری ہے، نہ تم کسی کا نقصان کروگے، اور نہ کوئی تمہارا نقصان کریگا۔

غور کرو قرآن حکیم نے انسانی معاصی و جرائم کے متعلق طرح طرح کی وعیدیں فرمائی ہیں، لیکن سود کے متعلق ایک ایسا لفظ کہہ دیا ہے جس سے سخت تر وعید اور کسی سخت سے سخت جرم و معصیت کی بھی نسبت نہیں آئی، اصل بات یہ ہے کہ انسان کا کوئی فعل جلب نفع اور رغبتِ خود غرضی سے خالی نہیں اس خود غرضی کا ایک بدترین ظہور صحیح و حصولِ مال کی بھوک ہے، اگر غور سے دیکھئے تو اعمالِ انسانیت میں اس مرض کا کوئی ظہور اس درجہ انسان کے ملکوتی خصائل کے لیے مہلک، اس کی بہیمیت و سبعیت کے لیے مقوی، ہیئتِ اجتماعیہ اور مجامع انسانیت کی صحت مدنی کے لیے سم قاتل، اور عالم مخلوقات کے انسان کو خوفناک درندہ بنا دینے کے لیے عمل السحر نہیں ہے جیسا کہ سود اور سود خواری کی زندگی کی مختلف شکلیں۔

یقیناً تمام انسانی گناہوں میں صرف یہی معصیت حرب من اللہ و رسولہ ہے، کیونکہ اور کسی معصیت میں انسان، خدا کے بندوں کے لئے اس درجہ بے رحم اور خونخوار نہیں ہوجاتا، جس درجہ سود کو اپنا وسیلہ معاش بنا لینے کے بعد از سرتا پا مجسمہ شقاوت و قساوت، اور غلظت و صلابت بن جاتا ہے، اور خدا کے بندوں کے آگے بے رحمی سے مغرور ہونا، فی الحقیقت خدا کے آگے مغرور ہو کر آمادۂ جنگ و پیکار ہوتا ہے۔

اگر ایک شخص چور ہے، ڈاکو ہے، قاتل ہے، تو قانون اس کو سزا دیگا، اور انسانی آبادی اس سے پناہ مانگیگی، لیکن ایک سود خوار کہتا ہے کہ انما البیع مثل الربوا، اس نے تجارت کی ایک دکان کھولدی ہے اور ضرورت و احتیاج انسان کے ہوش و حواس معطل کر دیتی ہے، ڈاکو سے انسان بھاگتا ہے، مگر مظلوم قرضدار خود دوڑ کر اس کے پاس جاتا ہے، پس فی الحقیقت، قتل و غارت کسی قانون اور مذہب کے لئے اس درجہ سختی کی مستحق نہیں، جس قدر سود اور سود خواری کی مہیب زندگی، پھر کیا حرب من اللہ و رسولہ سے اس کی تعبیر صحیح نہیں ہے۔

دنیا میں خود غرضی کے جس قدر اعمال کئے جاتے ہیں، ان میں سے کسی میں بھی اس درجہ استمرار اور مداومت نہیں، جیسی کاروباری بے رحمی میں، سود خوار کا عمل ظلم دائمی، اور انسانی عمروں، خاندانوں، اور نسلوں تک جاری رہتا ہے، اور وہ جس شکار کو پکڑتا ہے، اسکی بیکسی اور مظلومی کا نظارہ برسوں تک دیکھتا رہتا ہے، اور جبتک ہمیشہ کے لئے اسکے تڑپنے، لوٹنے اور کراہنے کے نظارہ کا تحمل اپنے اندر نہ پیدا کیلے، وہ سود خوار نہیں بن سکتا، اس لئے صرف اسی معصیت کو حرب من اللہ و رسولہ سے تعبیر کیا گیا، البتہ اگر توبۂ انابت الی اللہ کر کے آیندہ سود کو بالکل ترک کر دینے کا عہد و میثاق کرلے، تو اپنا راس المال۔ لینے میں کوئی گناہ نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ربا کی ہر شاخ کو حرام قرار دیا، اور سود خواروں کو اسکے

نتائج الیمہ سے ڈرایا، امام احمد نے اپنی مسند میں اور دارقطنی نے عبداللہ بن حنظلۃ سے روایت کیا ہے کہ درھم ربوا یاکلہ الرجل وھو یعلم اشد من ستۃ و ثلثین زنیۃ، جو شخص معلوم ہونے کے باوجود سود کا ایک درہم کھاتا ہے، اس کو چھتیس زنا سے زیادہ کا گناہ ہوگا ابو ہریرہ نے روایت کیا ہے کہ الربوا سبعون جزءا ایسرھا ان ینکح الرجل امہ گناہ سود کا ستر وال جز ہے، ان میں سے ادنی یہ ہے کہ وہ شخص اپنی ماں سے صحبت کرے، ابن ماجہ نے ابن مسعود سے روایت کیا کہ ان الربوا وان کثر فان عاقبتہ تصیر الی قل، سود کی بنا پر اگرچہ دولت میں زیادتی ہو جائے مگر انجام کار اس پر فنا طاری ہوگی۔

(۲۸۰) وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ (۲۸۱) وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○	اور اگر کوئی تنگ دست ہے تو فراخی تک مہلت دینی چاہیے اور یہ کہ معاف کردو تو تمہارے حق میں بہت بہتر ہے اگر تم سمجھو، اور اس دن سے ڈرو جس روز تم اللہ کیطرف لوٹائے جاؤگے، پھر جو کچھ کسی نے کمایا اس کو پورا دیدیا جائیگا، اور ان پر ظلم نہ کیا جائیگا۔

راس المال کے وصول کرنے میں بھی اس امر کا خیال رہے کہ اگر قرضدار غریب و مفلس ہے تو اسے فراخی و فراغت تک مہلت دینا بہتر ہوگا، اور اگر نہ لو تو اچھا ہے آخر سود خواری کے زمانہ میں تم اصل رقم سے کئی گنا زائد وصول کر چکے ہو، اگر تم قیامت کے روز خدا سے نرمی کی توقع رکھتے ہو تو آج نوع انسانی کے ساتھ ہمدردی و اعانت اور رعایت و نرمی کا سلوک کرو، ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء۔

قرض کا قانون

سود کی ابتدا یوں ہوئی کہ لوگ قرض لیکر ادا نہیں کرتے تھے، یا زمانہ دراز تک ادا کرنے کا نام نہ لیتے، اور اس طرح قرض دینے والا مصیبت میں مبتلا ہو جاتا، اس لئے سود کا رواج ہوا کہ اب ہر شخص جلد ادا کرنے کی کوشش کریگا ورنہ انجام کار اس کی تمام جائداد فنا ہو جائیگی۔

ادھر قرض خواہ کو بھی اپنے سرمایہ کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہ رہیگا۔ اسلام نے آتے ہی اس مہیب ترین درندگی اور بربریت کو ہمیشہ کے لئے حرام قرار دیکر اس کے بعد فوراً قرض کا قانون معین کر دیا، جس نے ان تمام غلط کاریوں کی اصلاح کر دی:۔

(۲۸۲) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ ۚ وَلْيَكْتُب بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ ۚ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَن يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ ۚ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا ۚ فَإِن كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَن يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ ۚ وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِن رِّجَالِكُمْ ۖ فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَن تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ ۚ وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا ۚ وَلَا تَسْأَمُوا أَن تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰ أَجَلِهِ ۚ ذَٰلِكُمْ أَقْسَطُ عِندَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَىٰ أَلَّا تَرْتَابُوا ۖ إِلَّا أَن تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا ۗ

مسلمانو! جب تم اودھار کا ایک میعاد معین تک لین دین کیا کرو، تو اس کو لکھ لیا کرو، اور چاہیئے کہ کاتب انصاف سے تمہارے درمیان لکھ دے، اور جس طرح اللہ نے کاتب کو سکھایا ہی تو اس کو چاہیئے کہ وہ لکھنے سے انکار نہ کرے بلکہ لکھدے، اور وہ شخص لکھوائے جس پر حق ہے، اور اس اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہی، اور اس میں کچھ کاٹ چھانٹ نہ کرے، پس اگر وہ شخص جس پر وہ حق ہی کم عقل یا کمزور ہو، یا وہ خود نہ لکھوا سکتا ہو تو اس کا کارکن انصاف سے لکھوا جائے اور اپنے مردوں میں سے دو گواہ کر لیا کرو، پس اگر وہ دو گواہ مرد نہ ہوں تو ایک مرد، اور دو عورتیں جن کو تم گواہوں میں سے پسند کرو، تاکہ کوئی ایک بھول جائے تو ایک عورت ان میں سے دوسری کو یاد دلا دیگی، اور جب گواہ بلائے جائیں تو وہ انکار نہ کریں، اور چھوٹا معاملہ ہو یا بڑا تو اس کو میعاد تک لکھ لیا کرو، یہ اللہ کے نزدیک نہایت منصفانہ کارروائی ہی، اور گواہی کے لئے بہت درست ہی الگتا ہی کہ تم کو شبہ نہ پڑے مگر یہ کہ جس کا تم لین دین کرتے ہو وہ سودا دستیں دام نقد ہو تو

وَأَشْهِدُوٓا۟ إِذَا تَبَايَعْتُمْ ۚ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ ۚ وَإِن تَفْعَلُوا۟ فَإِنَّهُۥ فُسُوقٌۢ بِكُمْ ۗ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ۖ وَيُعَلِّمُكُمُ ٱللَّهُ ۗ وَٱللَّهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيمٌ ○

اگر اس کو نہ لکھو تو تم پر کچھ گناہ نہیں، اور جب تم سودا کرو تو گواہ تو کر ہی لیا کرو، اور کاتب اور گواہ کو تکلیف نہ دیجائے اور اگر ایسا کرو تو یہ تمہارے لئے گناہ کی بات ہی اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور اللہ تم کو سکھاتا ہی اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔

کئی رکوع میں برابر انفاق فی سبیل اللہ پر زور دیا جا رہا ہی، اس سے خواہ مخواہ مال کی محبت کم ہوگی سود کی حرمت نے اس الفت اور محبت کو اور بھی فنا کر دیا، اب جبکہ مسلمان اس درجہ پر آگئے، تو ان کو بتایا جاتا ہے کہ مال و دولت ایک نہایت ہی اہم اور ضروری چیز ہے، قوموں اور ملتوں کا قیام و ثبات اس کے ساتھ وابستہ ہی، اس لئے تم اپنے مال کی خوب حفاظت کرو، روپیہ کو محفوظ رکھو، اور وقت آئے تو سارے کا سارا قوم کی راہ میں قربان بھی کر دو، اس پہلو کی طرف متوجہ کرنے کے لئے قرضہ کا ایک قانون مرتب کیا، لین دین کے متعلق جس قدر انسانی معاملات ہو سکتے ہیں، ان کی تقسیم حسب ذیل ہے:-

(الف) لینے دینے کی دونوں چیزیں موجود ہیں۔

(ب) جس چیز کو خریدنا ہی، وہ تو موجود ہی، مگر قیمت بعد میں ادا کی جائیگی۔

(ج) قیمت تو موجود ہے مگر جس چیز کو خریدنا ہی وہ موجود نہیں ہی۔

ان تینوں صورتوں کو اسلام نے جائز قرار دیا ہی، اور انہی کے متعلق گزشتہ آیت میں احکام بیان کئے گئے ہیں۔

(د) لینے اور دینے کی کوئی چیز بھی موجود نہیں، فرضی بیع ہی، نہ روپیہ پاس ہے، اور نہ مال، اسلام نے اس کی سختی سے مخالفت کی ہی، اور اس کو حرام قرار دیا ہی،

گزشتہ آیت میں جن مسائل کو بیان کیا گیا ہی، ہم سہولت و آسانی کی خاطر ان کو اسی ترتیب کے ساتھ لکھ دیتے ہیں جو ترتیب آیت میں ہی:-

(۱) جب آپس میں کوئی معاملہ کرنے لگو، اور دام یا چیز ادھار ہو تو اس کو لکھ لیا کرو،

(۲) دستاویز اور یادداشت میں ادا کرنے کی مدت ضرور معین کردو (۳) کاتب اور وثیقہ نویس انصاف کے ساتھ لکھے، کسی کی رعایت کے خیال سے کمی بیشی نہ کرے (۴) وثیقہ نویس لکھنے سے انکار نہ کرے (۵) جس شخص کے ذمہ حق واجب ہوتا ہے اور جس کو وہ رقم یا چیز ادا کرنی ہوگی، وہ خود اپنی زبان سے لکھوا دے، لکھواتے وقت خدا کا خوف دل میں رکھے، اور اس میں کمی زیادتی نہ کرے (۶) اگر جس شخص کے ذمہ حق واجب ہوتا ہے وہ:

(الف) سفیہ ہے، خفیف العقل ہے، مجنون ہے، اور اس کے حواس مختل ہو چکے ہیں۔

(ب) ضعیف البدن ہے، نابالغ ہے، پیر فرتوت ہے، یا بدحواس ہے۔

(ج) کسی اتفاقی امر سے خود بیان کرنے اور لکھوانے کی قدرت نہیں رکھتا، مثلاً گونگا ہے اور کاتب اس کے اشارات سے واقف نہیں، یا اجنبی ملک کا رہنے والا ہے، اور یہاں کی زبان نہیں جانتا ہے۔ تو ان تینوں صورتوں میں اس کا کارکن ٹھیک ٹھیک لکھوا دے۔

کارکن حسب ذیل لوگ ہو سکتے ہیں:-

(۱) ولی، جس کا تصرف اس کے مال میں نافذ ہو سکے، اور وہ باپ، دادا، باپ کا وصی، دادا کا وصی، اور قاضی ہیں۔

(۲) وکیل، مترجم اور مفہم بھی کارکن اور ولی میں آجائیں گے۔

(۷) معاملہ اور دستاویز کی پختگی کے لئے دو مرد گواہ بنا لو (۸) اگر دو مرد نہ مل سکیں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تاکہ اگر ایک عورت بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے (۹) عدالت جب گواہوں کو شہادت کے لئے بلائے تو وہ جانے سے انکار نہ کریں (۱۰) گواہی صرف اس شخص کی معتبر ہوگی جس میں اسلام، عقل، بلوغ، آزادی، اور عدالت ہو، بے دین کی شہادت قبول نہ کی جائیگی (۱۱) قرض کا معاملہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا لکھ لینا زیادہ مناسب ہے کیونکہ اس سے یہ ہوگا کہ:-

(الف) اللہ کے نزدیک انصاف کی بات یہی ہے، جب عدالت میں مقدمہ جائیگا تو

قاضی کو فیصلہ کرنے میں مدد ملیگی، اور صحیح واقعات اس کے سامنے آجائینگے۔

(ب) گواہوں کو شک و اشتباہ کا موقعہ نہ رہیگا، دستاویز دیکھتے ہی ان کو تمام واقعات یاد آجائینگے، اور سچی گواہی دے سکینگے۔

(ج) جب قرض کی مقدار اور مدت ادا لکھی ہوگی تو کسی کو دوسرے کی نسبت بدگمانی کا موقع نہ رہیگا۔

(۱۲) اگر سودا دست بدست ہو تو لکھنے کی ضرورت نہیں (۱۳) تاہم لیتے دیتے وقت گواہ کر لینے مفید ہونگے، ورنہ ممکن ہے دکاندار کہنے لگے کہ مجھے قیمت وصول نہیں ہوئی یا میں نے اس چیز کو فروخت ہی نہیں کیا (۱۴) وثیقہ نویس اور گواہوں سے مفت کام نہ لیں، بلکہ ان کی اجرت ادا کر دینا، ورنہ تمہیں کاتب اور گواہ نہ مل سکینگے، عدالت کو تکلیف ہوگی، اور لین دین بند ہو جائیگا۔ خدا سے ڈرو، اور چند ٹکوں کی خاطر عدالت کی راہ میں رکاوٹیں نہ پیدا کرو، اللہ کو خوب معلوم ہے کہ یہی قانون تمہارے جھگڑوں کو دور کر سکتا ہے۔

رہن کی اجازت ہے

(۲۸۳) وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ○	اور اگر تم سفر میں ہو اور لکھنے والا نہ پاؤ تو گرو دیا قبضہ، پس اگر تم میں ایک دوسرے پر اعتبار کرے تو جس پر اعتبار کیا گیا ہے اس کو دوسرے کی امانت ادا کر دینا چاہیئے اور وہ اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے، اور گواہی کو نہ چھپاؤ، اور جو اس کو چھپائیگا تو بیشک اس کا دل گنہگار ہے، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ سب جانتا ہے۔

سفر میں اگر قرض لینے کی ضرورت محسوس ہو، اور کاتب نہ مل سکے تو ایسی حالت میں اطمینان کی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ قرضدار اپنی کوئی چیز رہن کے طور پر قرض خواہ کے

پاس رکھدے، اور اگر ان کو ایک دوسرے پر اعتماد ہی تو اس کی بھی ضرورت نہیں، البتہ اب مدیون کو چاہیئے کہ خدا سے ڈر کر حق نہ مارے۔ آخر میں پھر تبصرہ کر کے فرمایا کہ شہادت اور گواہی کو چھپانے کی کوشش نہ کرو، ورنہ تمہارے اعمال و اخلاق پر برا اثر پڑیگا۔

عرب کے لوگ لکھے پڑھے نہ تھے، ان کے تمام قومی معاملات، معرکہائے کارزار، اور دواوین واشعار کا دارومدار صرف حافظہ پر تھا، ان کے سامنے قرآن نے یہ قانون بیان کیا، اور نہایت ہی لطیف طریق سے بتا دیا کہ تم عنقریب دنیا کی عظیم الشان قوم بن جاؤگے، کامیابی وکامرانی تمہارے ہم رکاب ہوگی، تمہارے باہمی معاملات اس قدر وسیع ہو جائینگے کہ ان میں کتابت اور تحریر کی ضرورت محسوس ہوگی۔

یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ ایک ترقی یافتہ قوم کی تمام ضروریات اجتماعی کے لئے جو چیز اساس وبنیاد کا کام دے سکتی ہی، وہ یہی ہے کہ کاتب ہوں، ان کی کتابت کا معاوضہ دیا جائے، گواہی کا قاعدہ یہ ہی، گواہ شہادت سے انکار نہ کریں، صاحب معاملہ اگر بچہ، بوڑھا، اور پاگل ہو، یا اور کوئی عذر ہو تو اس کا ولی ہونا ضروری ہے، اگر ہم غور سے دیکھیں تو آج تمام مہذب دنیا کے قانون کی بنا اسی پر ہی، جس کو قرآن نے صرف ایک آیت میں بیان کر دیا ہی۔

ارکان خلافت اور تعلق باللہ

خلافت کبریٰ کے فرائض بیان کر دیے گئے، اولیائے خلافت کا یہ کام ہوگا کہ اپنی ماتحت دول واقوام کی نگرانی کریں، فتنہ وفساد نہ ہونے پائے، اور ہر جگہہ امن وسلامتی کا دور دورہ ہو، لیکن اگر اعضائے حکومت ہی کی نیتوں میں فرق آجائے، اور وہی لوگ ظلم وجور پر کمر باندھ لیں تو ان سے کون بازپرس کریگا؟ اور کس کے سامنے ان کے اعمال کا احتساب کیا جائیگا؟ اس رکوع میں اسی موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۲۸۴) لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا | جو کچھہ آسمانوں میں اور جو کچھہ زمین میں ہی سب اللہ

فِی الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝	ہی کا ہے، اور اگر جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس کو ظاہر کرو، یا چھپاؤ، بہر حال تم سے اللہ اس کا حساب لیگا، پھر جسے چاہے بخشے گا، اور جسے چاہے عذاب دیگا، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

ارکان خلافت کو بتایا جاتا ہے کہ زمین و آسمان کی حکومت اللہ کے قبضہ میں ہے، البتہ یہ امانت تمہارے سپرد کردی گئی ہے، اس لئے اترانہ جانا، بلکہ اعلیٰ ترین حکمراں جماعت ہونے کی وجہ سے تمہارا احتساب اور بھی زیادہ سخت ہوگا، اگر دوسروں کے اعمال پر نظر ہوگی، تو تمہارے ارادے بھی ہمارے محاسبہ سے نہ بچ سکینگے:

نزدیکاں را بیش بود حیرانی!

صحابہ اس کو سن کر کانپ اُٹھے، اور حضور رسالت میں عرض کیا کہ وساوس خطرات سے بچنا مشکل ہے، آپ نے فرمایا تم یہودیوں کی طرح سمعنا وعصینا نہ کہنے لگ جاؤ، اس پر سب کی گردنیں تسلیم ورضا کے طور پر جھک گئیں، اور فوراً بعد دوسری آیت نازل ہوئی جس نے حقیقت سے پردہ اُٹھا دیا۔

بعض لوگوں نے اس آیت کو لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا سے منسوخ مانا ہے حالانکہ ان آیات میں نسخ کی بحث ماننا ہی بے سود ہے، سورۂ بقرہ کے بعد آل عمران کا نزول ہوا ہے، اس میں بھی اس کے ہم معنی آیت موجود ہے: قل ان تخفوا ما فی صدورکم او تبدوہ یعلمہ اللہ (۳: ۲۸) اصل بات یہ ہے کہ آیت منسوخ نہیں ہوئی، بلکہ جس وقت صحابہ کرام پریشان ومضطرب ہو کر دربار رسالت میں حاضر ہوئے تو غایت خشیۃ اور شدۃ خوف کی بنا پر آپ کی نظر بھی الفاظ کے ظاہری عموم پر پڑی، مگر اللہ نے فوراً اپنی مراد واضح کردی، اور صحابہ کے اشکال کو دور کردیا۔

(۲۸۵) اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ | ان کے رب کی طرف سے پیغمبر پر جو کچھ اتارا گیا اس کو

اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ط كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ تف لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ تف وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝	اُنہوں نے اور مسلمانوں نے بھی مان لیا سب اللہ، اور اسکے فرشتوں، اور اس کی کتابوں اور اسکے پیغمبروں پر ایمان لے آئے ہم اسکے پیغمبروں میں کسی کو جدا نہیں سمجھتے، اور بول اٹھے کہ ہم نے سنا اور مان لیا اے ہمارے پروردگار تیری بخشش چاہتے ہیں اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔

یہ وسعت صرف اسلام کو حاصل ہے کہ وہ دنیا کی تمام صداقتوں پر ایمان کا اظہار کرتا ہے۔ حق و صدق کی آواز دنیا کے کسی گوشہ سے بلند ہو، مسلمان اس کو لبیک کہنے کو تیار ہوگا، کیا کوئی قوم اس خصوصیت میں مسلمانوں کا مقابلہ کر سکتی ہے۔

یوں دعا کرو

(۲۸۶) لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ط لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ط رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ج رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ج رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ج وَاعْفُ عَنَّا تف وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا تف اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝	اللہ کسی کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی طاقت کے موافق، اسے ملتا ہے جو اس نے کمایا، اور اس پر پڑتا ہے، جو اس نے کمایا اے رب! اگر ہم بھول یا چوک جائیں تو ہم کو نہ پکڑ، اے ہمارے رب! جیسا بوجھ تو نے ان پر جو ہم سے پہلے تھے رکھا تھا ویسا ہم پر نہ رکھ، اے ہمارے رب اجس بوجھ کی ہم میں سکت نہیں وہ ہم سے نہ اٹھوا، اور ہم سے درگزر فرما، اور ہمیں بخشدے اور ہم پر رحم فرما، تو ہی ہمارا حامی ہے بس کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد کر۔

اس سے پہلی آیت میں فرمایا تھا کہ نفوس کی پوشیدہ باتوں پر بھی محاسبہ ہوگا، اب اس کو اور زیادہ وضاحت سے بیان کیا کہ اس سے مراد غیر اختیاری امور نہیں ہیں، کیونکہ اللہ کبھی ایسے احکام صادر نہیں کرتا، جو ایک شخص کی طاقت سے باہر ہوں، اور ان کے لئے اسباب فراہم نہ ہو سکیں، بلکہ جیسا کروگے، اسی کے مطابق جزا ملیگی، قوت ارادی میں ضعف و

کمزوری نہ آنے پائے اور کام کرنے کا عزم صمیم ہو، پھر اگر غلطی ہو جائے تو یوں دعا کرو!

اگر ہم سے بھول کر کوئی غلطی ہو جائے، یا باوجود یاد ہونے کے بھر بے رادہ کوئی فعل سرزد ہو، تو اس پر مواخذہ نہ کیجیو، قانون کے متعلق دو باتیں یاد رکھنے کے قابل ہیں:-

(الف) لوگ اس کو سمجھ لیں، کیونکہ اگر یونہی ان کو عمل کرنے کے لئے مجبور کیا گیا، تو وہ کبھی اس کے پابند نہ رہ سکیں گے۔

(ب) طاقت اور استطاعت سے زائد نہ ہو۔

ان دونوں غلطکاریوں سے ہمیں محفوظ رکھنا کیونکہ پہلی قومیں ان مصائب کی بنا پر فنا ہوگئیں، قانون ان کے لئے سخت تر ہوتا چلا گیا، ہم پر اس قسم کی بے سمجھی اور نادانی کا بار عظیم نہ ڈالنا، اور جو قانون بھی نوازش ہو تو ہماری طاقت کا لحاظ کر کے دیا جائے۔ ہم اگرچہ غلطی کریں مگر عفو و درگزر سے کام لینا، اور سختی سے پیش نہ آنا، غلط کاری کے بعد فوراً مواخذہ نہ کرنا بلکہ چند روز کی مہلت دینا کہ ہم اصلاح کر لیں، ابھی ترقی کے بہت سے مواقع ہیں، مقاصد مہمہ پیش نظر ہیں، اور ہم ابھی تک ایسے جرائم کے مرتکب نہیں ہوئے کہ ہمیں اس ترقی سے محروم کر دیا جائے، بلکہ تو اپنی رحمت سے آگے بڑھنے کا موقع نوازش کرنا اور اگر ہمارے مقابلہ میں کوئی دوسری قوم پیدا ہو تو اس کو فنا کر دے، اور اس ترقی کے لیے صرف ہمارا ہی انتخاب عمل میں آئے۔ تو ہی ہمارا پروردگار ہے، تیرے سوا اور کس کے پاس جا سکتے ہیں، اور جب ہم تیرے ہی غلام ہیں تو ہمیں کفار پہ غلبہ نوازش کر، آمین یا رب العالمین۔

حسن خاتمہ

اس حسن خاتمہ کے قربان جائیے جس میں اسلام کے انتہائی نصب العین، اور غایت الغایات کو نہایت ہی واضح اور روشن الفاظ میں بیان کر دیا کہ فرزندان توحید، دنیا کی تمام اقوام و ملل، اور مذاہب و ادیان پر حاکم بنا کر بھیجے گئے ہیں، اور شہداء علی الناس اسی صورت میں بن سکتے ہیں جبکہ اس قانون پر عمل کریں جو رسول عربی کی معرفت انہیں نوازش

کیا گیا ہی، صبر و استقامت، عزم و استقلال، اور ولولہ دینی و حب مذہبی اپنے اندر پیدا کریں، جہاد فی سبیل اللہ کے لئے ہمیشہ تیار رہیں، اور خداوند قدوس سے فتح و کامرانی کی دعا مانگیں

سورۃ کی ابتدا میں فرمایا تھا اولئك هم المفلحون، اور آخر میں بھی فانصرنا على القوم الكفرين سے اسی طرف اشارہ کیا کہ ابتداء انتہا ہی ایک سورۃ کے موضوع و مقصد معلوم کرنے کی کنجی ہے، اس مقصد کے کسب وحصول کے لئے دعا بہترین ذریعہ ہی اس لئے اس کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے، اور وہ یہی ہے کہ فانصرنا على القوم الكفرين ۔ واللہ اعلم بالصواب،

کتبہ عبدالقدیر حلیسری شعبان سنہ ۱۳۴۲ھ